سلسلۂ دار المصنفین

(نمبر ۱۳)

روح الاجتماع

یعنی

ڈاکٹر لیبان فرانسیسی کی کتاب جماعتہائے انسانی کے اصولِ نفسیہ کا اردو ترجمہ

از

مولنا محمد یونس انصاری فرنگی محلی مرحوم

سابق رکنِ دار المصنفین

باہتمام:- مولوی مسعود علی صاحب ندوی

مطبع معارف شہر اعظم گڈھ میں چھپی

طبع چہارم ۱۹۴۳ء

۷۸۶

فہرست فصول و ابواب

روح الاجتماع

دیباچہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

۱۔ پیش نظر کتاب مشہور فرنچ مصنف موسیو لیبان کی کتاب روح الاجتماع، (یعنی جماعتہائے انسانی کے اصول نفسیہ) کا ترجمہ ہے، موسیو لیبان ہندوستان کے لئے کوئی اجنبی مصنف نہیں ہیں، ان کی کتابیں تمدن عرب، تمدن ہند اور انقلاب الامم، اردو میں ترجمہ ہو کر ملک میں شائع ہو چکی ہیں، ہماری یہ کتاب اسی سلسلہ کی چوتھی کڑی ہے،

۲۔ ہندوستان میں اگرچہ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ اپنے تئیں یوروپین علوم و فنون کے خزانہ کا کلید بردار سمجھتا ہے، لیکن ہندوستان کے عربی تعلیمیافتہ طبقہ کو مسلمانان مصر کا ممنون ہونا چاہئے کہ وہ اپنی مادری زبان عربی میں یورپ کی بعض جدید تصنیفات کا ترجمہ کرتے رہتے ہیں، ان سے ہندوستان کا عربی داں طبقہ بھی اپنی قدیم عزت و وقار کو برقرار رکھنے کے لئے کبھی کبھی مواد حاصل کرتا رہتا ہے،

مصر و ہندوستان گو ایک ہی گورنمنٹ کے زیر اثر اور ماتحت ہیں اور تقریباً دونوں ملکوں

کے حالات ملتے جلتے ہیں لیکن باوجود اس کے ان دونوں ملکوں میں بڑا فرق ہے،
مصر کی تمامتر موجودہ علمی چہل پہل اور دماغی ترقی کا علم بردار وہ فرقہ ہے جو جدید طرز تعلیم
کے سانچہ میں ڈھالا گیا ہے، بخلاف اس کے ہندوستان میں اب تک جتنے بھی علمی یا قومی کام انجام
پائے ہیں ان میں سے تقریباً اکثر اس فرقہ کی کوششوں کا نتیجہ ہیں جس نے بجائے کالجوں کی عالیشان
عمارتوں کے مسجدوں میں یا ٹوٹے پھوٹے حجروں میں بیٹھکر پرانے طرز پر تعلیم حاصل کی ہے، اردو زبان
کے دور علمی کے جو مایہ ناز بزرگ گذرے ہیں، وہ عموماً خالص عربی تعلیمیافتہ یا عربی و انگریزی علوم
فنون دونوں کے جامع تھے، اور اس سلسلہ میں جو چند علمی کتابیں موجودہ دور میں اردو زبان میں
ترجمہ یا تصنیف کی گئیں ان میں سے تقریباً اکثر عربی تعلیمیافتہ طبقہ کی جانفشانی اور دماغی محنتوں
کا نتیجہ ہیں، اور اس بنا پر جو کتاب اس وقت اردو داں ناظرین کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے
اس کا عربی داں طبقہ کی جانب سے پیش کیا جانا ہندوستان میں کچھ محل تعجب نہیں ہے،

۳- لیکن اس ترجمہ کے متعلق ایک اور خاص بات کا ذکر کردینا بھی نہایت ضروری ہے عربی
زبان میں جو اس کتاب کا ترجمہ روح الاجتماع کے نام سے شائع ہوا ہے اس کے متعلق گو یہ تو
نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ترجمہ اصل سے کتنا مختلف یا کتنا مطابق ہے، البتہ فرنچ زبان سے اس کتاب کا ترجمہ
انگریزی میں کیا گیا ہے، اور کروڈ کے نام سے شائع ہوا ہے اس سے عربی ترجمہ جابجا مختلف
ہے، عربی زبان میں اس کتاب کا ترجمہ فتحی پاشا زغلول نے کیا ہے، ان کے عربی طرز تحریر کی
ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ زبان نہایت بلیغ ہوتی ہے اور عبارت میں ایجاز و اختصار
زیادہ ملحوظ رہتا ہے، روح الاجتماع کے علاوہ سر تطور الامم اور سر تقدم الانکلیز السکسونیین جو فرنچ کتاب
کے عربی ترجمے ہیں ان کتابوں کا مترجم بھی یہی مصری انشا پرداز ہے اور ان سب کتابوں میں
بھی ان کے طرز تحریر کے یہی دو وصف نمایاں ہیں، گو اس طرز تحریر سے عبارت میں ذرا پیدا ہو جاتا ہے

لیکن کسی کتاب کا ترجمہ کرنے میں یہ طرزِ تحریر بجائے مفید ہونے کے اُلٹا مضر پڑتا ہے، بعض جگہ ایجاز و اختصار کی وجہ سے ترجمہ میں مصنف کا مطلب کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے اور بعض جگہ مطالب کی سلاست و روانی میں فرق آجاتا ہے،

اس بنا پر عربی ترجمہ کے ایجاز و اختصار کی وجہ سے عربی ترجمہ میں بیحد نقص پیدا ہو گئے ہیں، یہانتک کہ بعض جگہ اختصار کی بدولت مصنف کا اصلی مطلب بالکل اُلٹ گیا ہے، اس نقص کے علاوہ عربی ترجمہ میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ مترجم چونکہ اصطلاحاتِ فن سے ناواقف ہے، اسلئے اکثر جگہ عربی اصطلاحات وضع کرتے ہوئے، اُس نے اصطلاحات میں نہایت بیجا تصرف کیا ہے، مثلاً مصنف نے جماعت کے ممیزاتِ عمومی بیان کرتے ہوئے جماعت کی خصوصیت یہ بتائی ہے، کہ جماعت کا وقوف و شعور قریب قریب مفقود ہوتا ہے اور اس پر ہمیشہ نیم شعوری کی ایک کیفیت طاری رہتی ہے، انگریزی میں کیفیتِ شعوری کو کانشنس، نیم شعوری کو سب کانشنس اور کیفیتِ غیر شعوری کو انکانشنس کہتے ہیں ان میں پہلی کیفیت کا مظہر انسان کی حالتِ انفرادی ہے اور دوسری کیفیت کا مظہر نفسِ اجتماعی ہے لیکن مترجم نے نفسِ اجتماعی کو تیسری کیفیت کا مظہر بتایا ہے، اور "سب کانشنس" کا ترجمہ کیفیتِ لاشعوری کیا ہے، جو "انکانشنس" کا ترجمہ ہے، یہ ایک بیجا تصرف ہے، جس کا ارتکاب عربی مترجم نے اصطلاحات میں کیا ہے،

غرض یہ نقائص ہیں جن سے عربی ترجمہ مملو ہے، میں جب اپنا ترجمہ تمام کر چکا، تو اس وقت مکرمی مولوی عبدالماجد صاحب بی اے نے میری توجہ اس جانب مبذول کرائی، چنانچہ جب میں نے اس کتاب کے انگریزی ترجمہ کا مطالعہ کیا، تو فی الواقع مجھے انگریزی اور عربی ترجمہ میں بے انتہا فرق نظر آیا، اور اس کے بعد میں نے عربی ترجمہ سے قطع نظر کر کے انگریزی ترجمہ سے اپنے ترجمہ کو درست کرنا شروع کر دیا،

حاصل یہ ہے کہ گویہ ترجمہ در اصل عربی کتاب سے کیا گیا ہے لیکن تصحیح اور نظرِ ثانی انگریزی ترجمہ
سے کی گئی ہے اور اس اعتبار سے گویا یہ سمجھنا چاہیئے کہ اب یہ ترجمہ اپنی موجودہ شکل میں بجائے عربی
کتاب کے انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے،

۴۔ موجودہ دور میں ہندوستان کے مسلمانوں کی قوم میں لیڈروں کی جو بہتات ہے
اور ہماری قوم کے نوجوانوں کو مقتدی بننے کے بجائے مقتدا بننے کا جو شوق ہے، غالباً اس راہ
میں اُن کے لئے اس کتاب کا مطالعہ از حد مفید ہوگا، کسی جماعت کے "قائد" بننے سے پیشتر اپنے
میں قیادت کی صلاحیت پیدا کرنا چاہیئے، قوموں کے قائد عموماً اپنی فطرت سے قائد پیدا ہوا
کرتے ہیں، اور ان کی زندگی کا مقصد ہی گویا یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی جماعت کے قائد بنیں لیکن
ہماری قوم میں روزمرہ جو مصنوعی قائد پیدا ہوا کرتے ہیں، ان کے لئے کیا اسکی بھی ضرورت
نہیں کہ قائد بننے سے پیشتر کم از کم ان علمی اصول کی تعلیم تو حاصل کریں، جو مختلف قائدین کے
حالات سے مستنبط ہیں،

محمد یونس
فرنگی محل لکھنؤ
۳۱ر جنوری ۱۹۱۸ء

مقدمۂ مترجم

(۲)

۱۔ انسان کے تمام دماغی اور نفسانی حالات کو ایک ایک کرکے دیکھ جاؤ، نفسِ انسانی کے ہر ہر منظر اور ہر ہر شعبہ میں تم کو گوناگوں اور تغیر پذیر کیفیاتِ نفسانیہ کا جلوہ نظر آئیگا، احساسات و مشاعر، خیالات و تصورات، عواطف و جذبات اور ارادہ، یہ چار قسم کی کیفیتیں انسان کی دماغی حیات کی کل کائنات ہیں، اور ان کے علاوہ جتنی کیفیتیں ہیں، وہ یا انہی کی مظہر ہیں، اور یا ان سے مل جل کر بنتی ہیں، لیکن افرادِ انسانی کی ان نفسانی کیفیتوں کا اظہار اکثر اس وقت ہوتا ہے جب مخصوص ماحول اور مخصوص علتوں کے ماتحت دماغی قویٰ اپنے اپنے فرائض انجام دیتے ہیں، انسان کی کیفیتِ وقوفی اور حالتِ شعوری ایک خارجی ماحول اور مخصوص مہیجاتِ بیرونی کی محتاج ہے کہ جب تک یہ بیرونی مؤثر مخصوص خارجی حالات کی موجودگی میں اعصابِ حس کو متاثر نہ کرے، اُس وقت تک انسان میں کیفیتِ وقوفی کا ظہور ہی نہیں ہو سکتا، اسی طرح جذبات اور تصورات بھی اپنے اپنے وجود کے لئے مخصوص حالاتِ خارجی اور مہیجاتِ بیرونی کے محتاج رہتے ہیں، اور ان سب کیفیاتِ نفسانی سے انسان کی نفسانی زندگی کی تشکیل ہوتی ہے، ہر انسان کو اپنی روزانہ زندگی میں مختلف بیرونی مہیجات اور مؤثرات سے سابقہ پڑتا ہے، اور یہ بیرونی مہیجات اعصابِ حس کے ذریعہ سے انسان کے نفسانی کیفیات میں گوناگوں تغیر کرتے

رہتے ہیں، اور چونکہ انسان کی نفسانی زندگی کا خمیر ان ہی مختلف و تغیر پذیر کوائفِ نفسانی
کے مجموعہ سے تیار ہوتا ہے، اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان کی انفرادی حیاتِ نفسی نام ہے
اُن تغیر پذیر کیفیاتِ نفسانی کے مجموعہ کا جو ذہنِ انسانی میں پیدا ہوتی اور مٹتی رہتی ہیں،

لیکن یہ تغیرات جو انسان کی ذہنی دنیا میں پیدا ہوتے ہیں، اور بسا اوقات انسان
کی عملی زندگی پر بھی اثر کرتے ہیں، کیا یہ محض اتفاقی حادثات کا مجموعہ ہیں یا یہ بکھرے ہوئے اجزاء
علت و معلول کی زنجیر میں منسلک ہیں؟ بالفاظِ دیگر یہ مختلف تغیراتِ ذہنی جو ذہنِ انسان
میں پیدا ہوتے ہیں، کیا یہ چند مخصوص قوانینِ فطرت کے تابع ہیں جو ان تغیرات کی علت واقع ہوتے
ہیں؟ علم بتاتا ہے کہ یہ تغیراتِ ذہنی چند نفسانی قوانین کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں اور مٹتے ہیں، احساسات و
مشاعر کے لئے علیحدہ قوانین ہیں، تصورات کے لئے علیحدہ قوانین ہیں، جذبات کے لئے علیحدہ
قوانین ہیں، اور ان سب قوانین سے ایک مخصوص علم میں بحث کی جاتی ہے جس کا نام علم النفس ہے
غرضکہ انسان کی حیاتِ نفسی جن تغیر پذیر کیفیاتِ نفسی کے مجموعہ سے عبارت ہے ان کی علتوں اور ان کے
قوانینِ نفسی اور انسان کی نفسانی زندگی کے حیرت انگیز طلسم کی عقدہ کشائی ایک مخصوص علم
کے ذمہ ہے جس کو علم النفس کہتے ہیں،

۲۔ انسان کی حیاتِ نفسی کا ایک یہ شعبہ ہے جس کی حقیقت کا انکشاف علم النفس کرتا ہے،
لیکن انسان کی حیاتِ نفسی کا ایک شعبہ اور ہے جو انسان کی اس ممتاز خصوصیت پر مبنی ہے کہ انسان
فطرۃً مدنی الطبع پیدا ہوا ہے، میری زندگی مجھ ہی تک منحصر نہیں، میں خود ایک ذات ہوں اور میرا وجود اپنی
ہی نوع کے دیگر افراد کے ساتھ وابستہ ہے، میرے عادات، میرے رہنے سہنے کا طور و طریق،
میرے اعتقادات، میرا اخلاق، میرا کیرکٹر، غرض میری ہر وہ شے جس کو میں اپنی جسمانی یا مادی زندگی
کی جانب منسوب کر سکتا ہوں وہ صرف میری ہی نہیں ہے، بلکہ اس میں کا اکثر حصہ میں نے دوسروں

سے پایا ہے اور اپنے پاس اس غرض سے امانت رکھا ہے کہ اس میں کچھ اضافہ کرکے اس دفینۂ مخفی کو میں دوسروں تک پہنچا دوں، یہ میری زندگی کا دوسرا شعبہ ہے۔ جس کا تعلق صرف میری اپنی ذات کے ساتھ نہیں بلکہ اس میں میرے ساتھ دوسرے بھی شریک ہیں۔ ہم قومی، ہم ملکی اور ہم وطنی، غرض اس قسم کے وہ تمام مشترک الفاظ جو انسان کے حالاتِ اجتماعی یا اس کے رشتۂ قومی کو ظاہر کرتے ہیں، ان کی بناء انسان کی یہی دوسری قسم کی حیات ہے۔ جو حیاتِ انفرادی کی طرح گو تغیر پذیر واقع ہوئی ہے لیکن انسان کی ان دو زندگیوں میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ اگر پہلی زندگی ایک ایک منٹ اور ایک ایک پل میں بدل جایا کرتی ہے تو اس کے مقابل انسان کی دوسری زندگی میں ایک زمانہ اور چند صدیوں کے بعد تغیر ہوتا ہے گویا انسان کی تمدنی اور اجتماعی زندگی کرۂ ارض کے طبقاتِ آبی چٹانوں اور پہاڑوں کے مماثل ہے، جن میں ایک مدت کے بعد تغیر ہوتا ہے، اور تغیر کے بعد پھر ان کی ظاہری حالت ایسی بدل جاتی ہے، کہ اصلیت کا بالکل پتہ نہیں چلتا،

انسان کی یہ دو متقابل حیاتِ نفسی ہیں، جن میں سے حیاتِ انفرادی کے مظاہر تو ہم بتا چکے ہیں کہ انسان کے احساسات و مشاعر، تصورات و اعتقادات، جذبات و خیالات اور اس کی قوتِ ارادی وغیرہ ہیں، لیکن انسان کی حیاتِ اجتماعی کی تشکیل جن عناصر سے ہوتی ہے وہ، وہ تمام لوازمِ تمدن ہیں جو ایک قوم یا ایک ملک کے باشندوں کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں، اور جو ان کی عملی زندگی کے ہادی اور رہبر ہوا کرتے ہیں، کسی قوم کا مخصوص نظامِ حکومت اس کا مخصوص نظامِ معاشرت، اس کا مخصوص مذہب، اُس کا طریقِ تجارت، اُس کی صنعت و حرفت، اس کے علوم و فنون، اس کی صناعیاں اور دستکاریاں اُس کا مخصوص طرزِ جنگ غرض وہ تمام لوازمِ تمدن جو کسی قوم کے ساتھ خاص ہوتے ہیں، ان سے انسانی حیاتِ اجتماعی کی تشکیل

ہوتی ہے لیکن جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ جس طرح انسان کی انفرادی حیاتِ نفسی تغیر پذیر ہے اسی طرح انسان کی اجتماعی حیاتِ نفسی بھی تغیر پذیر اور بدلنے والی شے ہے، اور ان دونوں میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ حیاتِ انفرادی کے اندر منٹوں اور گھنٹوں میں فرق ہوتا ہے اور حیاتِ اجتماعی صدیوں کے بعد متغیر ہوتی ہے، اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ حیاتِ انفرادی کے تغیر کے لئے جن خارجی مہیجات کی ضرورت ہوتی ہے، وہ بھی گو اپنی ترکیب میں پیچیدہ ہوتے ہیں، لیکن انسان کی حیاتِ اجتماعی پر جو خارجی موثرات اثر کرتے ہیں، وہ بے انتہا ہوتے ہیں، اور اس کے ساتھ ان کی ترکیب بھی اتنی پیچیدہ ہوتی ہے، کہ ان سب کے متواتر عمل کرنے کے لئے ایک مدت درکار ہوتی ہے،

لیکن یہ مختلف عوامل اور مہیجات جو کسی ہیئتِ اجتماعی پر اثر کرتے ہیں، اُن کی تحدید دو قسم کے مہیجات میں کی گئی ہے بعض مہیجات تو وہ ہیں جن کا تعلّق خود ان افراد کے اندرونی حالات اور خود افراد کے ذاتی کیرکٹر اور افراد کی ذاتی فطرت سے ہوتا ہے جماعت کے ان اندرونی مہیجات کی حقیقت سمجھنے کے لئے یہ پیشِ نظر کر لینا بھی ضروری ہے کہ انسان کی ہیئتِ اجتماعی کا نظام تمامتر مبنی ہوتا ہے انسان کی قوتِ تقلید اور اُس کی اثر پذیری پر، حیاتِ اجتماعی کی اگر کوئی دقیق سے دقیق تشریح کیجائے تو اُس کا حاصل بجز اس کے کچھ نہ نکلے گا، کہ حیاتِ اجتماعی نام ہے افراد کی اثر پذیری اور افراد کی تحدید حریت اور فنائے شخصیت کے مجموعہ کا، سوسائٹی میں داخل ہو کر سوسائٹی کا ہر فرد دوسرے افراد سے متاثر ہوتا ہے، اور اسی نسبت سے وہ دوسروں کو اپنے سے متاثر کرتا ہے، اور افراد کی ذاتی شخصیتیں اجتماعی مقاصد کے اندر فنا ہو جاتی ہیں، فطرتِ انسانی کا یہ باہمی فعل و اثر سوسائٹی کے اندرونی حالات میں تغیر کرتا ہے، اس کے بعد اس مجموعہ پر چند اور خارجی موثرات اپنا عمل کرتے ہیں، مخصوص آب و ہوا، مخصوص ماحول، آباو اجداد کے موروثی اثرات، ملک کی فطری بوقلمونی اور مختلف مناظرِ فطرت، غرض وہ تمام

خارجی حالات جن میں انسان کی کوئی سوسائٹی بسر کر رہی ہو وہ سب مل کر انسانی جماعت پر اپنا اثر کرتے ہیں، اور ان تمام اندرونی اور بیرونی موثرات کا مجموعہ اپنے فعل و اثر سے سوسائٹی کے ان تمام کیفیاتِ اجتماعی اور مظاہرِ نفسانی کی تشکیل کرتا ہے، جن کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے لیکن ان تمام اندرونی اور بیرونی مؤثرات کا جو اثر افراد انسانی کے مجموعہ پر ہوتا ہے وہ اس طرح نہیں ہوتا کہ کوئی خاص مؤثر کسی خاص کیفیتِ اجتماعی پر اثر کرے اور دوسرا خاص مؤثر دوسری کیفیتِ اجتماعی پر، بلکہ موثرات کا پورا مجموعہ کیفیاتِ اجتماعی کے پورے مجموعہ پر ایک بارگی اثر کرتا ہے اور اس بنا پر گو کیفیاتِ اجتماعی میں ہم ہر ہر موثر کے علٰحدہ علٰحدہ نشانات تو نہیں بتا سکتے، لیکن اگر ہم عہد قدیم کی کسی خاص سوسائٹی کے پورے حالات کا علم رکھتے ہوں، نیز موجودہ زمانہ میں اس سوسائٹی کے جو حالات ہیں، اُن سے بھی ہم کو پوری واقفیت ہو تو زمانہ گذشتہ اور زمانہ موجودہ کے حالات کا باہمی مقابلہ کرنے سے ان حالات کے اندر ہم ایک عجیب ربط و نظام پاتے ہیں، جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ جس طرح حیاتِ انفرادی میں انسانی حیات کا ہر متاخر لمحہ اپنے پیشیر و لمحہ سے علیت و معلولیت کا تعلق رکھتا ہے اسی طرح حیاتِ اجتماعی کے تمام منتشر اجزاء بھی علیت کی کڑی میں باہم منسلک ہیں اور یہ پورا مجموعہ ایک عجیب حیرت انگیز ربط و نظام کا پتہ دے رہا ہے، جس کی علامتیں عالم کے تمام مظاہر وجود میں ہمکو عیاں نظر آتی ہیں، پس انسان کی مختلف کیفیاتِ اجتماعی میں سے ہر کیفیتِ اجتماعی کی علتِ قریبہ وہ کیفیتِ اجتماعی ہوتی ہے، جو اس کیفیتِ اجتماعی کے پیشتر گذر چکی ہے اور اسی طرح سلسلہ وار تمام کیفیاتِ اجتماعی اپنے سے مقدم کیفیاتِ اجتماعی کی معلول اور اپنے سے متاخر کیفیاتِ اجتماعی کے لئے علت ہوتی ہیں،

غرض وہ خارجی حالات جن میں انسان کی کوئی سوسائٹی زندگی بسر کر رہی ہو جب

اپنے قوانین کے مطابق جماعت کے اندرونی موثرات کے ساتھ مل کر جماعت پر اثر کرتے ہیں، اس وقت کسی خاص ہئیتِ اجتماعی کی تشکیل ہوتی ہے، جو مخصوص کیفیاتِ اجتماعی اور مخصوص لوازمِ تمدن کی پیدائش کا باعث ہوتی ہے، لیکن جس طرح فطرت کے اور دوسرے مظاہر کائنات میں "عمل" اور "ردعمل" دو برابر کی قوتیں یعنی بقوتیں علی التواتر اپنا اثر کرتی ہیں، اسی طرح انسان کی حیاتِ اجتماعی بھی "عمل" اور "ردعمل" دو برابر کی قوتوں کی رزمگاہ ہے، جہاں یہ دونوں قوتیں متواتر اپنا عمل کرتی ہیں، ہیئتِ اجتماعی کے بیرونی موثرات، یا بالفاظ دیگر وہ خارجی حالات جن میں انسان کی کوئی جماعت زندگی بسر کر رہی ہو، افرادِ انسانی پر اپنا عمل کرتے ہیں لیکن افرادِ انسانی کی فطرت میں خود اس طرح کی لچک پائی جاتی ہے، کہ جہاں وہ خارجی ماحول سے اثر پذیر ہوتی ہے وہاں دوسری طرف وہ خود اپنی صلاحیت واستعداد کے مطابق کسی خارجی ماحول کو تلاش کر کے خود اس پر اپنا اثر کرتی ہے، خارجی موثرات انسانی فطرت کو اپنے رنگ میں رنگتے ہیں، اور انسانی فطرت خارجی موثرات کو وجود میں لاتی ہے اور اس طرح "عمل" اور "ردعمل" دو مساوی قوتوں سے اثر پذیر ہو کر اجتماعِ انسانی ترقی کی جانب قدم بڑھاتا ہے، لیکن یہ ترقی ہمیشہ اسی طرح ظہور پذیر ہوتی ہے کہ بیرونی موثرات اندرونی موثرات سے ٹکر کھاتے ہیں، اور اندرونی موثرات بیرونی موثرات سے، اور دونوں کے فعل و اثر سے ایک جدید ہیئتِ اجتماعی کا وجود ہوتا ہے، جو اگلی ہیئتِ اجتماعی سے بالکل مختلف ہوتی ہے اور ان دو سوسائیٹیوں کے درمیان جو زمانہ باہمی فعل و اثر میں گذرتا ہے وہ گویا ان دونوں کے درمیان اتصال پیدا کرتا ہے، جس میں بوڑھی قومیں مٹتی اور نوجوان قومیں اُبھرتی ہیں اور اس طرح قدرت اقوامِ عالم کو مٹا بڑھا کر ارتقاے تمدن و تہذیب کا فرض انجام دیتی ہے، یہ ہے انسانی ہیئتِ اجتماعی کا وہ فرض جس کو دنیا کی مختلف قومیں اپنی اپنی بساط کے موافق انجام دیتی ہیں، اور

اپنے بعد والی قوموں کے لئے چھوڑ جاتی ہیں،

غرض انسانی ہیئتِ اجتماعی کے مختلف تغیرات پر عمیق نظر ڈالنے سے ہم کو نظر آتا ہے کہ

۱۔ انسان کی تہذیب وتمدن کی ترقی کا بڑا دار ومدار ان خارجی اور اندرونی موثرات کے عمل اور ردعمل پر ہوتا ہے، جو انسان کی ہیئتِ اجتماعی پر اپنا اثر کرتے ہیں،

۲۔ ان مختلف موثرات کا یہ باہمی تاثر وتفاعل ان مختلف کیفیاتِ اجتماعی کی پیدائش کا باعث ہوتا ہے، جو مختلف اوقات میں پیدا ہوتی اور مٹتی رہتی ہیں،

۳۔ تغیرات کا یہ پورا سلسلہ چند قوانینِ فطری کی بنا پر عمل میں آتا ہے جو قوموں کی ترقی وانحطاط میں بہت بڑا اثر رکھتے ہیں،

پس انسان کی ہیئتِ اجتماعی کے مختلف تغیرات، اور ان تغیرات کے مختلف علل واسباب سے جس علم میں بحث ہوتی ہے اُس کا نام **علم الاجتماع** ہے۔ قوموں کے مختلف تغیرات قوموں کی ترقی وتنزل کے قوانینِ نفسی، کیفیاتِ اجتماعی کی حقیقت، اور ان مختلف کیفیاتِ اجتماعی کے علل واسباب کی جستجو، قوموں کے حالات میں جو بیرونی موثرات تغیر پیدا کرتے ہیں اُن کی تحدید اور اُن کا تعین، ان تمام مسائل سے بحث کرنا، علم الاجتماع کا فرض ہے، قوموں کی ترقی وتنزل کے کیا اسباب ہوتے ہیں؟ قوموں کے لوازمِ تمدن میں کس طرح تغیر ہوتا ہے؟ قوموں کے اختلاط وامتزاج کے کیا کیا اسباب ہوتے ہیں؟ خارجی موثرات کتنے ہیں؟ اُن کی کیا نوعیت ہے؟ قوموں پر اُن کا کیا اثر ہوتا ہے؟ یہ اور اسی قبیل کے دیگر سوالات علم الاجتماع کے حدود میں داخل ہیں، علم تاریخ اور علم الاجتماع میں فرق یہ ہے کہ علم تاریخ میں واقعاتِ ماضیہ کے جزئیات سے بحث کیجاتی ہے، اور علم الاجتماع میں ان جزئی واقعات سے بحث نہیں ہوتی بلکہ وہ ان واقعات پر یکجائی نظر ڈالکر انسانی ہیئتِ اجتماعی کے تغیرات، علل واسباب

سے بحث کرتا ہے،

۴۔ لیکن انسانی ہیئتِ اجتماعی کے مختلف تغیرات کے عللِ قریبہ وبعیدہ سے مہذب ممالک میں جن بہترین دماغوں نے بحث کی ہے، اُنھوں نے بحث کرنے کے دو طریقے اختیار کئے ہیں، اور یہ دونوں طریقے وہی ہیں جو عموماً مختلف مصنفین دوسرے علوم میں بھی اختیار کرتے ہیں، مثلاً علمِ طب کو لو، علمِ طب سے بحث کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے، کہ اغذیۂ انسانی اور اغذیہ کے طبعی عمل اور ہر ہر عضو کے قوانینِ صحت وقوانینِ مرض سے قطع نظر کرکے صرف اس بات سے بحث کیجائے، کہ فلاں فلاں مرض میں کون کون سی دوائیں مفید ہیں، اور فلاں فلاں مرض میں کون کون دوائیں مضر ہیں، اس طریقۂ بحث سے صرف دواؤں کی خاصیتوں کا علم ہوتا ہے، اور کسی مرض کو مان کر صرف اس مرض کے طرقِ ازالہ سے بحث کی جاتی ہے، اس سے بحث نہیں ہوتی کہ یہ مرض پیدا کس طرح ہوا؟ اس مرض کے علامات کیا ہیں؟ اسباب کیا ہیں؟ پھر خود قوانینِ صحت وقوانینِ مرض کیا ہیں؟ غذا کا ہر ہر عضو پر کیا اثر ہوتا ہے؟ ان مباحث سے اس صورت میں بالکل بحث نہیں ہوتی، بخلاف اس کے دوسرا طریقۂ بحث جو ہے وہ یہ ہے کہ دواؤں کا اثر بتانے سے پیشتر اس بات سے بحث کیجائے کہ اعضاے انسانی کے وظائفِ عمل کیا کیا ہیں؟ ہر ہر عضو کی حالتِ صحت وحالتِ مرض کے حدود کیا ہیں؟ اعضاے انسانی میں کن کن اسباب سے مرض پیدا ہوتے ہیں؟ ان امراض کے علامات کیا ہوتے ہیں؟ انسانی غذا کی حقیقت کیا ہے؟ اعضاے انسانی پر غذا کا کیا اثر ہوتا ہے؟ امراض کو ادویہ اور اغذیہ سے کیا تعلق ہے؟ ادویہ کی کیفیت وکمیت سے مرض پر کیا اثر پڑتا ہے؟ غرض یہ اور اسی قبیل کے دیگر مسائل جو انسان کے حالاتِ صحت ومرض کے اسباب کا انکشاف کریں، اس دوسرے طرز میں ان سے بحث کی جاتی ہے، اور یہ دوسرا طرز پہلے طرز سے

زیادہ عام و شامل اور جامع و مانع ہے،

بعینہٖ اسی طرح انسانی ہیئتِ اجتماعیہ سے بھی بحث کرنے کے دو طریقے ہیں، پہلا طریقہ یہ ہے کہ ایک مخصوص ماحول فرض کرکے مخصوص کسی ہیئتِ اجتماعیہ کے متعلق یہ سوال کیا جائے کہ ان حالات کے اندر اس ہیئتِ اجتماعی پر فلاں واقعہ یا حادثہ کا کیا اثر پڑیگا، روس کے موجودہ حالات میں انقلابِ روس ملک کے لئے مفید ہے یا نہیں، ہندوستان کے موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے ہوم رول ہندوستان کے لئے مفید ہوگا یا مضر؟ چینی قوم کے موجودہ حالات کے لحاظ سے وہاں شخصی حکومت زیادہ بکار آمد ہوگی یا جمہوریت؟ یہ اور اسی قبیل کے دیگر مسائل جن میں ہیئتِ اجتماعی کی ایک خاص حالت فرض کرکے مستقبل کے نتائج یا ان نتائج کی علتیں دریافت کی جائیں، ان سے بحث کرنا یہ ایک طرز ہے،

دوسرا طرز یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ پہلے ہیئتِ اجتماعی کے مخصوص حالات فرض کرکے یہ بات دریافت کیجائے، کہ فلاں واقعہ کا قوم پر کیا اثر ہوگا؟ یا ان حالات کے اندر فلاں فلاں واقعہ کی علت کیا ہے؟ بجائے اس کے پہلے اس بات سے بحث کیجائے کہ ہیئتِ اجتماعی پر جو موثرات اثر کرتے ہیں، ان کی حقیقت کیا ہے؟ خود مخصوص خارجی حالات کس طرح پیدا ہوتے اور قوم پر کس طرح اثر کرتے ہیں؟ اس دوسرے طریقہ میں یہ سوال نہیں ہوتا کہ فلاں فلاں حالات میں ہیئتِ اجتماعی پر فلاں فلاں واقعہ کا کیا اثر پڑیگا، بلکہ سوال یہ ہوتا ہے، کہ ہیئتِ اجتماعی کے لئے یہ مخصوص حالات خود کس طرح پیدا ہوئے؟ مظاہر تمدن اور کیفیات اجتماعی کو کن مختلف اسباب نے پیدا کیا ہے، پھر اس سے بھی آگے بڑھ کر انسان کی حیاتِ اجتماعی کی غرضِ معین کیا ہے اور یہ غرض حاصل کس طرح ہوتی ہے؟ قوموں کے قوانینِ نفسی کیا کیا ہیں، جو قوموں کے حالات میں تغیر کرتے ہیں، علم الاجتماع سے بحث کرنے کا یہ دوسرا طریقہ ہے

جو پہلے طریقہ سے زیادہ عام و شامل، اور پہلے طرز سے زیادہ مقبول ہے اور زمانۂ حال کے جن فلاسفہ نے علم الاجتماع سے بحث کی ہے، اُنھوں نے عموماً یہی طرز اختیار کیا ہے، انگلستان میں مسٹر بکل نے سب سے پہلے تمدنِ اسلامی کی تاریخ اسی طرز پر لکھی، اور لیبان نے بھی اپنی کتاب "انقلاب الامم" میں علم الاجتماع سے اسی طرز کے مطابق بحث کی ہے، غرض علم الاجتماع سے بحث کرنے کے لئے عموماً یہ دو طرز ہیں جو فلاسفہ نے اختیار کئے ہیں، لیکن ان میں سے دوسرا طرز زمانۂ حال میں زیادہ مقبول ہے،

یہاں تک سلسلۂ بحث میں ہم نے جتنے منازل طے کئے ہیں اُن کو یکجا طور پر ایک مرتبہ پیشِ نظر کرلو:۔

۱۔ انسانی زندگی کی دو قسمیں ہیں ا۔ حیاتِ انفرادی سے متعلق جتنے علوم ہیں، اُن میں سے علم النفس میں ان مختلف تغیرات اور تغیرات کے علل و اسباب سے بحث ہوتی ہے جو انسان کی ذہنی دنیا میں پیدا ہوتے ہیں، اور حیاتِ اجتماعی سے متعلق جتنے علوم ہیں، اُن میں سے علم الاجتماع میں ان مختلف تغیرات اور تغیرات کے علل و اسباب سے بحث ہوتی ہے جو انسان کی ہیئتِ اجتماعیہ میں مختلف اوقات میں پیدا ہوتے ہیں،

۲۔ علم الاجتماع میں جن مسائل سے بحث ہوتی ہے، وہ مختصراً حسب ذیل ہیں:۔

انسانی اجتماع پر کون کون خارجی اور اندرونی موثرات اثر کرتے ہیں ؟

انسان کے کیفیاتِ اجتماعی یا بالفاظ دیگر لوازمِ تمدن کس طرح پیدا ہوتے ہیں ؟

ان لوازمِ تمدن اور مختلف کیفیاتِ اجتماعی کے اندر تغیر و انقلاب کس طرح اور کن اصول پر ہوتا ہے ؟

غرض وہ تمام امور جن کا تعلق انسان کی اجتماعی زندگی سے ہے، ان سے علم الاجتماع میں

بحث کی جاتی ہے،

۳- لیکن علم الاجتماع سے فلاسفہ نے عموماً دو طرز پر بحث کی ہے، اول یہ کہ چند مخصوص خارجی حالات کے اندر مختلف واقعات و حوادث کا جو اثر ہیئتِ اجتماعی پر ہوتا ہے، اس کے علل و اسباب دریافت کرنا، دوسرے یہ کہ خود ان خارجی حالات و موثرات کی حقیقت او ان کی پیدائش کے علل و اسباب سے بحث کرنا،

یہ علم الاجتماع کا ایک ہلکا سا خاکہ ہے جو صفحاتِ بالا میں بالاجمال درج کیا گیا،

(۲)

ا صفحاتِ بالا میں علم الاجتماع کا جو ایک ہلکا سا خاکہ کھینچا گیا، اس سے غالباً علم الاجتماع کی حقیقت تو خوب ذہن نشین ہو گئی ہو گی اور یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ مختلف فلاسفہ نے علم الاجتماع سے بحث کرنے کے کیا کیا طریقے اختیار کئے ہیں،

لیکن بیاناتِ بالا کے مطالعہ سے غالباً ناظرین کو بھی معلوم ہوا ہو گا، کہ علم الاجتماع کو انسان کی نفسانی حیاتِ اجتماعی کے ساتھ وہی نسبت ہے جو انسان کی فزیکل ہسٹری کو انسان کی حیاتِ جسمانی کے ساتھ ہے، یعنی گویا علم الاجتماع انسان کی اجتماعی زندگی کی تاریخ کا نام ہے، جس طرح علم جیالوجی (طبقات الارض) میں یہ بحث کی جاتی ہے کہ طبقاتِ ارض نے موجودہ شکل کس طرح حاصل کی؟ زمین میں کیا کیا تغیرات واقع ہوئے؟ اور ان تغیرات کے اسباب کیا ہیں، اسی طرح انسان کی فزیکل ہسٹری میں یہ بحث کی جاتی ہے، کہ انسان کی پیدائش کس طرح ہوئی؟ انسان نے موجودہ ترقی کس طرح حاصل کی؟ مختلف اصنافِ انسانی کے مابین مابہ الامتیاز کیا کیا چیزیں ہیں؟ انسان کے دورانِ ترقی میں انسان میں کیا کیا تغیرات ہوئے؟ اور ان تغیرات کے اسباب کیا ہیں؟ بعینہٖ اسی طرح علم الاجتماع میں جو بحث ہوتی ہے وہ یہ ہے

کہ ہیئتِ اجتماعی کا وجود کس طرح ہوا؟ ہیئتِ اجتماعی نے موجودہ ترقی کس طرح حاصل کی؟ اور اس دوران میں کیا کیا تغیرات اس میں پیدا ہوئے؟ اور ان تغیرات کے اسباب کیا ہیں؟ غرض جن فلاسفہ نے علم الاجتماع سے اب تک بحث کی ہے، ان کی بحث کا زیادہ حصہ اجتماعِ انسانی کی تاریخ سے متعلق رہا ہے اور گویا اس لحاظ سے انسان کی نفسانی حیاتِ اجتماعی کیساتھ اس علم کو وہی نسبت ہو گی جو فزیکل ہسٹری کو انسان کی حیاتِ انفرادی کے ساتھ یا جیالوجی کو جغرافیۂ زمین کے ساتھ ہے،

لیکن یہ ظاہر ہے کہ جس طرح فزیکل ہسٹری سے صرف انسان کے اُن مختلف ادوارِ مادی کا علم ہوتا ہے، جن کو انسان نے طے کیا ہے، اسی طرح علم الاجتماع سے بھی محض واقعاتِ تاریخی کی حقیقت اور اُن کے اسباب کا انکشاف ہو گا، اور جس طرح انسان کی حیاتِ انفرادی کے ادوار مادی اور ادوار نفسی کی حقیقت کا واقعی انکشاف اُس وقت تک نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ اس کی حیاتِ انفرادی کے تمام عناصر و اجزا سے علیحدہ علیحدہ بحث نہ کی جائے، اس کے خواصِ جسمانی کی تشریح، اس کے حالاتِ صحت و مرض، اس کے قویٰ و اعضا کے وظائفِ عمل اور اُن کی تشریح، اُس کے دماغی قویٰ کی تفصیل، جذبات، احساسات، تصورات، افکار، عقائد، ارادہ، ان تمام مظاہرِ دماغی کی توضیح و تشریح، جذبات کے انحطاط و زوال اور ترکیب و تعمیم کے قوانین، احساسات کی تحلیل اور تصور و احساس کے باہمی فروق، عقیدہ کی پیدائش اور زوال کے اسباب، تخیل کی وسعت اور اُس کی پوری توضیح، فکر کرنے کے طریقے، صحیح و غلط فکر کی باہمی تمیز، قوتِ ارادی کے مدارج وغیرہ، ان تمام مسائل سے جب تک بالتفصیل بحث نہ کیجائے، اُس وقت تک صرف انسان کی فزیکل ہسٹری جان لینے سے حیاتِ انفرادی کے تمام شعبوں کی تشریح نہیں ہو سکتی، یہی وجہ ہے کہ انسان کی حیاتِ انفرادی سے جن علوم میں بحث ہوتی ہے اُن میں اعلیٰ درجہ علم تشریح

اور علم النفس کا ہے، علم تشریح میں اعصاب جسمانی اور قویٰ و اعضا کے وظائف اعمال سے بحث ہوتی ہے اور علم النفس میں جذبات و کیفیاتِ نفسیہ اور انسان کے مظاہر دماغی سے،

پس اسی طرح انسان کی حیاتِ اجتماعی سے جب بحث کرنا ہو، تو کوئی علم ایسا ہونا چاہئے جو علم النفس کی طرح مظاہر اجتماعی کی حقیقت کی تشریح کرتا ہو، اور جس میں یہ بتایا جائے کہ نفس اجتماعی کی حقیقت اور اس کے ممیزات کیا کیا ہیں، جماعت کے جذبات کی پیدائش کس طرح ہوتی ہے، جماعت میں کن کن جذبات کا ظہور ہوتا ہے، جماعت کے فکر کرنے کا کیا طرز ہے، جماعت کو آمادۂ عمل کرنے کے لئے کون سے ذرائع اختیار کئے جاتے ہیں، جماعت کے کتنے اقسام ہیں، اور ان اقسام کے باہمی ممیزات کیا کیا ہیں؟ جب تک ان مسائل سے بحث نہ کی جائے اُس وقت تک گو علم الاجتماع سے اجتماعی زندگی کے انحطاط و زوال اور ان کے اسباب کی وضاحت تو ہو جائے گی، لیکن انسانی ہیئتِ اجتماعی کی حقیقت پر روشنی نہ پڑے گی،

علاوہ بریں اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ ہیئتِ اجتماعی کے تغیرات جن اسباب کے معلول ہوتے ہیں، اُن کی تحدید دو قسموں میں کی گئی ہے، ہیجاتِ بیرونی اور موثراتِ اندرونی، نیز یہ بھی معلوم ہو چکا ہے، کہ ان دو قسم کے موثرات میں باہم عمل اور ردِ عمل کا فعل جاری رہتا ہے اور اس باہمی تاثر و تفاعل کے اثرات سے کیفیاتِ اجتماعی اور مظاہرِ تمدن کی پیدائش ہوتی ہے، نیز یہ کہ ان اندرونی موثرات کے اندر جو جو موثر شامل ہیں، اُن کا زیادہ حصہ جماعت کی خود اندرونی ترکیب سے تشکیل پاتا ہے لیکن جماعت کی یہی اندرونی ترکیب نام ہے نفسِ اجتماعی کے مظاہر کے مجموعہ کا، جماعت کے جذبات، اس کے تصورات، اس کے اوہام، اس کے عقائد ان ہی سب چیزوں کی ایک خاص ترکیب سے ہیئتِ اجتماعی کا جو ہیولیٰ تیار ہوتا ہے اسی کو نفسِ اجتماعی کہتے ہیں، اور اس نفسِ اجتماعی کے مظاہر سے جس علم میں بحث ہوتی ہے اُس کو

علم نفسیاتِ اجتماع کہتے ہیں، پس جب تک جماعت کی اندرونی ترکیب و نفس اجتماعی کے مظاہر کی حقیقت کی تشریح نہ کیجائے، اُس وقت تک جماعت کے ان اندرونی موثرات کی حقیقت واضح نہ ہوگی، جو اجتماعی تغیرات کی پیدائش میں خاص مداخلت رکھتے ہیں، اسلئے علم الاجتماع کے مباحث کا ایک ضروری پہلو یہ بھی ہے کہ اجتماعِ انسانی کی حقیقت سے بحث کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ محض افراد منتشر کا حالت اجتماع میں آجانا کن جدید نفسانی حالات کی پیدائش کا باعث ہوتا ہے، اور یہ پہلو علم الاجتماع کے لئے اتنا ضروری ہے کہ بلا اس کے علم الاجتماع کی تکمیل کسی طرح نہیں ہوسکتی،

پس حاصل یہ ہے کہ فلاسفہ نے علم الاجتماع سے بحث کرنے کے جو طریقے اختیار کئے ہیں، اُن کا تعلق زیادہ تر اجتماعِ انسانی کی تاریخ سے ہے، اور اس کو فلسفۂ تاریخ کہنا زیادہ موزوں ہوگا، لیکن اس سلسلہ میں کبھی اس بات سے بحث نہیں کی گئی کہ خود انسانی اجتماع کی حقیقت کیا ہے، اور نفسِ اجتماعی کے مظاہر کیا کیا ہیں ؟

۲- یہی نقطۂ بحث ہے، جس کو سب سے پہلے مہذب ممالک میں لیبان نے دریافت کیا، لیبان نے پہلے مدتوں مختلف ممالک میں سیاحت کی، مختلف قوموں کے عادات، اطوار، خو بو، اور ان کے آئینِ قومی دریافت کئے اور ایک مدت تک مختلف قوموں اور مختلف جماعتوں میں رہ کر اُس نے جماعتوں کے طریق کار اور حیاتِ اجتماعی کے ایک ایک شعبہ سے واقفیت حاصل کی اور اس کے بعد علم نفسیاتِ اجتماع کو تدوین کیا،

علم نفسیاتِ جماعت کو لیبان نے جس طرز پر مرتب کیا ہے، اس میں لیبان کو دیگر علما سے چند باتوں میں خاص خاص امتیاز حاصل ہے، اور چونکہ لیبان کے علاوہ کسی مصنف کی کوئی دوسری کتاب ایسی موجود نہیں ہے جسمیں مستقل طور پر صرف نفسیاتِ جماعت سے بحث ہو، اسلئے

ہم لیبان کے خصوصیات کو اسی کے اوراق سے لیکر ذیل میں بیان کرتے ہیں :-

١- لیبان کی سب سے بڑی خصوصیت جس میں تمام علما پر اس کو فوقیت حاصل ہے یہ ہے کہ علم الاجتماع کے اس پہلو پر مہذب ممالک میں سب سے پہلے اُسی نے قلم اُٹھایا، گو امریکہ اور انگلستان کے بعض علمائے بھی اس پہلو پر نظر ڈالی ہے، لیکن اس پہلو کو اُنھوں نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی ہے، بلکہ عام علم النفس کے ضمن میں جابجا علم الاجتماع کے اس پہلو پر بھی نظر ڈال گئے ہیں، نفسیاتِ جماعت پر مستقل طور پر نظر ڈالنا اور اصول و فروع کو ترتیب دینا اور بات ہے، اور کسی خاص بحث کے ضمن میں اس پہلو پر بھی بحث کرنا اور بات ہے،

خود لیبان کو علمائے سے یہ شکایت ہے کہ اُنھوں نے علم الاجتماع کے اس پہلو کی جانب کیوں خاص توجہ نہیں کی، چنانچہ ایک مقام پر کہتا ہے :-

"جماعتوں کا بیان بڑھتے بڑھتے طویل ہوگیا، حالانکہ ہمیں ان کی بابت بہت تھوڑا علم ہے بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے علم النفس کی جانب توجہ کی ہے، وہ جماعتوں سے کنارہ کش رہے اور اسی لئے ہمیشہ اُن کے حالات سے ناواقف رہے۔"

پھر دوسری جگہ کہتا ہے :-

"جماعت کے نفسانی حالات کے متعلق ہماری بحث بہت مختصر اور بطور سابقہ تصانیف کے خلاصہ کے ہوگی، اور ناظرین اُن ہی مسائل سے واقف ہو سکیں گے جو اس فن کے ابتدائی مسائل ہیں، کیونکہ میری حالت تو یہ ہے کہ میں نے ایک ایسی زمین پر قدم رکھا ہے جو ایک مدت سے بنجر چھوڑ دی گئی تھی، اس لئے میں تو تمام فروع و اصول کا استقصا نہیں کر سکتا البتہ دوسرے لوگوں کو چاہئے کہ ان مسائل میں خوب غور و خوض کر کے اصول و فروع کو ترتیب دیں۔"

لیبان کو علمائے علم النفس سے یہ شکایت ہے، جس کا اظہار اُس نے اپنی کتابوں میں متعدد مقامات پر کیا ہے، حالانکہ لیبان کہتا ہے کہ اس علم کے فوائد بے شمار ہیں، اس علم کے جن فوائد کو لیبان نے گنوایا ہے۔ وہ حسبِ ذیل ہیں:-

۱- اس علم کا سب سے ادنیٰ فائدہ تو یہ ہے کہ "علم شئے بہ از جہلِ شئے"

لیبان کہتا ہے:-

"جماعت کے نفسانی حالات کا معلوم کرنا بے حد ضروری ہے، خواہ ہم اس کا عملی حصہ حاصل کریں، یا صرف واقعات کی حقیقت دریافت کر لیں، بہر حال جس طرح علم زراعت کی واقفیت کسی قدر فائدہ مند ہوتی ہے، اسی طرح انسان سے جو افعال صادر ہوتے ہیں، اُن کے اسباب کا دریافت کرنا بھی فائدہ سے خالی نہیں"

یہ ایک عام فائدہ ہے، لیکن اس علم کا دوسرا بڑا فائدہ جو ہے، وہ یہ ہے کہ

۲- بہت سے واقعاتِ تاریخی ایسے ہیں جن کو علل و اسباب کا اُس وقت تک پتہ نہیں چلتا، تاوقتیکہ جماعتوں کے نفسانی حالات سے واقفیت نہ پیدا کی جائے، علم نفسیاتِ جماعت کا یہ فائدہ مبنی ہے اسی اصول پر جس کو ہم ایک ہی آدھ صفحہ اُدھر لکھ آئے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ ہیئتِ اجتماعی کے تغیرات میں جن اسباب و موثرات کو دخل ہوتا ہے، اُن میں سب سے زیادہ اہمیت اندرونی موثرات یعنی ہیئتِ اجتماعی کی اندرونی ترکیب کو حاصل ہوتی ہے اور یہ اندرونی ترکیب عبارت ہے جماعت کے خیالات، جذبات و افکار وغیرہ سے جو نفسِ اجتماعی کے مظاہر ہیں، پس جب کسی ہیئتِ اجتماعی کے تغیرات کے اسباب دریافت کرنا ہوں تو پہلے خود اس ہیئتِ اجتماعی کی اندرونی ترکیب اور اس کے نفسانی حالات کی جستجو کرنا چاہئے کہ بغیر ان نفسانی حالات کا علم حاصل کئے ہوئے، اس ہیئتِ اجتماعی کے تغیرات کے اسباب

سے واقفیت نہیں ہو سکتی،

موسیو لیبان نے علم نفسیات اجتماع کے اس خاص فائدہ کو اپنی کتاب میں بہت اہمیت دی ہے، چنانچہ ایک مقام پر لکھتا ہے:۔

"اس علم سے ایسے بے شمار اخلاقی اور اجتماعی واقعات کی توجیہ ہو جاتی ہے جن کی حقیقت سے واقف ہونے کا اور کوئی ذریعہ نہیں"

ان دو فوائد کے علاوہ اس علم کا تیسرا بڑا فائدہ یہ ہے، کہ

۳۔ مختلف جماعتوں کی قیادت، بلا اس کے کہ جماعت کے نفسانی حالات سے واقفیت پیدا کی جائے، ناممکن ہے، اس لئے خاص کر ان لوگوں کو اس علم کی جانب زیادہ توجہ کرنا چاہئے، جن کے ہاتھوں میں مختلف قوموں کی زمام سیاست ہوتی ہے، اور جن کا ایک اشارہ قوموں کے حالات میں عظیم الشان تغیر پیدا کر دیتا ہے،

لیبان کہتا ہے:۔

"جماعتوں کے نفسانی حالات سے واقف ہونا اس زمانہ میں اس قدر ضروری ہو گیا ہے کہ ہر بڑے سے بڑا سیاست داں اس جانب خاص توجہ کرتا ہے، نہ اس لئے کہ اس ذریعہ سے وہ جماعت پر اپنی حکومت اور سیادت قائم کرے کیونکہ یہ بہت مشکل ہے، بلکہ اس لئے کہ اس ذریعہ سے وہ جماعت کے زور کو گھٹا سکے"

اور یہی سبب ہے کہ لیبان دوسرے موقع پر کہتا ہے:۔

"حالانکہ وہ لوگ جنھوں نے دنیا پر حکومت کی ہے اور جن کے ہاتھوں میں اقوام و ممالک کی عنانِ حکومت رہی ہے، بانیانِ مذاہب سے لیکر بانیانِ حکومت تک اور پیغمبرانِ مذاہب سے لے کر سیاست داں مدبرین تک حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو چھوٹے چھوٹے

قبائل کے سردار رہے ہیں، یہ سب ہمیشہ علم النفس کے ماہر ہوئے ہیں"

لیبان کہتا ہے کہ جماعت کی قیادت وہ شخص نہیں کرسکتا جو جماعت کے نفسانی حالات سے واقف نہ ہو، جس کو یہ نہ معلوم ہو کہ جماعت کو کس طرح اثر پذیر کرنا چاہئے، خطیبانہ انداز کا جماعت پر کتنا اثر پڑتا ہے، غیر معقول دلائل سے جماعت کس طرح اثر پذیر ہوتی ہے، بعض خاص الفاظ اور جملے کسی جماعت میں کس بنا پر مقبول ہوتے ہیں، اور بعض خاص الفاظ اور جملوں کو بسا اوقات جماعت کیوں ناپسند کرتی ہے، جس شخص کو ان تمام امور کا علم نہ ہو وہ ہرگز قیادت کی صلاحیت نہیں رکھتا، اسلئے جب کسی قوم کی عنانِ سیاست اپنے ہاتھ میں لینا ہو تو سب سے پہلے جماعت کے ان نفسانی حالات کا علم حاصل کرنا چاہئے،

غرض یہ اس علم کے چند مختصر سے فوائد ہیں، جن کو لیبان نے جابجا اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے، اور اس بات پر حیرت کی ہے کہ باوجود ان فوائد کے علماے علم النفس اس فن سے کیوں اس قدر بیگانہ نظر آتے ہیں،

۲- دوسری بڑی خصوصیت لیبان کی یہ ہے کہ جن لوگوں نے علم الاجتماع سے بحث کی ہے، انھوں نے ان مؤثرات میں جو ہیئتِ اجتماعی پر اثر کرتے ہیں، قوموں کے نظامِ اخلاق اور مذہب کے اثر کو بہت کم اہمیت دی ہے، بلکہ اکثروں نے تو سوسائٹی کے مؤثرات میں نظامِ اخلاق اور مذہب کو شمار ہی نہیں کیا ہے، لیکن بخلاف اس کے لیبان نے نظامِ اخلاق اور مذہب کے اثر کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے، بلکہ قوموں کے مزاجِ عقلی کی تکوین کا بھی مدار اس نے اپنی دوسری کتاب "انقلاب الامم" میں اسی نظامِ اخلاق ہی پر رکھا ہے، اور اپنی دوسری کتاب "روح الاجتماع" جس کا ترجمہ آیندہ صفحات میں ناظرین کے پیش نظر ہے، اسکی ایک خاص فصل میں مذہب کے اثر سے اس نے بحث کی ہے،

نظامِ اخلاق کے اثر سے علماے علم الاجتماع نے جو غفلت برتی ہے اس کے بابت لیبان اپنی دوسری کتاب "انقلاب الامم" میں ایک موقع پر لکھتا ہے:۔

"جن ماہرین علم النفس نے نفسیاتِ اجتماع سے بحث کی ہے اُن کے ضعفِ نتائج کا بڑا سبب یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے مباحث کو صرف عقلی مسائل پر محدود کر لیا ہے، اور قوموں کے نظامِ اخلاق سے بالکل بحث نہیں کی ہے، میں کسی ایسے شخص سے واقف نہیں، جس نے نظامِ اخلاق کی اہمیت سے بحث کی ہو، بجز موسیو پولھان اور ایم ڈیو کے ان دونوں نے اس جانب تھوڑی سی توجہ کی ہے۔"

عموماً فلاسفہ نے سوسائٹی کے مؤثرات میں ان چیزوں کو داخل کیا ہے، جو مادی حیثیت سے جماعت پر اثر کرتی ہیں، ملک کی آب و ہوا، ماحول اور اسی قسم کے دیگر مؤثرات کو اُن کے نزدیک زیادہ اہمیت حاصل ہے، اور وہ واقعات کی توجیہ جو کرتے ہیں، تو محض مادیین کے اصول پر، حالانکہ لیبان کہتا ہے کہ ان ظاہری اسباب کے پیچھے اس قدر کثرت سے چھپے ہوئے مؤثرات ہوتے ہیں، جن تک عقلِ انسانی کی رسائی ہی نہیں ہو سکتی۔

چنانچہ لیبان روح الاجتماع میں ایک مقام پر لکھتا ہے:۔

"زمانۂ حال کے بعض مورخین خصوصاً موسیو ٹائن انقلاب فرانس کے بعض واقعات کی توجیہ کرنے میں جو ناکامیاب رہے، اس کا باعث بجز اس کے کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ موسیو ٹائن نے جماعت کے نفسانی حالات سے واقفیت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ ان مشکل مباحث میں بھی اُس نے مادیین کا وہی طرز اختیار کیا جو عموماً واقعات کی توجیہ کرتے وقت وہ اختیار کرتے ہیں، مادیین اخلاقی قوتوں سے بہت کم بحث کرتے ہیں، حالانکہ ان ہی قوتوں کی بنیاد پر تاریخ کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔"

پھر اس کے بعد ایک خاص فصل میں لیبان نے دعویٰ کیا ہے کہ جماعت کے اعمال و افعال پر مذہب کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے، جس سے انکار کرنا واقعہ سے انکار کرنا ہے' اس فصل کے آخر میں لیبان ایک مقام پر لکھتا ہے :۔

"پس مذہب کو جماعت کے مشاعر و احساسات اور اعمال و افعال پر جو تسلط اور غلبہ حاصل ہے، اس کی بنا پر میرا یہ خیال ہے، کہ کوئی شخص اہم تاریخی واقعات کی حقیقت کو اس وقت تک بتمام و کمال نہیں سمجھ سکتا، تا وقتیکہ وہ ان دینی معتقدات سے واقفیت نہ پیدا کرے، جو ان واقعات کی آڑ میں جماعت کی قیادت کرتے ہیں، پھر بعض تاریخی واقعات تو ایسے گذرے ہیں، جن کی توجیہ جماعت کے اعتقادی پہلو کے علاوہ کسی اور پہلو سے ہو ہی نہیں سکتی، یہی وجہ ہے، کہ موسیو ٹائن نے جو ایک زبردست فلسفی مورخ گذرا ہے، گو واقعۂ انقلاب فرانس کی تاریخ لکھتے ہوئے اس واقعہ کے تمام جزئیات پر مورخانہ اور محققانہ نظر ڈالی ہے لیکن چونکہ اُس نے جماعتوں کی اس نفسانی حقیقت کو کہ جماعتیں ہمیشہ مذہبی جذبہ کی محکوم ہوتی ہیں نظر انداز کر دیا، اس لئے بعض واقعات کے اسباب و علل دریافت کرنے میں وہ ناکام رہا۔"

حاصل یہ ہے کہ لیبان کے نزدیک جماعتوں اور قوموں کے تغیرات جن نفسانی موثرات کے معلول ہوتے ہیں، ان میں قوموں کے مذہب اور اُن کے نظامِ اخلاق کے اثر کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اس اہمیت کو یا تو بعض فلاسفہ اور مورخین نے بالکل نظر انداز کر دیا ہے اور یا اگر اُس کی جانب کسی نے توجہ بھی کی ہے تو محض سطحی توجہ کی ہے، لیبان زمانۂ حال میں پہلا فلسفی ہے، جس نے ان نفسانی موثرات سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ اپنی کتاب میں بحث کی ہے،

۳۔ تیسری بڑی خصوصیت لیبان کی یہ ہے کہ اول تو لیبان کے پیچھے کسی مصنف نے نفسیاتِ جماعت کے موضوع پر جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، مستقلاً قلم اُٹھایا ہی نہیں اور اگر قلم اٹھایا بھی ہے، تو محض اس پہلو پر اُٹھایا ہے کہ جماعت سے مجرمانہ افعال کا صدور کیوں ہوتا ہے یعنی یہ کہ جن جرائم کے ارتکاب سے انسان انفرادی حالت میں ہچکچاتا ہے، اُن افعال کے ارتکاب پر اجتماعی حالت میں اُس کو کیونکر جرات ہوتی ہے، اور پھر اس موضوع پر بھی جن لوگوں نے کچھ لکھا ہے، وہ ججوں کی ایک جماعت ہے، جنھوں نے عدالتوں کی کرسیوں پر بیٹھ کر صدہا مقدمات اس قسم کے فیصل کئے ہیں، اور اپنے اسی تجربہ کی بنا پر انھوں نے اعداد وشمار سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جماعت صرف مجرمانہ افعال کا ارتکاب کر سکتی ہے،

لیبان اس کے متعلق روح الاجتماع میں ایک مقام پر لکھتا ہے :۔

"البتہ تھوڑے دنوں سے ان کو کچھ اس جانب توجہ ہوئی ہے، مگر اب بھی ان کی نگاہ جس حیثیت سے جماعتوں پر پڑتی ہے، وہ یہ ہے کہ جماعتیں نادر وا افعال اور جرائم کا ارتکاب کرتی ہیں، بلاشبہہ یہ صحیح ہے کہ دنیا میں جرائم پیشہ جماعتیں بھی پائی جاتی ہیں، لیکن ان کے ساتھ دنیا میں نیک چلن اور بہادر جماعتیں بھی ہیں، پس جماعتوں کو صرف ارتکابِ جرائم کی نگاہ سے دیکھنے کا یہ مطلب ہوگا، کہ ہم کسی شے پر صرف ایک حیثیت سے نظر ڈالیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ جس طرح کسی شخص کے صرف ظاہری عیوب دیکھ لینے سے اُس کے پورے اوصاف اور پورے حالات کا علم نہیں ہو سکتا، اسی طرح صرف اس بات کی واقفیت سے کہ جماعت کبھی ارتکابِ جرائم کرتی ہے، جماعت کے پورے حالات کا علم نہیں ہو سکتا"

پھر دوسری جگہ لیبان کہتا ہے :۔

"جن علمائے نے اس علم کی جانب توجہ کی ہے، ان کے مباحث زیادہ تر جماعت کی مجرمانہ

حیثیت سے متعلق ہیں لیکن میں نے اس موضوع پر صرف ایک فصل میں بحث کی ہے، اور وہ بھی مختصر ہے، اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ناظرین کو ایم ٹارڈ اور موسیو سیگل کے اس رسالہ کی جانب توجہ دلاؤں جس کا نام "جماعاتِ جارمہ" ہے اور خصوصیت سے اس لئے زیادہ ان کتابوں کی جانب توجہ دلانے کی ضرورت ہے کہ میں نے جماعت کے قوائے عقلی کے متعلق جو خیالات ظاہر کئے ہیں، وہ ان دونوں مصنفوں کے خیالات کے برعکس ہیں"

پھر اس کے بعد لیبان نے جہاں پر جماعت کے اخلاق سے بحث کی ہے، وہاں نہ صرف یہ بتایا ہے کہ جماعت سے بسا اوقات محاسنِ اخلاق کا ظہور اور نیک افعال کا صدور بھی ہوتا ہے بلکہ اس کے ساتھ اُس نے ان لوگوں کی غلطی کا سبب بھی بتا دیا ہے، جو جماعت پر صرف اسکی مجرمانہ حیثیت سے نظر ڈالتے ہیں:۔

چنانچہ لیبان کہتا ہے :۔

"بعض ماہرینِ نفسیات نے جو جماعت پر صرف اسکی مجرمانہ حیثیت سے نظر ڈالتے ہیں، مطلقاً یہ حکم جو لگا دیا ہے کہ جماعت کے اخلاق ہمیشہ انحطاط پذیر ہوتے ہیں، اُس کا باعث صرف یہ ہے کہ اُنھوں نے جماعت کے اخلاق پر یک رخی نظر ڈالی ہے یعنی اُنھوں نے صرف یہ دیکھ لیا، کہ وہ شر و فساد کے جانب زیادہ مائل ہوتی ہے، اس بنا پر اُنھوں نے کہدیا کہ جماعت ہمیشہ بد اخلاق ہوتی ہے"

پھر اس کے بعد جماعت کے اخلاق کی بابت لیبان یہ دعوی کرتا ہے، کہ

"تاریخ کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ افراد نے نہیں، بلکہ جماعتوں ہی نے نزاہت، علم و عمل، اور عظائم اعمال کی مسلّم الثبوت مثالیں پیش کی ہیں"

یہ تو لیبان کا عام دعویٰ ہے۔ کہ جماعت کے اخلاق بسا اوقات پاکیزہ بھی ہوتے ہیں،

لیکن جس خاص فصل میں اُس نے جماعت کی مجرمانہ حیثیت سے بحث کی ہے، اور جرائم پیشہ جماعتوں کی سائیکالوجی لکھی ہے، وہاں دیگر مصنفین کے خلاف اُس نے نہایت بلند آہنگی کے ساتھ یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ جماعت سے درحقیقت کبھی مجرمانہ افعال کا صدور نہیں ہوتا، یوں قانون کی نظر میں خواہ اُن کے افعال جرم کی حد کے برابر آجاتے ہوں، لیکن فلسفیانہ نقطۂ نظر سے اُن کے افعال پر جرم کا اطلاق کرنا صحیح نہیں ہے،

لیبان کہتا ہے :-

"یہ صحیح ہے کہ جماعت کے بعض افعال بعض اوقات جرم کی حد کے اندر آجاتے ہیں لیکن یہ جرائم اسی طرح کے ہوتے ہیں، جس طرح ایک درندہ جانور جرائم کا ارتکاب کرتا ہے، اور باوجود اس کے درندہ کو کوئی مجرم نہیں کہتا، بات یہ ہے کہ جماعت سے جو جرائم سرزد ہوتے ہیں وہ کسی ہیجِ شدید کی بدولت اس سے وقوع میں آتے ہیں، اور اس ہیجِ شدید سے متاثر ہو کر جو افراد ان جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں، وہ یہ نہیں سمجھتے کہ وہ جرائم کا ارتکاب کر رہے ہیں، بلکہ وہ یہ سمجھتے ہیں، کہ وہ ایک واجب یا فرض ادا کر رہے ہیں، اور ظاہر ہے یہ شان مجرموں کی نہیں ہوتی ۔"

غرض لیبان نے اس کتاب میں درجہ بدرجہ ثابت کر دیا ہے کہ اصل میں جماعت کی جانب مجرمانہ افعال کا ارتکاب کرنا ہی غلط ہے، اور خاص کر جن لوگوں نے جماعت پر محض مجرمانہ حیثیت سے نظر ڈالی ہے، ان کی غلطی نہ صرف اتنی ہے کہ انھوں نے جماعت کی جانب مجرمانہ افعال کا ارتکاب کیا بلکہ انھوں نے اس مسئلہ پر یک رُخی نظر ڈالی ہے، یہ لیبان کی خاص تحقیق ہے، جس میں وہ دیگر علمائے یورپ کے مقابل میں منفرد ہے،

لیبان کی یہ چند خصوصیات ہیں، جن میں وہ تمام متقدمین اور متاخرین علمائے علم النفس

پر خاص فوقیت رکھتا ہے، اور جن کو اُس نے اپنی کتابوں میں جابجا خود ذکر کیا ہے، ان خصوصیات کا لحاظ کرتے ہوئے، غالبًا لیبان کا یہ دعویٰ کہ نفسیاتِ اجتماع پر مستقل حیثیت سے اس کے پہلے کسی نے قلم نہیں اُٹھایا، کچھ بیجا نہیں ہے، پھر لیبان کے نظریات اپنی جگہ پر خواہ کتنے ہی مکمل ہوں، لیکن اس کی تصنیفات اس قدر جا و بیجا تکرار اور حشو و زوائد سے مملو ہیں، کہ بعض جگہ تکرار کی بدولت مطالعہ کرنے والے کی طبیعت میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے، مگر اس سقم کے ساتھ یہ بھی پیش نظر کر لو کہ لیبان ہی پہلا شخص ہے جس نے اس موضوع پر سب سے پہلے مستقل حیثیت سے قلم اٹھایا اور اس کے پیشتر جن لوگوں نے اس موضوع پر بحث بھی کی تو اُن کے نتائج اور بحث اس قدر ناقص اور خلافِ واقعہ تھے کہ اس موضوع پر لکھتے وقت لیبان کو ان نتائج سے قطع نظر کرکے علم کے مبادی اور مسائل کو نئے سرے سے خود ترتیب دینا پڑا، اور ہر مسئلہ کے اصول و فروع خود لیبان ہی نے مرتب دیئے، پس ان تمام امور کا لحاظ کرنے کے بعد لیبان کی تصنیفات کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے اور علمائے یورپ میں **لیبان** ایک خاص امتیاز کا مستحق ٹھہرتا ہے،

(۳)

لیکن اس سلسلہ میں اگر ہم علمائے یورپ سے قطع نظر کرکے اسلامی لٹریچر اور علمائے اسلام کی تصنیفات پر بھی ایک نظر ڈال کر یہ دیکھیں کہ آیا اسلامی لٹریچر میں بھی علم نفسیاتِ جماعت کے متعلق کچھ مواد مل سکتا ہے یا نہیں تو یہ بہت زیادہ دلچسپ بات ہوگی، صفحاتِ بالا میں یہ خوب اچھی طرح ثابت ہو گیا ہے کہ **علم الاجتماع** سے جس ترتیب اور جس طرز سے لیبان نے بحث کی ہے، اس حیثیت اور اُس طرز سے لیبان کے پہلے کسی مصنف نے اس علم پر نظر نہیں ڈالی، اس لئے اب اس بحث میں ہمارے لئے نہایت آسانی ہو گئی ہے، اب ہم لیبان ہی کے نظریات کو لے کر اسلامی لٹریچر میں ان نظریات کو تلاش کرتے ہیں،

لیبان نے اپنی کتاب کو تین ابواب پر تقسیم کیا ہے، پہلے باب میں اُس نے جماعت کے اوصافِ عمومی سے بحث کی ہے اور اس باب کو تین فصلوں میں پھیلایا ہے، پہلی فصل میں جماعت کے ممیزاتِ عمومی سے بحث ہے، دوسری فصل میں جماعت کے جذبات سے، تیسری فصل میں جماعت کے قوائے عقلی سے اور چوتھی فصل میں مذہب سے لیبان کا طرزِ استدلال اپنے نظریات میں یہ ہے کہ چونکہ اجتماعِ انسانی انسان کے عہدِ طفولیت میں ورثہ اور اُس کی ابتدائی تاریخ کی یادگار رہے اس لئے جو اوصافِ جذبی و عقلی انسان کے عہدِ طفولیت میں افراد میں پائے جاتے ہیں، انہی کا ظہور انسان کی حالتِ اجتماعی میں بھی ہوتا ہے، اور چونکہ جماعت کیفیتِ نیم شعوری کا مکمل منظر ہوتی ہے اس لئے حالتِ اجتماع میں آکر افراد کی عقلی خصوصیتیں ماند پڑ جاتی ہیں، اور حالتِ اجتماع میں ارسطو کے بھی ہوش و حواس گم ہو جاتے ہیں، اور عام افراد کی طرح بہکی بہکی باتیں کرنے لگتا ہے، اثر پذیری، ضعفِ عقلی، تلون مزاجی، مبالغہ پسندی اور غیظ و غضب، یہ تمام اوصاف جو ناقص العقل افراد کی خصوصیتیں ہیں، حالتِ اجتماع میں آکر یہی سب اوصاف تمام افراد میں پیدا ہو جاتے ہیں، اور چونکہ جماعت میں آکر افراد کی عقل کند ہو جاتی ہے، اس لئے جماعت میں استدلال کرنے کی بھی صلاحیت نہیں رہتی، البتہ قوتِ تخیل ترقی کر جاتی ہے اور قوائے عقلی بے حس و حرکت ہو جاتے ہیں۔

پس اس صورت میں جو شخص جماعت کو اثر پذیر کرنا چاہتا ہے، اس کو چاہئے کہ جماعت کو اثر پذیر کرنے کے لئے حسبِ ذیل وسائل اختیار کرے۔

۱۔ استدلال سے گریز،

۲۔ تمثیل بیانی یعنی کسی واقعہ کو تشبیہات اور استعارات کی صورت میں بیان کرنا،

۳۔ بعض خاص الفاظ جو جماعت کے نزدیک پسندیدہ ہیں، ان کو زیادہ استعمال کرنا اور جو الفاظ اور جملے جماعت ناپسند کرتی ہے، ان کے استعمال سے حتی الامکان احتراز کرنا،

۴۔ جماعت کو آمادۂ عمل اور اثر پذیر کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے مذہبی عقائد یا موروثی خیالات سے زیادہ استدلال کیا جائے،

۵۔ مدعیانہ اور تحکمانہ طرز خطابت،

۶۔ الفاظ اور معانی کی تکرار،

یہ وسائل ہیں، جن سے جماعت اثر پذیر ہوتی ہے، اور جن سے عموماً خطباء اور قائدین جماعت کام لیتے ہیں، یہ دو ابواب کا خلاصہ ہے، اس کے بعد تیسرے باب میں جماعت کے اقسام سے بحث کی ہے، اور اس میں زیادہ تر نظریات سابقہ کو جماعت کے اقسام پر منطبق کیا ہے، یہ لیبان کے طرز بیان کا ایک تقریبی خلاصہ ہے،

پس لیبان کے نظریات پر اگر ایک غائر نظر ڈالی جائے، تو بہت آسانی سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ لیبان جس علم کو علم نفسیات جماعت کہہ رہا ہے، اور جو نظریات علم نفسیات جماعت کے اس نے ترتیب دیئے ہیں، ان میں کا اکثر حصہ علم خطابت کے متعلق ہے، خطیب کو کن الفاظ اور جملوں کا استعمال کرنا چاہیے؟ خطیب کو استدلال کا کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے؟ جماعت کو اثر پذیر کرنے کے کیا طریقے ہیں؟ تحکمانہ طرز ادا اور تکرار کا جماعت پر کیا اثر پڑتا ہے؟ استعارات اور تشبیہات جماعت کو کس طرح اثر پذیر کرتے ہیں؟ یہ اور اسی قسم کے دیگر سوالات کا تعلق علم خطابت سے ہے،

لیکن فرق یہ ہے کہ علم خطابت میں ان مسائل سے جو بحث ہوتی ہے، تو اس لئے کہ علم خطابت کا موضوع ہی یہی ہے کہ الفاظ اور جملوں سے جماعت کس طرح اثر پذیر ہوتی ہے گویا علم خطابت میں ان مسائل سے اصلاً و بالذات بحث ہوتی ہے، اور علم نفسیات جماعت میں ہیئتِ اجتماعی کے عام مؤثرات کے ضمن میں ان خطابی مسائل سے بھی بحث ہو جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ لیبان نے گو اپنی کتاب میں علم الخطابت کے بعض مسائل سے بحث تو کی ہے لیکن

علمِ خطابت کے مسائل کا استقصا نہیں کیا ہے،

غرض لیبان کے نفسیاتِ جماعت میں جن ابواب کو زیادہ اہمیت حاصل ہے وہ دو ہیں

۱۔ جماعت کے جذبات و قوائے عقلی کی تشریح،

۲۔ معتقداتِ جماعت کے مؤثرات، اسی ضمن میں اُس نے بعض اُن مسائل سے بھی بحث کی ہے، جن سے علمِ خطابت میں بھی بحث ہوتی ہے،

ان نظریات میں جتنا حصہ ایسا ہے، جو علمِ خطابت سے تعلق رکھتا ہے، اس کا غالب حصہ اسلامی لٹریچر میں شرح و بسط کے ساتھ موجود ہے، ابن سینا نے شفاء میں اور علمائے ادب اور دیگر منطقیین نے خطابت پر مستقل طور پر لکھا ہے، لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا کہ لیبان کی غرض ان مسائل کے بیان کرنے سے علم الخطابت پر کچھ لکھنا نہ تھا، بلکہ لیبان کے مباحث میں نفسِ اجتماعی کے مظاہرِ عقلی و فکری وغیرہ سے بحث کرنا زیادہ تر ملحوظ ہے، اس لئے علمِ خطابت کی کتابوں میں یہ مسائل اگر شرح و بسط کے ساتھ مذکور ہیں، تو اس سے علمِ نفسیاتِ اجتماع میں کوئی مزید اضافہ نہیں ہوتا، اور اس لئے ہمارے نزدیک علمِ خطابت کے مسائل سے لیبان کے نظریات کو تطبیق دینا یا لیبان کے نظریات کی تائید میں علمِ خطابت کی کتابوں سے شواہد پیش کرنا بالکل بے فائدہ ہے

البتہ یہ ضرور ہے کہ ابن سینا نے شفاء میں خطابت پر جو کچھ تحریر کیا ہے، اس سے طبعاً و ضمناً ہم علمِ نفسیاتِ اجتماع کے بعض مسائل کا یوں ہی سا استنباط کر سکتے ہیں، ابن سینا نے شفاء میں نہایت تفصیل سے اس امر پر بحث کی ہے کہ خطبہ دیتے وقت خطیب کو کون سے الفاظ اور کس قسم کے جملوں کا استعمال کرنا چاہئے، قیاساتِ خطابی اور قیاساتِ جدلی میں کیا فرق ہے، خطیب استدلال جو پیش کرتا ہے، اس کی کیا نوعیت ہوتی ہے، تمثیل اور استقراء ان دونوں میں سے جماعت پر کس کا اثر زیادہ ہوتا ہے، تشبیہات و استعارات سے مجمع کس طرح اثر پذیر

ہوتا ہے، مدح و ذم یا رغبت و نفرت کے جذبات پیدا کرنا ہوں، تو اس کے لئے خطیب کیا کیا تدابیر اختیار کرسکتا ہے، غرض وہ تمام مسائل جن کا تعلق علم خطابت سے ہے، نہایت بسط کیساتھ ابن سینا نے ان سے بحث کی ہے، اور یہ مسائل گو مستقلاً علم نفسیاتِ جماعت کے مسائل تو نہیں، لیکن ان مسائل سے نفسیاتِ جماعت کے اصول و فروع کی ترتیب و تدوین میں ایک گونہ آسانی ہوسکتی ہے،

لیکن ان مسائل کے علاوہ لیبان کے اور نظریات جو ہیں، مثلاً یہ کہ جماعت کے جذبات اور قوائے عقلی کی تشریح، یا مثلاً یہ مسائل کہ معتقداتِ جماعت کے پیدا کرنے میں زمانہ کا کیا اثر ہوتا ہے، مخصوص نظامِ حکومت اور مخصوص نظامِ معاشرت کو ہئیتِ اجتماعی کے تغیرات میں کیا دخل ہوتا ہے، تعلیم و تربیت سے ہئیتِ اجتماعی پر کیا اثر ڈالا جا سکتا ہے؟ اور یہ اسی قسم کے دیگر مسائل جن کا تعلق خاص علم نفسیاتِ جماعت کے ساتھ ہے، اس ترتیب اور تفصیل کے ساتھ اسلامی لٹریچر میں ان کا کہیں پتہ نشان نہیں ملتا، البتہ اُن کی جانب جستہ جستہ اشارات و کنایات کہیں کہیں ملتے ہیں، مثلاً ابن خلدون نے ایک خاص فصل میں یہ دعویٰ کیا ہے، کہ دیہاتی باشندے شہری باشندوں سے زیادہ نیک کام کرتے ہیں، یا اسی طرح ابن خلدون نے ایک اور فصل میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ دیہاتی باشندے شہری باشندوں سے زیادہ شجاع ہوتے ہیں، یا مثلاً ایک فصل میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ وحشی قوموں کو دیگر اقوام پر غلبہ حاصل کرنے کی زیادہ قدرت ہوتی ہے، اور گو ان مباحث کا مقصد دیہاتی اور شہری باشندوں کی اخلاقی حالت کا موازنہ کرنا ہے، لیکن ان مباحث سے جماعتوں اور قوموں کی اخلاقی حالت کا بھی تھوڑا بہت اندازہ ہوتا ہے،

ان مباحث کے علاوہ لیبان نے ایک خاص فصل میں یہ دعویٰ جو کیا ہے، کہ جماعت کے اعمال و افعال پر مذہب کا بڑا اثر ہوتا ہے اور جماعت کسی بڑے کام کو اُس وقت تک انجام

نہیں دے سکتی، جب تک اس کے افعال مذہبی جامہ نہ پہن لیں، اس کے بکثرت شواہد موجود ہیں۔
اسی بحث کے ضمن میں لیبان بڑی بڑی حکومتوں اور سلطنتوں کے قیام کا سبب حسبِ ذیل بیان کرتا ہے:۔

"حقیقت یہ ہے کہ رومی نشان کے آگے بیکس اقوام سپر انداز جو ہوگئیں، تو اس کی وجہ یہ تھی کہ شہنشاہ روم اُن کی نگاہ میں ایک معبود کے رتبہ پر پہنچ گیا تھا، اور چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں اُس کے نام کی محرابیں اور طاق تعمیر کئے جاتے تھے، اور رومی حکومت میں ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ایک جدید مذہب کی اشاعت کی گئی تھی جس کی بنا قیاصرۂ روم کی پرستش پر تھی، یہاں تک کہ مسیحیت کے ظہور سے کچھ مدت پیشتر سرزمین گال میں شہر لیون کے قریب قیصر آگسٹس کے نام کا ایک ہیکل تعمیر کیا گیا تھا جس کے مجاوروں کی سطوت و ہیبت باشندگانِ گال کے دلوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔"

لیبان کہتا ہے کہ سلطنتِ روم کی تقویت اور شوکت کا باعث یہ تھا کہ تمام رومی صوبے شہنشاہانِ روم کے ناموں کا کلمہ پڑھتے تھے، اور مذہبی پردے میں دولتِ روم کی طاقت و شوکت کا اظہار کیا جاتا تھا، بلکہ ایک خاص مذہب ایجاد کیا گیا تھا جس کی بنا قیاصرۂ روم کی پرستش پر تھی، اس مذہب کی اشاعت تمام رومی صوبوں میں کی گئی تھی، لیبان کے کہنے کا مطلب یہ ہے، کہ رومی سلطنت کو اُس وقت تک استحکام نصیب نہ ہوا جب تک رومی شہنشاہوں نے اپنے اغراضِ ملک گیری پر مذہبی رنگ نہ چڑھا لیا، اور خود رومی شہنشاہوں نے بجائے شاہانہ سطوت کے مذہبی تقدس و عظمت کا رنگ نہ اختیار کر لیا، غرض مذہبی رنگ جس تحریک پر چڑھا دیا جاتا ہے، وہ بہت جلد کامیاب ہو جاتی ہے،

پھر لیبان ایک دوسرے موقع پر اس مذہبی رنگ کی جس سے حکومتوں کی سطوت و

شوکت میں اضافہ ہوتا ہے، حسب ذیل تشریح کرتا ہے:۔

"انسان میں اصلی دینداری کا ظہور اُس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنی ولے اپنی مرضی اور اپنی ذات کو کسی معبود کی مرضی اور اس کے ارادہ پر چھوڑ دیتا ہے اور اپنی مرضی کو اُس کی مرضی کے اندر بالکل فنا کر دیتا ہے، جب یہ اعتقادی کیفیت انسان کے اندر پیدا ہو جاتی ہے تو اس وقت تمام دوسرے خیالات کے گرد و غبار سے اس کا شیشۂ دل پاک و صاف ہو جاتا ہے اور اس وقت اس کے تمام افعال و اعمال کا محور اور مرجع وحید صرف وہی ذات ہوتی ہے، جس کی مرضی اور شخصیت کے اندر اُس نے اپنی مرضی اور شخصیت کو فنا کر دیا ہے"

اس فقرہ میں لیبان نے تصریح کر دی ہے کہ افعالِ جماعت پر مذہب کا جو اثر ہوتا ہے اُس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ افراد کی شخصیتیں اور افراد کے ذاتی ارادے سب کا رخ ایک خاص مقصد کی جانب ہوتا ہے، ایک خاص معبود کا خیال (خواہ یہ معبود کسی رنگ میں ہو) تمام افراد پر اس قدر مستولی ہو جاتا ہے کہ تمام دوسرے خیالات، ذاتی رنجشیں، کدورتیں اور خود غرضیاں سب دور ہو جاتی ہیں، اور تمام افراد ہمہ تن ایک خاص خیال میں محو ہو جاتے ہیں، اب اگر اس فقرہ کو اس پچھلے فقرے سے ملاؤ، جو اوپر مذکور ہو چکا ہے، تو ان دونوں فقروں کا حاصل یہ ہوگا کہ سلطنتوں کو شوکت وسطوت اُس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ کسی مذہبی رنگ سے سیاسی اغراض کو تقویت نہ پہنچائی جائے اور وہ مذہبی رنگ یہ ہے کہ کسی مافوق العادۃ معبود کی عبادت و اطاعت کا خیال افراد پر مستولی کر دیا جائے، تاکہ تمام دوسرے خیالات دماغوں سے بالکل نکل جائیں، چونکہ اس وقت ایک ہی خیال تمام افراد پر مستولی ہوتا ہے، اس لئے افراد کی ذاتی رنجشیں اور کدورتیں فنا ہو جاتی ہیں اور تمام لوگ ایک مقصد کے درپے ہوتے ہیں، یہ راز ہوتا ہے حکومت کی تقویت کا،

یہ لیبان کا بیان ہے، لیکن ابن خلدون نے بھی ایک خاص فصل میں دعویٰ کیا ہے

کہ بڑی بڑی حکومتوں کے قیام کا راز کوئی خاص مذہبی تحریک ہوا کرتی ہے، جو سیاسی اغراض کے اندر مضمر ہوتی ہے،

ابن خلدون کہتا ہے:۔

"حکومت بغیر غلبہ کے حاصل نہیں ہوتی، اور غلبہ کے حصول کا ذریعہ صرف یہ ہے کہ وہ گروہ جو غلبہ حاصل کر رہا ہے، متحد الخیال ہو، بات یہ ہے کہ جب لوگوں کی خواہشوں میں اختلاف اور خیالات میں تضاد ہوتا ہے، اور لوگوں کا میلان دنیا کی جانب ہوتا ہے، تو اُس وقت آپس میں پھوٹ پڑ جاتی ہے لیکن جب لوگوں کی توجہ کسی خاص مقصد کی تحصیل کی جانب مبذول ہوتی ہے اور سب کی توجہ خدا کی جانب ہوتی ہے، تو اُس وقت آپس کا اختلاف مٹ جاتا ہے، ہر شخص ایک دوسرے کی اعانت کرتا ہے اور اس طرح باہمی معاونت و مساعدت کے ذریعہ سے حکومت کی سطوت وشوکت میں ترقی ہو جاتی ہے"[1]

اس کے بعد دوسری فصل میں ابن خلدون دوسرا یہ دعویٰ کرتا ہے کہ سیاسی اغراض مذہبی پردے میں اگر حاصل کی جاتی ہیں تو اُن اغراض کے حصول میں آسانی ہوتی ہے اس دعویٰ پر ابن خلدون نے جو دلیل قائم کی ہے، وہ حسب ذیل ہے:۔

"جو فریق اپنے سیاسی اغراض کو مذہبی پردہ میں حاصل کرنا چاہتا ہے، چونکہ اس گروہ کے افراد میں ذاتی رنجشوں اور کدورتوں کا نام ونشان نہیں ہوتا، اور سب کا منتہائے مقصود متعین ہوتا ہے اس لئے اس فریق کا ہر ہر فرد منتہائے مقصود کے حاصل کرنے میں اپنی جان تک لڑا دیتا ہے، بخلاف فریق مقابل کے کہ اس کی قوت خواہ کتنی ہی زیادہ ہو، مگر چونکہ اس کا کوئی خاص قبلۂ مقصد نہیں ہوتا، اس لئے وہ اپنی جان ویسی نہیں لڑاتا جس طرح پہلا فریق لڑاتا ہے[2]

[1] مقدمہ ابن خلدون ص۔ [2] ایضاً،

ابن خلدون اور لیبان دونوں کے مندرجۂ بالا اقتباسات بالکل متقارب المعنی ہیں، اور اس باب میں دونوں کی تحقیق یکساں ہے،

حاصل یہ کہ لیبان نے جس طرز پر علم نفسیات جماعت کے اصول و فروع کو مدون کیا ہے اس موضوع پر گو علماے اسلام میں سے کسی نے مستقلاً کچھ نہیں لکھا، تاہم اسلامی لٹریچر میں علم تہذیب الاخلاق یا مباحث تاریخی کے ضمن میں اشارۃً و کنایۃً جو کچھ مواد موجود ہے، اس سے اس فن پر ہلکی سی روشنی ضرور پڑتی ہے اور اس لحاظ سے کہہ سکتے ہیں، کہ گو کسی خاص ترتیب کے ساتھ لیبان کے نظریات اور علم نفسیات جماعت کے مسائل سے اسلامی لٹریچر خالی ہے تاہم اسلامی لٹریچر اس فن کے مسائل سے بالکل ناآشنا نہیں ہے،

ے مقدمہ ابن خلدون ص۸،

مقدمۂ مؤلف

ہم اپنی پہلی تصنیف میں قبائل کے نفسانی حالات سے بحث کر چکے ہیں، اب اس کتاب میں جماعتوں کے نفسانی حالات سے بحث کرتے ہیں۔

ہر قبیلہ کی روح چند اوصاف اور خصائل کے مجموعہ سے پیدا ہوتی ہے، جو اس کے افراد میں وراثۃً چلے آتے ہیں، لیکن جب یہ افراد یکجا ہو کر کوئی کام کرنے کے لئے اٹھتے ہیں، تو اس اجتماع سے چند جدید نفسانی حالات پیدا ہوتے ہیں، جو موروثی خصائل کے مطابق اور بسا اوقات اُن کے مخالف ہوتے ہیں،

قوموں کی زندگی پر ہمیشہ منتظم جماعتوں کا بہت بڑا اثر پڑتا رہا ہے، لیکن اس زمانہ میں یہ اثر جس حد تک پہنچ گیا ہے، اُس حد تک کسی زمانہ میں نہیں پہنچا تھا، کیونکہ ہمارے زمانہ میں جماعتوں کا یہ غیر ارادی اثر افراد کے اس اثر کا قائم مقام ہو گیا ہے، جس کے ساتھ ان کا طبعی ارادہ شامل ہوتا ہے، اور آج یہ اثر موجودہ زمانہ کے خصوصیات میں شمار کیا جاتا ہے۔

جماعت کے موضوع پر باوجود اس کی مشکلات کے میں صرف علمی وسائل سے بحث کرنا چاہتا ہوں، یعنی میں اس طریقہ کو اختیار کرنا چاہتا ہوں جس کی بنا علمی قواعد پر ہے، اور اُن آراء، نظریات اور مذاہب کی جانب متوجہ نہیں ہونا چاہتا جو بطور مسلمات کے مان لے گئے ہیں، کیونکہ ہمارے موضوعِ بحث کی طرح جب کوئی موضوع ایسا ہو جس میں فکروں کو جولانی کا موقع ملے، تو اس میں حقیقتِ گم شدہ تک پہنچنے کا صرف یہی ایک ذریعہ نظر آتا ہے، ایک ماہرِ فن جو اپنی بحث سے کسی بات کو ثابت کرنا چاہتا ہے اس کی پروا نہیں کرتا، کہ اس کی اس بحث

سے کن مصالح اور منافع کو صدمہ پہنچتا ہے موسیو گوبلٹ ڈی الویلا نے جو ایک بردست مفکر ہے اپنی ایک حال کی تصنیف کی بابت یہ خیال ظاہر کیا ہے۔

"میں نے اس کتاب میں ان خیالات سے اکثر جگہ اختلاف کیا ہے، جو موجودہ زمانہ میں متفق علیہ قرار دئے گئے ہیں، کیونکہ میں کسی کا مقلد نہیں ہوں"

مجھے یقین ہے کہ میری یہ تصنیف بھی میری اور سابقہ تصانیف کا درجہ حاصل کرے گی کیونکہ میرا خیال یہ ہے کہ کسی مذہب میں شامل ہو جانے سے اپنے افکار کو محدود کرنا، اور اس کے خیالات کا پابند ہو جانا ضروری ہو جاتا ہے،

تاہم ناظرین کو یہ بتا دینا میرا فرض ہے کہ وہ کیا سبب ہے، جس کی بنا پر میرے اخذ کردہ نتائج بادی النظر میں ان مباحث کے لازمی نتائج سے مختلف ہوتے ہیں ہ میں نے ایک مقام پر یہ ثابت کیا ہے، کہ ہر جماعت کی قوتِ فکریہ یہاں تک کہ ان جماعتوں کی بھی جو اہل فضل و کمال سے مرکب ہوتی ہیں انحطاط پذیر ہوتی ہے، پھر یہ بھی میرا خیال ہے کہ باوجود اس دماغی انحطاط کے نظام جماعت میں خلل انداز ہونا، ان کے شیرازے کو پراگندہ کر دینا ہے، لیکن بات یہ ہے کہ تاریخی حوادث میں زیادہ غور و فکر کرنے سے میں ہمیشہ اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ افراد کی طرح انسانی جماعتوں کی تنظیم و ترتیب بھی مشکل سے عمل میں آتی ہے۔ اس لئے ان کے حالات میں دفعتہً تغیر پیدا کرنا ہماری دسترس سے باہر ہے، فطرت البتہ ان کے حالات میں انقلاب کلی پیدا کر سکتی ہے لیکن یہ تغیر ہمارے ارادہ کا پابند نہیں ہو سکتا، یہی وجہ ہے کہ گو بعض لوگوں کے اس خیال کو کہ قوموں کی حالت میں پوری اصلاح ہو جائے عقل اچھا سمجھتی ہے، لیکن اس خیال نے قوموں پر بہت برا اثر کیا، کیونکہ یہ اصلاحیں صرف اس وقت مفید ہو سکتی ہیں، جب قومی روح کو دفعتہً بدل دیا جائے، لیکن یہ قدرت صرف زمانہ ہی کو حاصل ہے، تمام انسان اپنے جذبات

و احساسات اور عادتوں کے محکوم ہوتے ہیں، اور یہ تمام چیزیں ہمارے اندر موجود ہیں، اور قوانین و نظامِ حکومت تو محض ہمارے نفس کا ایک پرتو اور اُس کی ضروریات کے ترجمان ہیں، لیکن چونکہ نفس ہی ان قوانین و نظامِ حکومت کا مبدء ہے، اس لئے وہ خود ان کو بدل نہیں سکتا،

جاننا چاہئے کہ اجتماعی حالات کی بحث کو ان اقوام کی بحث سے علیحدہ کرنا صحیح نہیں ہے جن میں وہ حالات پائے جاتے ہیں، کیونکہ اگرچہ عقلی و نظری حیثیت سے یہ صحیح ہے کہ ان حالات کی کوئی قدر و قیمت ہے، لیکن بلحاظ عمل اُن کی قدر و قیمت ہمیشہ اقوام کی نسبت سے ہوتی ہے،

پس کسی قوم کی اجتماعی حالت پر بحث کرنے کی غرض سے ان پر دو مختلف حیثیتوں سے نظر ڈالنا مناسب ہے، اس وقت یہ بھی معلوم ہوگا، کہ محض نظری تعلیم عملی تعلیم سے کس قدر مختلف ہوتی ہے، اور کوئی نتیجہ (حتی کہ علوم طبعیہ کے نتائج بھی) اس کلیہ سے بہت کم مستثنیٰ ہو سکتے ہیں، مثال کے طور پر دائرہ کو لو، کلی طور پر اس کی شکل وہی ہندسی شکل ہے جو اصول و قواعد کے تحت میں داخل ہے، لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ آنکھوں کے سامنے مختلف صورتوں میں آتا ہے، کبھی تم اس کو ستون کی صورت میں دیکھتے ہو اور کبھی وہ تمھارے سامنے مربع شکل آتا ہے، کبھی دائرہ ایک نامکمل ٹکڑا ہوتا ہے، اور وہ خطِ مستقیم کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے، لیکن باوجود اس کے ان ظاہری شکلوں کا لحاظ اصلی اور حقیقی اشکال سے زیادہ کرنا چاہئے، کیونکہ یہی ظاہری شکلیں ہماری نظر کے سامنے آتی ہیں، اور ہم انہی کا نقشہ یا فوٹو کھینچ سکتے ہیں، اسی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ بعض اوقات ظاہری صورت اصلی صورت سے زیادہ حقیقت رکھتی ہے، کیونکہ ہندسی اصول کے مطابق ہندسی اشکال کی تشخیص و تعیین کے یہ معنی ہیں کہ اُنکی اس حقیقت کو بگاڑ دیا جائے، اور وہ لوگوں کی نگاہ سے چھپا دی جائیں، اس بنا پر اگر ہم ایک ایسی دنیا فرض کریں جس کے رہنے والوں کو چیزوں کی تصویر کھینچنے کے سوا اُن کے چھونے

کی قدرت نہ ہو، تو ان کے لئے اُن کی حقیقی صورت کا تصور قائم کرنا مشکل ہوگا، پس معلوم ہوا کہ عملی حیثیت سے خارجی اشکال کی کتنی اہمیت ہے، اور عام لوگ ہندسی اشکال کو صرف ان کی شکلوں ہی سے سمجھ سکتے ہیں،

پس وہ فلسفی جو اجتماعی حالت سے بحث کر رہا ہے، اس کا فرض ہے کہ علمی قدر و قیمت کے مقابل میں ان حالات کی عملی قدر و قیمت سے بھی غافل نہ رہے، کیونکہ تمدنی تغیرات میں ان عملی حالات کو بہت کچھ اہمیت حاصل ہے، اور اگر اُن کا لحاظ رکھا جائے تو خالی منطق سے جو بے سروپا نتائج ہوتے ہیں، ان کی صحت پر یقین کر لینے سے احتیاط ہو جاتی ہے،

اس کے علاوہ چند اور اسباب ہیں، جن سے یہ احتیاط برتنے کی ضرورت ثابت ہوتی ہے،

۱- چونکہ اجتماعی حالات نہایت مشکل اور پیچیدہ ہوتے ہیں، اس لئے ان اسباب کا احاطہ کرنا اور ان کے باہمی فعل و اثر کو پہچانتا سخت دشوار امر ہے،

۲- ظاہری حوادث کی تہ میں کثرت سے چھپے ہوئے مؤثرات ہوتے ہیں، جو نظر نہیں پڑتے، اور یہ ظاہری حوادث کسی نہ کسی عظیم الشان عمل کا نتیجہ ہوتے ہیں جو ہمارے علم و بحث سے بالاتر ہے،

ظاہری حوادث کی مثال اُمنڈتے والی موجوں سے دیجا سکتی ہے، جو سطحِ آب پر سمندر کے اس اندرونی تلاطم کا پتہ دیتی ہیں، جو ہماری نظر سے غائب ہے، جماعتوں کے حالات میں غور و فکر کرنے سے بعض اوقات تو ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ ان سے یہ افعال اسی حالت میں سرزد ہو رہے ہیں جس سے اُن کے قوائے مدرکہ کے انحطاط کا پتہ لگتا ہے لیکن دوسرے وقت اُن کے دوسرے اعمال و افعال کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک

پوشیدہ طاقت کے زیر اثر ہیں، جسے اگلے لوگ مقدر یا طبیعت یا دستِ غیب کی امداد سے تعبیر کرتے تھے، اور اس زمانہ کے لوگ اسے مردوں کی آواز سے تعبیر کرتے ہیں،

حاصل یہ کہ گو ہم جماعت کی اس قوت کی حقیقت سے ناواقف ہوں لیکن ہم اس کے وجود سے انکار نہیں کر سکتے، اور یہی قوت قوموں کے تمام اندرونی اور بیرونی نظام میں مخفی طور پر کام کیا کرتی ہے، کوئی شئے تم کو زبان سے زیادہ پیچیدہ، زیادہ خوش نما اور زیادہ دقیق انتظام نہ ملے گی لیکن جانتے ہو کہ اس کا مصدر کون ہے؟ اس کا مصدر وہی بے حس و شعور روح ہے جو جماعت کے قالب میں مخفی رہتی ہے، دیکھو اکاڈیمیاں اور ماہرین فن نحو کس کس طرح اس کوشش میں اپنی جان کھپاتے ہیں، کہ زبان کے قواعد کی تدوین کریں، لیکن بالآخر اس کوشش میں ناکامیاب رہتے ہیں، اسی طرح ہمیں یہ بھی یقین نہیں آتا کہ وہ بلند خیالات جو باکمال رہبرانِ قوم پیدا کرتے ہیں وہ خود ان کے اعمالِ دماغی کے نتائج ہوتے ہیں، بلاشبہہ یہ صحیح ہے کہ وہ ان خیالات کے موجد ہوتے ہیں، لیکن ہم کو یہ نہ بھولنا چاہئے، کہ خاک کے وہ ذرے جن کے تودے پر ان افکار نے نشوونما حاصل کی، ان کو جماعتوں کی اس مخفی روح نے پیدا کیا ہے، جو پوشیدہ طور پر جماعت پر حکمراں ہے،

جماعتوں کو کام کرتے وقت کبھی اپنے عمل کا احساس نہیں ہوتا، اور درحقیقت یہی ان کی طاقت کا راز ہوتا ہے، لیکن بایں ہمہ ہم دیکھتے ہیں، کہ وہ اشخاص جو صرف الہام کے مطیع ہوتے ہیں، ایسے کام کر بیٹھتے ہیں، جن کے سمجھنے سے عقل حیرت زدہ رہ جاتی ہے اور وجہ یہ ہے کہ عالمِ انسانیت میں عقل ایک نئی اور ناقص شئے ہے، اس لئے ہماری عقل کو اس بات کی قدرت نہیں، کہ وہ افعال جو غیر شعوری حالت میں انسان سے صادر ہوتے ہیں، ان کے قوانین و اصول سے وہ واقف ہو سکے، اور یہ تو بہت بعید ہے، کہ ہم ان افعال کے ایک

قانون کو دوسرے قانون کی جگہ پر لا کر رکھدیں، تمام انسانی افعال میں غیر شعوری قوت سب سے زیادہ اور عقل کا حصہ سب سے کم ہے، اور غیر شعوری قوت ایک مخفی طاقت کے مانند فعل واثر کرتی ہے،

اس بنا پر اگر ہم معرفت اشیا کے ان محفوظ اور تنگ حدود پر ٹھہرنا چاہتے ہیں، اور مبہم ظنیات اور غیر مفید فرضیات کے میدان میں سرگشتہ ہونا نہیں چاہتے، تو ہم کو صرف ان حوادث کی بحث پر اکتفا کرنا چاہیے، جو ہمارے حواس کے سامنے ہیں، ان مشاہدات کی بنا پر جو نتائج حاصل ہوں گے، وہ محض سرسری ہوں گے، کیونکہ ان عام حوادث کی آڑ میں جن کو ہم علانیہ دیکھتے ہیں، ایسے حوادث بھی موجود ہیں، جو رویاے کاذبہ کی صورت میں ہم کو نظر آتے ہیں، اور ان کی آڑ میں بعض ایسے حوادث ہوتے ہیں، جو ہم کو مطلق نظر نہیں آتے،

تمہید

جماعتوں کا دور

"زمانۂ حال کا انقلاب، تمدن کے عظیم الشان انقلابات قوموں کے خیالات کا نتیجہ ہوتے ہیں، جماعت کی طاقت کی نسبت زمانۂ حال کے لوگوں کے خیالات، پرانی سلطنتوں کی مقلدانہ سیاست کو ادل بدل رہے ہیں، قوم کو کس طرح غلبہ حاصل ہوتا ہے اور اس غلبہ کی رفتار کیا ہے، جماعت کے تسلط کے لازمی نتائج، جماعتیں صرف بگاڑ سکتی ہیں، بنا نہیں سکتیں، جماعتیں اس تمدن کو مٹا دیتی ہیں، جس کی بنیاد کمزور ہوگئی ہو، جماعتوں کے احوالِ نفسیہ سے بے خبری، صاحبِ شریعت اور اہلِ سیاست کیلئے ان حالات سے واقف ہونے کی اہمیت"

دنیا کے واقعات کو سرسری نگاہ سے دیکھنے والے یہ سمجھتے ہیں، کہ وہ عظیم الشان انقلابات جو اقوام کے تمدن میں تغیر پیدا ہونے سے پہلے پیدا ہوتے ہیں، (مثلاً سلطنت روما کا زوال اور عربی حکومت کا قیام) کسی بڑے سیاسی تغیر کا نتیجہ ہوتے ہیں، مثلاً بعض قوموں کا بعض پر حملہ آور ہونا اور تختِ سلطنت کا ہاتھ سے نکل جانا وغیرہ وغیرہ، لیکن اگر ان واقعات پر گہری نظر ڈالو، تو معلوم ہوگا کہ ان کے ظاہری اسباب کے علاوہ اُن کا حقیقی سبب قوموں کے

خیالات کا عام انقلاب ہے، پس اہلِ نظر کو جس بات سے حیرت ہونا چاہئے وہ یہ عظیم الشان سیاسی تغیرات نہیں ہیں، بلکہ قابلِ اعتبار صرف وہ تغیر ہے، جو کسی قوم کے افکار، خیالات اور اعتقادات میں واقع ہوتا ہے، اور حقیقت میں یہ عظیم الشان تغیرات جو صفحاتِ تاریخ پر باقی رہیں گے، اس مخفی تغیر کے ظاہری آثار ہوتے ہیں، جو لوگوں کے خیالات میں پیدا ہوتا ہے، لیکن اگر یہ واقعات بہت نادر الوقوع ہیں، تو اس کا سبب یہ ہے کہ قوموں کے اخلاق میں سب سے زیادہ پائدار وہ موروثی خیالات ہیں، جو اُن کے آباء و اجداد سے ان کو وراثۃً ملے ہیں،

انسان کی تاریخ میں کوئی ایسا دور نہ گذرا ہوگا، جس میں انسانی افکار کے اندر اتنا عظیم الشان تغیر واقع ہوا ہو، جتنا ہمارے زمانہ میں واقع ہوا ہے، اور اُس کے اصلی سبب دو ہیں،

۱- ان تمام دینی، سیاسی اور اجتماعی معتقدات کی بنیادیں ایک دم متزلزل ہوگئی ہیں جو موجودہ تمدن کی بنا رہیں،

۲- موجودہ زمانہ کے علمی اور صنعتی انکشافات کی بدولت زندگی میں نئے حالات اور جدید افکار پیدا ہوگئے ہیں، اور چونکہ پرانے افکار کا ابھی پورے طور پر زوال نہیں ہوا ہے، اس لئے ان کی قوت ابتک باقی ہے اور جو افکار اُن کی جگہ لے رہے ہیں، وہ ابھی دورِ تکون اور ابتدائی حالت میں ہیں، اس لئے موجودہ زمانہ تغیر و اضطراب کا زمانہ ہے،

اس امر کی نسبت پیشین گوئی کرنا کہ آگے بڑھکر موجودہ بے چینی سے کیا نتیجہ پیدا ہوگا اسی طرح دشوار ہے، جس طرح ہم یہ نہیں بتا سکتے کہ کن افکار اور خیالات پر آنے والی قوموں کے تمدن کی بنیاد ہوگی، البتہ ہم ابھی سے اتنا جانتے ہیں کہ ان قوموں کے آگے ایک عظیم الشان اور زبردست قوت ہوگی، اور اس کا لحاظ کرنا ان کے لئے ضروری ہوگا، اس قوت سے

میری مراد جماعتوں کی قوت ہے، یہ وہ طاقت ہے، جو آج تک صرف بوسیدہ خیالات کے ان مٹے ہوئے نشانات پر جن کو لوگ حقیقت سمجھتے تھے قائم ہے، وہ مردہ ہو گئی تھی، لیکن ان مختلف شورشوں کے بعد جنھوں نے ان دوسری قوتوں کے اثر کو بالکل دبا دیا، جو پہلے انسان پر حکومت کرتی تھیں، وہ دوبارہ پھر زندہ ہو گئی، اور نظر آتا ہے کہ وہ عنقریب اپنے ماسوا سب کو فنا کر دے گی، تم دیکھتے ہو کہ ہمارے قدیم اعتقادات اپنی کمزور بنیادوں کی بدولت لرز رہے ہیں، اور قدیم تمدن کے ستون ایک دوسرے پر گر رہے ہیں، اور صرف جماعت ہی کا ایک غلبہ ہے، جس کو کوئی روکنے والا نہیں رہا ہے، بلکہ وہ برابر بڑھتا جاتا ہے، اور اس بنا پر جس زمانہ کی جانب ہم بڑھ رہے ہیں، وہ لازمی طور پر **جماعتوں کا دور** ہے،

تقریباً ایک صدی ادھر تاریخی حوادث و واقعات پر حکومتوں کی آبائی اور موروثی سیاست اور بادشاہوں کے ذاتی جھگڑوں کا اثر حاوی تھا، لیکن آج تقلیدی سیاست کا کوئی وزن اور بادشاہوں کے شخصی جھگڑوں کا کوئی اثر نہیں رہا، بلکہ جو غلبہ ہے، وہ جماعتوں کی آواز کو ہے، وہی بادشاہوں کا رویہ مقرر کرتی ہے اور سلاطین اس کوشش میں رہتے ہیں کہ ان کی آواز و تک کان لگائیں، اور اب قوموں کے طریقِ کار کا رخ امراء کے مشورہ کی جانب نہیں رہا، بلکہ جماعتوں کی روح کی جانب ہے،

پس تغیرات کا یہ دور جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں، اس کی ایک ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ قوموں کی حالت میں تغیر ہو گیا ہے، اور اگر پہلے عنانِ سلطنت افراد کے ہاتھوں میں تھی، تو اب جماعتوں کے ہاتھوں میں آگئی ہے، بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں چونکہ حقِ انتخاب عام کر دیا گیا ہے، اسلئے جماعتوں کو غلبہ حاصل ہو گیا ہے، لیکن یہ حق تو ایک

عرصہ سے لوگوں کو حاصل تھا، اور یہ حالت جو آج پیدا ہوئی ہے، وہ پہلے نہ تھی، حقیقت یہ ہے
کہ جماعت کا تسلط پہلے اُن افکار کے پھیلنے سے بتدریج بڑھتا گیا، جو زمانۂ حال میں ذہنوں کے
اندر راسخ ہوگئے ہیں، پھر اس کے بعد جب سے لوگوں نے اجتماعی قوت کے اثر کو حصولِ مقاصد
کا ذریعہ بنانا شروع کیا، اس وقت سے جماعتوں نے غلبہ حاصل کر لیا، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ
جماعتوں کو اپنے منافع اور اپنی زبردست قوت کا بھی احساس پیدا ہوگیا، اب جماعتیں کمپنیاں
اور مختلف تجارتی بینک قائم کرتی ہیں، جن کا مقصد یہ ہے کہ تقسیمِ عمل اور اجرت پر تسلط حاصل
کر لیا جائے، اگرچہ اس میں قواعدِ اقتصاد اور ثروتِ عامہ کے اصولِ تدبیر کے خلاف کرنا پڑے،

اسی اثر کا نتیجہ ہے کہ آج جماعتیں نیابی مجالس میں ایسے ممبر منتخب کرکے بھیجتی ہیں، جو
شخصی رائے اور استقلالِ ذاتی سے مجرد ہوتے ہیں، اور اُن کی رائے منتخب کرنے والی جماعتوں
کی رائے کے سوا کچھ نہیں ہوتی،

جماعت کے غلبہ ہوجانے کے باعث اس کے مطالبات اب زیادہ واضح ہوتے جاتے
ہیں اور اس کا مقصد بجز اس کے کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ ہیئتِ اجتماعی کے موجودہ نظام میں
سرے سے انقلاب پیدا کر دیا جائے، تاکہ مساوات کی وہ پہلی حالت عود کر آئے، جو آفتابِ تمدن
کے طلوع ہونے کے پیشتر مختلف قبائل میں پائی جاتی تھی، جماعتوں کا ایک مطالبہ یہ بھی ہے
کہ اوقاتِ عمل کی تعیین کر دی جائے، اور ریلوے، کارخانے اور کانیں کسی کی ملکیت نہ رہیں،
نیز یہ کہ تمام لوگ منافع سے برابر متمتع ہوں اور ادنیٰ طبقات کو اعلیٰ طبقات کے مساوی
کر دیا جائے،

یہ بڑی مشکل ہے کہ جماعتیں غور و فکر سے زیادہ عمل پر قدرت رکھتی ہیں، اور اپنے موجودہ
نظام کی بدولت انہیں بڑی قوت حاصل ہوگئی ہے، پس عنقریب وہ معتقدات و مذاہب

جو ابھی دور طفولیت میں ہیں، ان مذاہب و معتقدات کی طرح افکار پر غلبہ حاصل کرلیں گے، جو پہلے کسی زمانہ میں ذہنوں میں راسخ تھے، یعنی اُن کی طاقت اس قدر بڑھ جائے گی، کہ ان کے سامنے تمام دوسرے اثرات ہیچ ہوجائیں گے، اور اس وقت جماعت کے مقدس حقوق بادشاہوں کے مقدس حقوق کی جگہ لے کر قابلِ تقدیس اور مافوق البحث بن جائیں گے،

جماعت کے اثر اور غلبہ کی یہ حالت دیکھ کر اُن اہلِ قلم اصحاب کے دلوں پر خوف طاری ہوگیا ہے، جو اقوام کے طبقۂ متوسطہ میں ایک خاص منزلت رکھتے ہیں، اور جو اس طبقہ کے افکار و خیالات کے بہت بڑے حامل ہیں، ان لوگوں کو اس جدید تسلط سے جو برابر بڑھتا جا رہا ہے، خوف پیدا ہوا، افکار میں جو اضطراب پیدا ہوگیا ہے، اس کا انھوں نے مقابلہ کرنا چاہا، اور کنیسہ کی جانب یہ لوگ استغاثہ لے کر گئے کہ شاید وہ اپنے روحانی اثر اور اخلاقی غلبہ کے بل پر ان کی کچھ مدد کرے، حالانکہ بیشتر یہ لوگ خود اس کی سخت اہانت کرتے تھے، اور اب بھی لوگ پکار پکار کر کہتے ہیں کہ علم اپنے افلاس کی وجہ سے تہذیبِ نفس کا فرض نہیں انجام دے سکتا، اور اب ہماری قسمت کنیسہ کے ہاتھ میں ہے، یہ لوگ روم سے توبہ کرکے پلٹتے ہیں، اور ہم کو اس بات کی دعوت دیتے ہیں، کہ ہم پھر وحی و الہام کی جانب رجوع کریں، حالانکہ وہ اس بات کو بھولے بیٹھے ہیں کہ اب وقت گذر چکا، بے شبہ ہم مانتے ہیں کہ خدا کا دریائے فیض پھر جوش میں آیا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کو توبہ و استغفار کی توفیق ہوئی ہے، تاہم جماعت پر اب اس کے فیض کا نہ کچھ اثر ہوسکتا ہے، اور نہ وہ ان واقعات کی پروا کرتی ہے، جو ان زہاد کے قلوب میں اضطراب اور گھبراہٹ پیدا کر رہے ہیں، پس اب وہ کبھی ان معبودوں کی جانب مائل نہ ہوگی، جن سے خود یہ لوگ پہلے نفرت پیدا کرا چکے ہیں، اور جن کے اثر کے برباد کرنے میں ان لوگوں کو ایک خاص مداخلت تھی،

نہر کے بند کو جب کہ وہ ٹوٹ چکا ہو، باندھ دینا، انسان اور خدا دونوں کی طاقت سے باہر ہے،

لوگ کہتے ہیں کہ علم اپنی غربت اور افلاس کی وجہ سے تہذیب نفوس کا فرض نہیں انجام دے سکتا، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ علم غریب اور مفلس نہیں ہوا ہے، اور وہ اس اضطراب کے پیدا کرنے میں جو افکار کے اندر پیدا ہو گیا ہے، اور جماعت کے تسلط کو ترقی دینے میں جو اضطراب کی بدولت بڑھ رہا ہے، بالکل بے گناہ ہے، علم نے ہم سے صرف اس بات کا وعدہ کیا تھا کہ وہ اسرار عالم کو کھول دیگا، یا کم از کم اشیار کی باہمی نسبتوں کو بتا دیگا، اس نے کبھی اس بات کا وعدہ نہیں کیا تھا، کہ وہ ہمیشہ امن وصلح کی ذمہ داری کرتا ہے، علم جماد محض ہے کہ ہمارے خدمات کا احساس اسے نہیں ہوتا، اور بہرا ہے کہ ہماری چیخ پکار اس تک نہیں پہنچتی یہ صرف ہمارا فرض ہے کہ ہمیشہ اس سے اتحاد اور دوستی قائم رکھیں پس علم کی روشنی کے سامنے جو توہمات مٹ گئے ہیں ان کو کوئی چیز دوبارہ اب ہمارے سامنے نہیں لا سکتی،

تمام اقوام میں ایسی کھلی ہوئی اور ظاہری علامتیں پائی جاتی ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ جماعت کا اثر اور غلبہ آیندہ جلد جلد ترقی کرے گا، اور اب وہ کسی حد پر نہیں ٹھہر سکتا، ہم جماعت کے تابع فرمان ہیں اور ہمیں تمام وہ نتائج برداشت کرنا ہیں جو جماعت کے غلبہ سے پیدا ہوں گے، اس لئے اس بارہ میں کچھ گفتگو کرنا بیکار ہے، ممکن ہے کہ عنانِ حکومت کا جماعت کے ہاتھوں میں آجانا، تمدنِ مغرب کے زوال کا پیش خیمہ ہو اور مغرب میں طوائف الملوکی پیدا ہو جائے، جس کی بابت خیال کیا جاتا ہے کہ اس مرتبہ کا طے کرنا ہر قوم کے لئے ضروری ہے، لیکن جو ہونے والا ہے ہو کر رہے گا،

بات یہ ہے کہ ابتک جماعتوں نے جو کام کئے ہیں، ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ایوانِ تمدن کے منہدم کرنے میں ایک خاص مداخلت ہوتی ہے، تاریخ سے پتہ چلتا ہے، کہ جب کسی قوم کی اخلاقی قوتیں جن پر اس کی ترقی کا مدار ہے، کمزور ہو جاتی ہیں تو نیم شعوری وحشی جماعتوں کے ہاتھوں اس قوم کا خاتمہ ہو جاتا ہے، برخلاف اس کے تمدن کی بنیاد قائم کرنے والے اور اس کو مضبوط کرنے والے وہ چند مخصوص لوگ ہوتے ہیں، جو عالی دماغی اور دور بینی میں خاص امتیاز رکھتے ہیں، لیکن جماعت کا کوئی اس قسم کا فعل اب تک دیکھنے میں نہیں آیا، وہ صرف بگاڑنے کی قدرت رکھتی ہے اور وحشیانہ حکومت کرتی ہے، بخلاف اس کے جن افراد کی بدولت قومیں ترقی پاتی ہیں، وہ نہایت عزم و استقلال کے ساتھ عقلی احکام کی پابندی کرتے ہیں، اُن کی نظر ہمیشہ مستقبل پر رہتی ہے علم و تہذیب ان کے زیور ہوتے ہیں، اور عقل اُن کی رہنمائی کرتی ہے، حالانکہ جماعتوں نے اس بات کا یقین دلادیا ہے، کہ وہ اپنے اصلی رنگ میں رہ کر ان وسائل پر عمل کرنے سے بالکل قاصر ہیں، جماعتوں میں تباہ کرنے کی جو قوت ہوتی ہے، اُس کی حالت ان بیماریوں کی سی ہے، جو بہت جلد کمزور جسموں کو فنا کر دیتی ہیں، اسی لئے جب کسی تمدن کی ہڈیاں کھوکھلی ہو جاتی ہیں، تو جماعتیں اس پر غلبہ پاکر تمدن کی بنیاد کو جڑ سے گرا دیتی ہیں، یہ جماعتوں کا اصلی فعل ہوتا ہے، لیکن بادی النظر میں یہ دکھائی دیتا ہے، کہ مختلف واقعات کے جمع ہونے سے زمین کا تختہ اُلٹ گیا،

ہم کو اپنے تمدن کے متعلق بھی یہی خوف لگا ہوا ہے، کہ کہیں اس کا بھی یہی حشر نہ ہو، اگرچہ ابھی تک ہمیں اس کا کچھ علم نہیں، بہر حال یورپ کا کچھ ہی انجام ہو، اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں، کہ جس طرح بن پڑے ہم جماعت کی فرماں برداری کریں، کیونکہ

بے عقلی کے ہاتھوں تدریجاً جماعت اس قدر خود سر ہو گئی ہے، کہ اب اُس کو روکنے والی کوئی قوت باقی نہیں رہی،

جماعتوں کا بیان بڑھتے بڑھتے طویل ہو گیا، حالانکہ ہمیں ان کی بابت بہت کم علم ہے، بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے علم النفس کی جانب توجہ کی، اُنھوں نے جماعتوں سے کنارہ کشی اختیار کی، اور اسی لئے ہمیشہ ان کے حالات سے وہ ناواقف رہے، البتہ تھوڑے دنوں سے ان کو کچھ اس جانب توجہ ہوئی ہے، مگر اب بھی اُن کی نگاہ جس حیثیت سے جماعتوں پر پڑتی ہے، وہ یہ ہے کہ جماعتیں ناروا افعال اور جرائم کا ارتکاب کرتی ہیں، بلا شبہہ یہ صحیح ہے کہ دنیا میں جرائم پیشہ جماعتیں پائی جاتی ہیں، لیکن ان کے ساتھ دنیا میں نیک اور بہادر جماعتیں بھی ہیں، پس جماعتوں کو صرف ارتکاب جرائم کی نگاہ سے دیکھنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم کسی شے پر صرف ایک حیثیت سے نظر ڈالیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ جس طرح کسی شخص کے صرف ظاہری عیوب کے دیکھ لینے سے اُس کے پورے اوصاف اور پورے حالات کا علم نہیں ہو سکتا، اسی طرح صرف اس بات کی واقفیت سے کہ جماعت کبھی ارتکاب جرائم کرتی ہے، جماعت کے پورے حالات کا علم نہیں ہو سکتا،

حالانکہ وہ لوگ جنھوں نے دنیا پر حکومت کی ہے، اور جن کے ہاتھوں میں اقوام و ممالک کی عنانِ حکومت رہی ہے، بانیانِ مذاہب سے لے کر بانیانِ حکومت تک اور پیغمبرانِ دین سے لیکر مدبرینِ سیاست تک، حتیٰ کہ وہ لوگ جو چھوٹے چھوٹے قبائل کے سردار رہے ہیں، یہ سب ہمیشہ علم النفس کے ماہر ہوئے ہیں، یہ لوگ جماعت کی روح سے فطرۃً واقف ہوتے تھے، اور اکثر اوقات یہ علم ان کا صحیح نکلتا تھا، یہی وجہ تھی کہ ان لوگوں نے بڑی بڑی حکومتوں کی بنیاد ڈالی، نپولین کو دیکھو کہ وہ ان قوموں کے

نفسانی حالات سے وسیع واقفیت رکھتا تھا، جو اس کے زیر اثر تھیں، لیکن شاید اس کو دیگر اجنبی قوموں کے حالات سے بالکل واقفیت نہ تھی، اور یہی حالت اس کے بڑے بڑے مشیروں کی تھی، وہ بھی اجنبی قوموں کے حالات سے ناواقف تھے، اس کے مشیر ٹیلرانڈ نے ایک بار اس کو لکھا کہ اسپین کے باشندے غنیم سے شریفوں اور بہادروں کی طرح لڑتے ہیں لیکن جب نپولین نے اسپین پر حملہ کیا، تو اس کو ایسے لوگوں سے سابقہ پڑا جو بالکل مطلق العنان وحشی تھے، اگر اس کو وہاں کے باشندوں کے جذبات سے کچھ بھی واقفیت ہوتی تو بہت جلد اس کو اصل حالت کا پتہ لگ جاتا، یہی وجہ تھی کہ نپولین نے جب اسپین اور روس کے ممالک پر حملے کئے، تو وہ ناکام رہا، اور اس کو بہت جلد ہزیمت ہوگئی،

اس زمانہ میں جماعتوں کے نفسانی حالات سے واقف ہونا، اس قدر ضروری ہوگیا ہے، کہ ہر بڑے سے بڑا سیاست داں اس جانب خاص توجہ کرتا ہے نہ اس لئے کہ وہ جماعت پر اپنی حکومت اور سیادت قائم کرے، (کیونکہ یہ بہت مشکل ہے) بلکہ اس لئے کہ اس ذریعہ سے وہ جماعت کے زور کو گھٹا سکے،

پس اگر ہم یہ دریافت کرنا چاہیں، کہ جماعت پر نظام حکومت اور رسوم کا اثر کیوں کم پڑتا ہے، تو ہمیں سب سے پہلے جماعت کے نفسانی حالات اور اس کی روح سے واقفیت پیدا کرنا چاہئے، اس سے ہمیں یہ بات بھی معلوم ہوسکے گی کہ جماعت کو کسی رائے کے پیدا کرنے کی قدرت بالکل نہیں ہوتی، یہ باتیں اس کے مقررہ دائرہ سے بالکل خارج ہیں، نیز یہ کہ جماعت پر عقلی اصول اور قوانین کے ذریعہ سے حکومت نہیں کی جاسکتی، بلکہ اس پر حکومت صرف اُن ذرائع سے کی جاسکتی ہے، جو اس پر اثر قائم کرسکیں، اگر کوئی کلکٹر یہ چاہے کہ لوگوں پر ایک جدید ٹیکس مقرر کرے تو اس کو یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ یہ ٹیکس

بلحاظ اصولِ اقتصاد کے انصاف پر مبنی ہے یا نہیں، کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو بات انصاف سے زیادہ دور ہوتی ہے، اسی کو لوگ زیادہ پسند کرتے ہیں، اور اب اگر یہ نیا ٹیکس بظاہر شدید زیر باری کا باعث نہ معلوم ہوگا، تو یقیناً لوگ اسے پسند کریں گے، یہی وجہ ہے کہ مقررہ ٹیکس کے ادا کرنے میں عوام کو کچھ دقت واقع نہیں ہوتی، خواہ اس کی مقدار بہت زیادہ ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ وہ اسے قسط بقسط اپنی حاجتوں کو پورا کرتے وقت ادا کرتے رہتے ہیں، اور چونکہ وہ اس بھاری ٹیکس سے مانوس ہوتے ہیں، اس لئے وہ ان کو کچھ نہیں کھلتا، لیکن اگر اس ٹیکس کے بجائے انکم ٹیکس یا اور کوئی ٹیکس لگایا جائے، جو انھیں یکبارگی ادا کرنا پڑے، تو اگرچہ اس کی مقدار مقررہ ٹیکس سے دس گنی کیوں نہ کم ہو، تاہم وہ اپنی شکایتوں سے آسمان سر پر اٹھالیں گے، کیونکہ اب بجائے معمولی رقم کے جسے وہ قسط بقسط ادا کرتے تھے، دفعتہً ایک ایسی مقدار کا بوجھ ان کے سر ڈال دیا گیا، جو انھیں یک بارگی ادا کرنا پڑے گی، اور یہی بات جماعت کی ضجریتِ طبع اور بے چینی کا باعث ہوتی ہے۔ ہاں البتہ اگر وہ بجائے شور وغل کے کفایت شعاری سے کام لیں تو کبھی ان کو یہ خفیف سا ٹیکس بھاری نہ معلوم ہو، لیکن یہ ایک ایسا اصول ہے، جو غور و فکر کا محتاج ہے، اور یہی بات جماعت کی قدرت سے باہر ہے[1]،

مذکورۂ بالا بیان میں ہم نے ٹیکس کے تعین کی مثال جو دی ہے، وہ ایک آسان

---

[1] اس کی مثال ہندوستان میں ہاؤس ٹیکس کا واقعہ ہے، جس کے خلاف احتجاج بلند کرنے کے لئے مراد آباد میں ہندو مسلمانوں کا ایک عظیم الشان اجتماع ہوا، اور بہت کچھ شور وغل مچایا گیا، آخر کار گورنمنٹ نے مجبور ہو کر اس تجویز کو ملتوی کر دیا،

(مترجم)

مثال ہے، جس کی صحت سے ہر شخص آسانی کے ساتھ واقف ہو سکتا ہے، اور نپولین جیسے لوگ تو شاید ان امور سے ناواقف نہ ہوں گے، لیکن وہ مصنفین جو اجتماعی زندگی کے حالات سے ناواقف ہیں، ان کو ان باتوں کا علم نہیں، کیونکہ ان کو یہ بات تجربہ سے نہیں معلوم ہوئی، کہ لوگ ہمیشہ عقلی اصول اور قواعد کی پابندی نہیں کرتے ہیں،

اس مثال کے علاوہ ہم بہت سی مثالیں پیش کر سکتے ہیں، جو علم روح الاجتماع کے اصول کے مطابق ہیں، اس علم سے ایسے بے شمار اخلاقی اور اجتماعی واقعات کی پوری توجیہ ہو جاتی ہے، جن کی حقیقت سے واقف ہونے کا کوئی اور ذریعہ نہیں اور ہم عنقریب اپنی جگہ پر اس بات کی وجہ بیان کریں گے کہ زمانۂ حال کے بعض مورخین خصوصاً موسیو ٹائن انقلاب فرانس کے بعض واقعات کی توجیہ کرنے میں کیوں ناکامیاب رہے، اس کا سبب بجز اس کے کچھ نہیں معلوم ہوتا، کہ موسیو ٹائن نے جماعتوں کے نفسانی حالات سے واقفیت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ ان مشکل مباحث میں بھی اس نے مادیین کا وہی طرز اختیار کیا، جو عموماً وہ واقعات کی توجیہ کرتے وقت اختیار کرتے ہیں مادیین بہت کم اخلاقی قوی سے بحث کرتے ہیں، حالانکہ انہی قوتوں کی بنیاد پر تاریخ کی عمارت تعمیر ہوتی ہے،

جماعت کے نفسانی حالات کا معلوم کرنا بے حد ضروری ہے، خواہ ہم اس کا علمی حصہ معلوم کریں، یا صرف واقعات کی حقیقت دریافت کر لیں، بہر حال جس طرح علم زراعت کی واقفیت کسی قدر فائدہ مند ہوتی ہے، اسی طرح جو افعال انسان سے صادر ہوتے ہیں ان کے اسباب کا دریافت کرنا بھی فائدہ سے خالی نہیں،

جماعت کے نفسانی حالات کے متعلق ہماری بحث بہت مختصر اور بطور گذشتہ نسبت تصا

کے خلاصہ کے ہوگی، اور ناظرین صرف ان ہی مسائل سے واقف ہو سکیں گے جو اس فن کے ابتدائی مسائل ہیں، کیونکہ میری حالت تو یہ ہے کہ میں نے ایک ایسی زمین پر قدم رکھا ہے جو ایک مدت سے بنجر چھوڑ دی گئی تھی، اس لئے میں تو تمام اصول و فروع کا استقصار کرنے سے قاصر ہوں، البتہ دوسرے لوگوں کو چاہئے، کہ ان مسائل میں خوب غور و خوض کر کے اصول و فروع کو ترتیب دیں،

باب اوّل

نفسِ اجتماعی کی تشریح و تمثیل

فصل اوّل

جماعت کے ممیزاتِ عمومی، قانونِ وحدتِ فکری

"علمائے نفسیات کی اصطلاح میں جماعت کی کیا تعریف ہے، کثیر التعداد افراد کا اجتماع تشکیلِ جماعت کے لئے کافی نہیں ہے، جن افراد سے جماعت کی تشکیل ہوتی ہے، ان کے افکار و مشاعر میں اتحاد پیدا ہو جاتا ہے اور اُن کی شخصیتیں معدوم ہو جاتی ہیں، جماعت ہمیشہ ایک کیفیتِ نیم شوری سے مغلوب رہتی ہے، حالتِ اجتماع میں کیفیتِ شعوری معدوم ہو جاتی ہے اور کیفیتِ نیم شعوری کا غلبہ ہوتا ہے۔ قوتِ عقلیہ انحطاط پذیر ہو جاتی ہے اور احساسات میں تغیرِ عظیم ہو جاتا ہے اجدید احساسات کے حسن و قبح کا اندازہ ان افراد کی حالتوں کے اعتبار سے ہونا چاہئے، جن سے جماعت کی تشکیل ہوئی ہے جماعت بآسانی شجاعت یا افعالِ ذمیمہ کی جانب مائل کی جا سکتی ہے۔"

متعارف معنی کے لحاظ سے جماعت کا اطلاق ہر اُس مجمع پر ہوتا ہے جو چند افراد

پر مشتمل ہو، گو ان افراد کی حیثیتیں مختلف، ور اُن کے اجتماع کے اغراض جدا جدا ہوں لیکن علم نفسیات کے نقطۂ نظر سے اس لفظ کا اطلاق ایک بالکل مختلف معنی پر ہوتا ہے، مجامع کی بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ مجمع کی تشکیل جن افراد سے ہوتی ہے، ان کی ذاتی حیثیتیں اور انفرادی مشاعر و احساسات ایک غرض اصلی اور مقصد وحید کے اندر بالکل فنا ہو جاتے ہیں، اور پورے مجمع پر ایک خاص حالت اور کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اس وقت اس مجمع کی حالت دیگر مجامع سے مختلف ہوتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس مجمع کے افراد میں وقتی طور پر ایک عام روح پیدا ہو جاتی ہے، اس حالت پر پہنچ کر افراد کا یہ مجموعہ ایک خاص اجتماعی صورت اختیار کر لیتا ہے، جس کے لئے مجھے زبان میں "مجامعِ نفسیہ" یا "مجامعِ منظمہ" سے زیادہ موزوں نام نہیں ملتا، اب یہ جماعت چونکہ ایک ذات بنجاتی ہے اسلئے "ناموسِ وحدتِ فکری" کی مطیع ہو جاتی ہے،

غرض تقریر بالا سے واضح ہو گیا کہ علمائے نفسیات کی اصطلاح میں جماعت کا اطلاق ہمیشہ اُن مجامع پر ہوتا ہے، جن میں "ناموسِ وحدتِ فکری" مع اپنے دیگر فروع و لوازم کے موثر اور عاملِ وحید ہو، اور اگر کسی وسیع سرزمین پر ہزار آدمی بلا کسی خاص مقصد کے عارضی طور پر جمع ہو جائیں، تو وہ علم النفس کی اصطلاح میں جماعت نہ شمار کئے جائیں گے، بلکہ علمی اصطلاح کی بنا پر جماعت کی تشکیل کے لئے خاص مؤثرات کی ضرورت ہوتی ہے جن کی تشریح، میں آگے چل کر کروں گا،

پس ذی شعور ذات کا معدوم ہو جانا، اور احساسات کا جماعت کے مقصد وحید کے اندر فنا ہو جانا، علم النفس کے نقطۂ نظر سے جماعت کے یہ دو اصلی وصف ہیں، لیکن ان اوصاف کے نمودار ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں، کہ بہت سے لوگ ایک جگہ اکٹھا ہوں، بلکہ کبھی

ایسا ہوتا ہے کہ جماعت نفسیہ کے یہ اوصاف ہزاروں آدمیوں میں پائے جاتے ہیں، جو ادھر اودھر منتشر ہوتے ہیں، اور ساری قوم میں کوئی زبردست واقعہ ایسا پیش آتا ہے جو ان کے دلوں پر کوئی سخت اثر پیدا کر دیتا ہے پس اگر وہ اتفاقیہ طور سے جمع ہو گئے، اور ان کے قلوب اس اثر سے متاثر ہیں، تو اسی وقت وہ جماعت کا جامہ پہن لیں گے، پھر کبھی ایسا ہوتا ہے، کہ جماعت صرف دس آدمیوں سے مرکب ہوتی ہے، اور کبھی سو آدمیوں پر بھی جو اتفاقاً کہیں جمع ہو گئے ہوں، جماعت کا اطلاق نہیں ہوتا، کبھی پوری قوم جماعت ہوتی ہے، جب کہ قوم کے تمام افراد کسی ایک اثر سے متاثر ہو رہے ہوں، گو ان کا ظاہری اجتماع نہ ہو،

پھر جب کسی جماعت کی تشکیل ہو جاتی ہے۔ تو اس میں دو قسم کے مخصوص اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں،

۱۔ ایک وہ جو عموماً تمام جماعتوں میں وقتی طور پر پائے جاتے ہیں، یہ اوصاف اس قدر صاف اور کھلے ہوئے ہوتے ہیں، کہ ان کا شمار ہر شخص آسانی سے کر سکتا ہے، اور

۲۔ دوسرے وہ اوصاف جو ان افراد کے لحاظ سے جن پر جماعت مشتمل ہے ہر جماعت میں مختلف ہوتے ہیں، اور یہ اوصاف بعض اوقات جماعت کی قوت مدرکہ پر بھی اثر کرتے ہیں، اس بنا پر یہ ممکن ہے، کہ ہم مختلف انواع پر جماعت کی تقسیم کریں، اور ہم آگے چل کر جب اس تقسیم کو بیان کریں گے، تو اس موقع پر یہ بھی بیان کر دیں گے کہ وہ جماعتیں جو مختلف عناصر سے مرکب ہوتی ہیں، اور وہ جن کی تشکیل متشابہ عناصر سے ہوتی ہے (مثلاً خاندان، گروہ، ذاتیں) ان دونوں میں چند عام اور جامع اوصاف پائے جاتے

ہیں، جو انہی کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں، اور بعض اوصاف وہ ہوتے ہیں جن سے باہم انکو امتیاز حاصل ہوتا ہے،

لیکن قبل اس کے کہ ہم جماعت کے اقسام سے بحث کریں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جماعت کے ان اوصاف کی تشریح کردیں، جو ہر جماعت میں مشترک طور پر پائے جاتے ہیں، اس میں یہ فائدہ ہے کہ جس طرح علماے طبیعیات پہلے ان خواص اور اوصاف سے بحث کرتے ہیں، جو ایک جاندار کے تمام افراد میں پائے جاتے ہیں، پھر اس کے بعد وہ ان اوصاف کا ذکر کرتے ہیں، جو اس جاندار کے انواع و اصناف میں امتیاز پیدا کرتے ہیں، اسی طرح ان علماء کی اتباع میں نفسیات میں بھی پہلے ان اوصاف کی تشریح ہوجائیگی جو ہر جماعت میں بالاشتراک پائے جاتے ہیں، پھر ان اوصاف کی وضاحت کردی جائے گی، جو ہر قسم کے ساتھ خصوصیت رکھتے ہیں، اس طرح علم نفسیات جماعت علم طبیعیات کے پہلو بہ پہلو رہے گا،

لیکن جب ہم جماعتوں کے اوصاف کی باریک اور دقیق تشریح کرنا چاہتے ہیں، تو چند مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، بڑی مشکل تو یہ ہے، کہ جماعت جن افراد پر مشتمل ہوتی ہے، انہی کے اوصاف عمومی اور کیریکٹر کو متعین کرنا بڑا دقت طلب کام ہے، حالت یہ ہے کہ خود افراد کی زندگی کچھ اس طرح بے ثبات واقع ہوئی ہو کہ افسانوں اور قصوں کے اندر تو خیر ان کے کیریکٹر میں ہمیں کوئی تغیر نہیں نظر آتا، لیکن چونکہ انسان کے قوائے مدرکہ میں یہ استعداد موجود ہے کہ ماحول اور گردوپیش میں تغیر واقع ہونے پر اس کے کیرکٹر میں تغیر ہوجائے، اس لئے اس کی زندگی بے ثبات اور ناپائدار حوادث اور کیریکٹر کا مجموعہ ہوتی ہے، اور ماحول میں کسی نئے تغیر کے وقوع پذیر ہونے پر اس کے

کیریکٹر میں ایک انقلاب ہو جاتا ہے، انقلابِ فرانس کے موقع پر ہم نے بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے، جو حالتِ امن میں نہایت صلح پسند تھے، لیکن وہ اس موقع پر خونخوار درندوں کے مانند ہو گئے، پس جب افراد کے کیریکٹر کی ناپائداری کا یہ حال ہے تو جماعت کے کیریکٹر کو متعین کرنا تو بہت مشکل ہے، بالخصوص جب کہ جماعت کے نظام میں ان قبائل اور خاندانوں کے اختلاف کی بنا پر جن سے جماعت کی تشکیل ہوئی ہے، اختلاف ہوتا ہے، نیز یہ قبائل جن مؤثرات سے اثر پذیر ہوتے ہیں، وہ بھی مختلف قسم کے ہوتے ہیں،

پس چونکہ یہ ناممکن ہے کہ ہم جماعت کے اوصاف یعنی کیریکٹر کی ایسی تشریح کریں جو ہر قسم کی جماعت پر صادق آسکے، اس لئے ہم ان جماعتوں کو لے کر جن کا نظام مکمل ہو چکا ہے، جماعتوں کے اوصافِ عمومی سے بحث کریں گے، اور گو اس صورت میں صرف انہی اوصاف کا حال معلوم ہو سکے گا، جو جماعتوں میں کبھی کبھی پائے جاتے ہیں، اور ان اوصاف کا حال معلوم نہ ہو گا جو غیر تغیر پذیر ہیں، لیکن اگر یہ پیشِ نظر کر لیا جائے کہ وہ جماعت جس کا نظام مکمل ہو چکا ہے اس میں ان اوصافِ عمومی کے ساتھ ساتھ جو تمام جماعتوں میں پائے جاتے ہیں، بعض خاص اور نئے اوصاف بھی ہوتے ہیں، جو دیگر جماعتوں میں نہیں ہوتے اور یہی جماعت "ناموسِ وحدتِ فکری" کے تابع ہوتی ہے، غرضکہ مکمل صورت میں جماعت کا اطلاق اسی جماعت پر ہو سکتا ہے، تو اس وقت یہ بالکل صاف ہو جائیگا، کہ ہم نے اس قسم کی مکمل جماعت کو دیگر جماعتوں کے اوصافِ عمومی کی تشریح کرنے کے لئے نظیر کیوں قرار دیا ہے،

پھر جماعت کے اوصافِ عمومی میں بعض وہ اوصاف ہیں جو جماعت کے ساتھ ساتھ

افرادِ منتشرہ میں بھی پائے جاتے ہیں، اور بعض ایسے ہیں جو جماعت کے ساتھ خاص ہوتے ہیں، اور افراد میں نہیں پائے جاتے، لیکن چونکہ جماعت کے ان اوصاف کو جو اسی کیساتھ خاص ہوتے ہیں، اہمیت حاصل ہے، اسلئے ہم پہلے انہی اوصاف کو بیان کریں گے،

جماعتوں کو جن باتوں میں امتیاز ہوتا ہے، اُن میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ جماعت میں ایک عام روح ایسی پائی جاتی ہے، جس کی بدولت اس کے ہر ہر فرد سے جو اعمال سرزد ہوتے ہیں، یا ہر ہر فرد اس حالت میں جو کچھ سمجھتا بوجھتا ہے، وہ اس کے خلاف ہوتا ہے جو حالتِ انفراد میں وہ سمجھتا بوجھا کرتا تھا، غرض افراد کے بعض مشاعر اور خیالات ایسے ہوتے ہیں، جو صرف اُس وقت قوت سے فعل میں آتے ہیں، جب وہ جماعت کے اندر شامل ہو کر جماعت میں اپنے تئیں فنا کر دیتے ہیں، اور یہ مشاعر وخیالات ان مشاعر و خیالات سے بالکل الگ ہوتے ہیں، جن کا ظہور حالتِ انفرادی میں ہوتا ہے بس مختصر طور پر جماعت اُس ذات کا نام ہے جو مختلف عناصر و افراد سے اس طرح مرکب ہوتی ہو کہ اس کا کوئی جز اپنی حالت پر برقرار رہا ہو، بالفاظ دیگر جماعت اس نفس ذاتی کا نام ہے، جس کا نظام طبعی مختل ہو گیا ہو، لیکن اگر جماعت کی اس حالت کو کسی تشبیہ سے سمجھنا چاہو، تو اپنے جسم کے ان خلایا اور جراثیم کی حالت پر غور کرو، جن کی باہمی ترکیب سے تمہارا جسم پیدا ہو گیا ہے، دیکھو اُن جراثیم اور خلایا میں سے ہر ہر خلیہ اپنی انفرادی حالت میں کس طرح ایک دوسرے سے مختلف تھا، لیکن باوجود اس کے جب یہ باہم مخلوط ہو گئے، تو اُن کی باہمی ترکیب سے تمہارا جسم مستقل طور پر پیدا ہو گیا، جس کے ذاتی اوصاف ان خلایا کے اوصاف سے بالکل مختلف ہیں، پس ہربرٹ اسپنسر جیسے نکتہ رس عالم کی رائے کے خلاف، ہماری رائے یہ ہے کہ وہ عناصر و افراد جن سے جماعت کی تشکیل

ہوتی ہے، ان میں کوئی قدر مشترک وصف ایسا نہیں ہوتا، جو سب پر غالب آجاتا ہو، بلکہ جماعت میں جو کچھ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک مخلوط کیفیت اور جدید اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں، یعنی ہمارے نزدیک جماعت کی حالت جواہر کیمیاویہ کی ایسی ہے، کہ جب دو جوہروں کو باہم مخلوط کردو، تو ان کے اجتماع سے ایک نیا جسم پیدا ہو جائیگا، جس کے خواص ان خواص سے بالکل مختلف ہوں گے، جو ہر ہر جوہر کے تھے، پس جماعت میں بھی افراد کے مخلوط ہونے کی وجہ سے اسی قسم کے نئے اوصاف اور خواص پیدا ہو جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ کسی فرد کی اجتماعی اور انفرادی حیات کا فرق آسانی سے نظر آجاتا ہے، البتہ اس بات کا سبب ذرا مشکل سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ فرق کیوں پیدا ہو گیا،

لیکن اگر قاعدۂ ذیل کسی شخص کے پیشِ نظر رہے تو اس فرق کا سبب بھی دریافت کرنا مشکل نہیں، وہ قاعدہ جس کو زمانۂ حال کے علمائے نفسیات نے مشاہدہ سے ثابت کیا ہے، وہ یہ ہے کہ جس طرح جسمانی حیات کیفیاتِ نیم شعوری کے ایک بڑے حصہ پر مشتمل ہوتی ہے اسیطرح انسان کی حیاتِ نفسی کا بھی بڑا حصہ کیفیاتِ نیم شعوری کے ماتحت ہوتا ہے اور انسان کی حیاتِ نفسی کیفیاتِ نیم شعوری کے مقابل میں کیفیاتِ شاعرہ پر بہت کم مشتمل ہوتی ہے بلکہ ہمارے وہ اعمال و افعال جن کے متعلق ہم یقین کرتے ہیں کہ ہمارے ارادہ سے صادر ہوئے ہیں وہ بھی درحقیقت ان کیفیاتِ نیم شعوری کے معلول ہوتے ہیں، جو ہم میں تاثیرِ وراثت سے پیدا ہوتی ہیں، اور کیفیاتِ نیم شعوری کا یہ مجموعہ ہمارے آبائی روایات اور تقلیدات پر مشتمل ہوتا ہے، جن سے روح جماعت کی ترکیب ہوتی ہے، پس ہمارے ارادی افعال کے پیچھے ایسے اسباب ہوتے ہیں، جن میں ہمارے ارادہ کو بالکل دخل نہیں ہوتا، اور ان کی آڑ میں بہت سے ایسے اسباب ہوتے ہیں جو ہماری نظر سے پوشیدہ رہتے ہیں، غرض ہمارے وہ افعال و اعمال جو ہم سے روزمرہ

بالقصد و بالارادہ صادر ہوتے ہیں وہ بھی ایسے مخفی اسباب کے معلول ہوتے ہیں جو بالکل ہماری نظر و فہم سے دور رہتے ہیں،

پس ایک قبیلہ اور ایک قوم کے تمام افراد اُن کیفیاتِ نیم شعوری میں برابر کے حصہ دار ہوتے ہیں جن سے اس قوم یا قبیلہ کی روح کی تکوین ہوتی ہے، لیکن ان افراد کو باہم امتیاز جو ہوتا ہے، وہ ان کیفیاتِ شعوری کی بنا پر ہوتا ہے، جو کسی مخصوص تربیت و تعلیم یا استثنائی وراثت کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہوں، یہی وجہ ہے کہ ایک قوم کے وہ افراد جو عقل و فہم اور دماغی خصوصیات میں مختلف درجہ کے ہوتے ہیں، یعنی جن کی حیاتِ شعوری ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتی ہے، ان کے میلانات، جذبات اور منتاعر میں ہمرنگی پائی جاتی ہے یعنی ان کی حیاتِ نیم شعوری میں کسی طرح کا تفاوت نہیں ہوتا ہے، ایک قوم کا وہ طبقہ بھی جو بلحاظ علم و فضل کے ممتاز ہوتا ہے، طبقۂ عوام سے اُن امور میں جن کا تعلق شعور سے ہے (مثلاً دین اور سیاست وغیرہ) بالکل مختلف نہیں ہوتا، ایک ریاضی داں اور ایک بوٹ فروش کے مابین گو عقلی حیثیت سے کتنا ہی تفاوت ہو لیکن ان کے طبائع میلانات اور جذبات میں یا تو بالکل تفاوت نہیں ہوتا، یا بہت کم ہوتا ہے،

افراد کی طبیعتوں کا یہ حصہ جو نیم شعوری کیفیت کا محکوم ہوتا ہے، پوری جماعت پر حاوی ہوتا ہے اور اسکے تمام حرکات و سکنات میں پیش پیش رہتا ہے، اسی کی بدولت جماعت میں آکر افراد کی عقلی خصوصیتیں ماند پڑجاتی ہیں، انکی شخصیتیں جماعت کی روح کے آگے فنا ہوجاتی ہیں، جماعت کی عمومی خصوصیتوں کے آگے افرادی کی انفرادی خصوصیتیں شکست کھاجاتی ہیں اور حیاتِ شاعرہ پر حیاتِ نیم شعوری کا غلبہ ہوجاتا ہے،

پس چونکہ جماعت سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں، وہ اس کی حیاتِ نیم شعوری کے معلول ہوتے ہیں، اس لئے یہ راز بھی ہم پر کھل جاتا ہے کہ جماعت سے کسی وقت وہ کام نہیں ہو سکتے

جن کے لئے فکر بلند اور عقلِ راجح کی ضرورت ہوتی ہے، یہانتک کہ وہ جماعت جو عقلمند لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے، اور وہ جس میں غیر تعلیم یافتہ اور احمق لوگ شامل ہوتے ہیں، ان دونوں جماعتوں سے کسی امر کے متعلق جو فیصلے صادر ہوتے ہیں، اُن میں باہم کوئی فرق نظر نہیں آتا، اور اس کی وجہ یہی ہے کہ جماعت میں شامل ہوکر ان عقلمند اور تعلیمیافتہ لوگوں سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں، وہ جماعت کے اوصافِ عامہ اور کیفیتِ نیم شعوری کے معلول ہوتے ہیں، جن میں وہ اور عام لوگ دونوں مساوی اور برابر کے حصہ دار ہیں، اسلئے جماعت پر جس چیز کا غلبہ ہوتا ہے، وہ ذکاوت اور علم نہیں ہے، بلکہ جہالت اور حماقت ہے۔ اور عموماً یہ جو سمجھا جاتا ہے کہ والٹر سے زیادہ ایک مجمع کی رائے صائب ہوگی، غلط ہے، بلکہ تنہا والٹر کی رائے مجمع کی رائے سے صائب ہوتی ہے، مجمع عقلمند نہیں ہوتا، بلکہ والٹر اس مجمع سے زیادہ عقلمند ہے، جس کا وہ ایک فرد ہے،

لیکن اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے، کہ اوپر کی تقریر سے تو یہ معلوم ہوا کہ ہر جماعت کے ہر ہر فرد سے جو اعمال صادر ہوتے ہیں، وہ کیفیتِ نیم شعوری اور جماعت کے اُن اوصاف سے متاثر ہوکر سرزد ہوتے ہیں، جو کل افراد میں مشترک طور پر یکساں پائے جاتے ہیں، اور اس کا صاف نتیجہ صرف یہی ہے کہ جماعت میں کوئی نئے اوصاف نہیں ہوتے، بلکہ ایک مشترک وصف ہوتا ہے، جو تمام افراد میں یکساں طور پر پایا جاتا ہے، جیسا کہ اسپنسر کا مذہب ہے، پھر یہ جدید اوصاف جن کا تذکرہ بار بار اوپر ہوچکا ہے، کہاں سے اور کیونکر پیدا ہوتے ہیں؟ یہی سوال ہے، جس کا جواب ذیل میں نہایت تفصیل کے ساتھ دونگا،

بات یہ ہے کہ یہ جدید اوصاف جو جماعت کی تشکیل کے وقت افراد میں پیدا ہوجاتے ہیں اور جن کا وجود حالتِ انفرادی میں نہیں ہوتا، جماعت میں اُن کے پیدا ہوجانے کے

متعدد اسباب ہوتے ہیں :-

۱۔ سب سے پہلا سبب یہ ہے کہ کوئی فرد جب جماعت میں شامل ہوتا ہے تو اس میں اس قسم کی شجاعت اور دلیری پیدا ہو جاتی ہے کہ جن افعال کے ارتکاب سے وہ حالتِ انفرادی میں ہچکچاتا ہے، اب اُن کے کر بیٹھنے کی نہ صرف وہ جرأت کرنے لگتا ہے، بلکہ چونکہ جماعت میں داخل ہو کر افراد سے اُن کے اعمال و افعال کی مسئولیت بالکل اُٹھ جاتی ہے، اس لئے جماعت کا ہر ہر فرد مسئولیت سے بے خوف ہو کر اپنے افعال کے ارتکاب کی جرأت کر بیٹھتا ہے جن سے مسئولیت کا خوف، حالتِ انفرادی میں اس کو باز رکھتا تھا،

۲۔ دوسرا سبب جس کی بدولت جماعت میں جدید اوصاف پیدا ہوتے ہیں، یہ ہے کہ جس اثر سے کوئی ایک فرد متاثر ہوتا ہے، اس کا تعدیہ تمام افراد میں یکبارگی ہو جاتا ہے اور اس اثر سے تمام افراد یکدم اثر پذیر ہو جاتے ہیں، تعدیۂ اثر ایک ایسی چیز ہے، جس کے علل و اسباب کا بتانا مشکل ہے، ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تعدیۂ اثر مسمریزم کی طرح ایک عجیب موثر شے ہے، کہ ہر فرد اُس سے اثر پذیر ہو کر اپنے ذاتی اور شخصی مصالح کو اجتماعی مصالح پر قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے اور یہ ایسی بات ہے، جو انسانی فطرت کے خلاف ہے اور انفرادی حالت میں کوئی انسان اس جذبہ کا محکوم نہیں ہو سکتا،

۳۔ تیسرا سبب جو سب سے زیادہ اہم ہے اور جس کی بدولت جماعت میں جدید اوصاف پیدا ہوتے ہیں **اثر پذیری** کی استعداد ہے، جو ہر انسان میں پائی جاتی ہے،

اس استعداد اور قابلیت کی حقیقت کو سمجھانے کے لئے ہمیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں وظائفِ اعضاے انسانی کے متعلق بعض اُن اکتشافات کا ذکر کریں جو حال میں تحقیق کئے گئے ہیں، ایک بڑی تحقیق جو حال میں ظاہر ہوئی ہے، یہ ہے کہ

۱ ہر انسان میں یہ استعداد پائی جاتی ہے کہ مختلف ذرائع سے اگر اس کے شعور اور حس پر اثر ڈالا جائے، تو اس کے اعصاب حسی گویا سُن ہو جاتے ہیں، اور وہ ہر اُس بات کی تعمیل کرنے لگتا ہے، جس کا اُسے حکم دیا جائے، یہی استعداد ہے جس کی بنا پر ہر ہر انسان سے بعض اوقات ایسے افعال صادر ہونے لگتے ہیں، جو اس کے معمولی کیریکٹر کے خلاف ہوتے ہیں،

۲۔ لیکن تجربہ سے تحقیق کیا گیا ہے، کہ نیم شعوری اور اثر پذیری کی یہ استعداد جو انسان کی انفرادی زندگی کا ایک خاصہ ہے، اُس وقت زیادہ قوت پکڑتی ہے، جب کوئی فرد جماعت میں شامل ہو جاتا ہے، یہانتک کہ اس وقت اس کی حالت قریب قریب اُس شخص کے مماثل ہوتی ہے جو مسمریزم کے عمل سے معمول کیا گیا ہو، مسمریزم کے عمل کا اثر معمول پر جو کچھ ہوتا ہے وہ یہی ہے، کہ معمول کے دماغی اعصاب سُن ہو جاتے ہیں، اور وہ حیاتِ نیم شعوری کے تابع ہو کر عامل کی تعمیل کرنے لگتا ہے، اُس کی حیات شعوری پر حیات نیم شعوری کا غلبہ ہو جاتا ہے، اور ارادہ مفقود، اور تمیز و حس کی قوت معدوم ہو جاتی ہے، اور اُس کے افکار و مشاعر خاص دائرہ کے اندر محدود ہو جاتے ہیں، جو عامل نے اسکے لئے کھینچ دیا ہو،

قریب قریب یہی حالت افراد کی اُس وقت ہوتی ہے جب وہ جماعت میں شامل ہو جاتے ہیں، اس وقت اُن کو اپنے افعال کا شعور بالکل نہیں باقی رہتا، اور چونکہ وہ اپنے بعض مخصوص اوصاف سے معرا ہو جاتے ہیں، اس لئے اب اُن میں اُن کی جگہ پر بعض دوسرے اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں، جماعت میں افراد کی حالت ایسی ہوتی ہے، کہ گویا ان پر مسمریزم کا عمل کر دیا گیا ہے، اور اب وہ ان احکام کی تعمیل کر رہے ہیں، جو جماعت کی جانب سے اُن کو دئے جائیں، بلکہ اطاعت و انقیاد اور اثر پذیری کا یہ مادہ جو جماعت کے اندر شامل ہو کر افراد میں پیدا ہو جاتا ہے، اُس مادہ سے بہت زیادہ ہوتا ہے جو مسمریزم کے

معمول میں ہوتا ہے، جماعت کا ہر فرد جماعت کے طلسم سے مسحور ہو کر اپنے دوسرے ساتھی پر وہی اثر کرتا ہے، جو خود اس پر ہوا ہے، یہانتک کہ اس باہمی تفاعل سے ہر فرد پر ایک بیخودی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اور بڑھتے بڑھتے یہ اثر اس اثر سے بڑھ جاتا ہے، جو مسیمرزم کے معمول پر پڑتا ہے، اور یہ اثر اتنا قوی ہوتا ہے کہ بہت کم لوگ اسکی مقاومت کر سکتے ہیں، البتہ اگر اس کی مقاومت ہوتی بھی ہے، تو اس وقت جب کہ ایک غرض سے دوسری غرض کی جانب جماعت کو ملتفت کرنا منظور ہو، چنانچہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دفعۃً کوئی مبارک خیال جماعت کے ذہن میں آیا، اور یکایک جماعت افعالِ شنیعہ کے ارتکاب سے باز آگئی،

حاصلِ کلام یہ ہے کہ حیاتِ شاعرہ کی شکست اور حیاتِ نیم شعوری کا غلبہ، اثر پذیری کی بدولت تمام افکار و مشاعر کا ایک مرکز پر اتحاد و اجتماع، اور عمل کی جانب فطری رغبت، یہ اوصاف ہوتے ہیں جو جماعت میں شامل ہو کر ہر ہر فرد میں پیدا ہو جاتے ہیں، اس حالت میں انسان اپنے ارادہ سے کچھ نہیں کرتا، بلکہ اس کی قوتِ ارادی بالکل سلب ہو جاتی ہے،

یہی سبب ہے کہ جماعت میں داخل ہوتے ہی انسان تہذیب و تمدن کے اس درجہ سے گر جاتا ہے جس پر حالتِ انفرادی میں تھا، اگر حالتِ انفرادی میں اس کے اخلاق پاکیزہ اور اس کی عقل پختہ تھی تو اب حالتِ اجتماع میں اگر اس کے برعکس وہ سادہ لوح اور شہوات و جذبات کا فرماں بردار بن جاتا ہے، اب اس میں وحشی انسانوں کی طرح قساوت شجاعت اور دلیری، یہ تمام اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں، اگر پہلے وہ الفاظ کے اثر سے مرعوب نہ ہوتا تھا، تو اب اس میں نہ صرف یہی بات پیدا ہو جائے گی، کہ وہ الفاظ کے اثر سے جلد مرعوب ہونے لگے گا، بلکہ اب وہ مرعوب ہو کر ایسے افعال کا ارتکاب کر بیٹھے گا، جو اس کے ذاتی منافع کے خلاف اور اس کے معمولی کیریکٹر کے عکس ہونگے، غرضکہ جماعت کے اندر

انسان کی حالت ریگ کے ذروں کے مشابہ ہوتی ہے، کہ ریگ کے ذروں کو ہوا جہاں چاہتی ہے، اڑا لے جاتی ہے،

یہی تمام اسباب ہیں، جن کے باعث یجوں اور جیوریوں کی جماعتوں سے ایسے ایسے فیصلے صادر ہوتے ہیں، جو اگر ان میں سے الگ الگ ہر ہر فرد کے سامنے پیش کئے جائیں تو وہ اُس کی مخالفت کرے، اور یہی وجہ ہے کہ نیابی مجالس ایسے ایسے قوانین پاس کرتی ہیں، جن کو حالتِ انفرادی میں مجالسِ نیابی کا کوئی ممبر تسلیم نہیں کرتا،

انقلابِ فرانس کے لیڈروں کو دیکھو کہ ان میں سے ہر ایک حالتِ امن میں اپنی اپنی جگہ پر کیسا روشن خیال، اور سلیم الطبع تھا، لیکن جب سب یکجا ہو کر ایک جماعت بن گئے تو افعالِ شنیعہ کا ارتکاب کرنے لگے، بہت سے ایسے لوگوں کو پھانسی پر چڑھایا جو بالکل بے قصور تھے، یہاں تک کہ آخر میں ان لوگوں نے اپنے ذاتی منافع کا بھی لحاظ نہ کیا، اور اپنی عزت اور نیک نامی کے حق سے بھی تنزل اختیار کیا،

پس حاصل یہ ہے کہ جب افراد جماعت میں شامل ہو جاتے ہیں، تو صرف یہی نہیں ہوتا کہ ان کا ذاتی استقلال فنا ہو جاتا ہو، بلکہ اُن کے افکار و مشاعر میں بھی سرے سے انقلابِ عظیم ہو جاتا ہے، بخیل اسراف پسند، متشکک زود اعتقاد، پرہیزگار بدکار، اور بزدل شیر دل بنجاتے ہیں، ۴ر اگست ۱۷۸۹ء کو جب امرا نے اپنے امتیازات اور حقوق سے تنازل اختیار کیا ہے تو اُس وقت یہی انقلاب تھا، جو اُن کے جذبات میں پیدا ہو گیا تھا، اور جس کے اثر سے وہ مسحور ہو گئے تھے، حالانکہ اگر حالتِ انفرادی میں ان سے اس کی درخواست کی جاتی تو شاید چراغ پا ہو جاتے،

غرض تقریر بالا سے معلوم ہوا کہ افراد کی قوتِ ادراکی گو جماعت کی قوتِ ادراکی سے بڑھی

ہوئی ہوتی ہے، لیکن افکار و مشاعر اور اُن اعمال و افکار کے لحاظ سے جو جماعتوں سے صادر ہوتے ہیں، جماعت کی حالت افراد سے مختلف ہوتی ہے، کبھی جماعتیں افراد سے زیادہ نیک اور کبھی اُن سے زیادہ بد ہوتی ہیں، اور یہ اختلاف یا اُن افراد کے طبائع سے پیدا ہوتا ہی جن ان کی تشکیل ہوئی ہے، اور یا ان مختلف ہیجات اور عوامل سے جو جماعت پر موثر ہوتے ہیں یہی حقیقت ہے جس کو ان مصنفین نے نظر انداز کر دیا ہے جو جماعت پر صرف اس کی مجرمانہ حیثیت سے نظر ڈالتے ہیں، یہ بلاشبہہ صحیح ہے کہ جماعتیں اکثر اوقات جرائم اور افعالِ شنیعہ کا ارتکاب کرتی ہیں لیکن دوسرے وقت اُن سے دلیری اور شجاعت کے اوصاف بھی ظاہر ہوتے ہیں،

جماعت کے قائدین جس جانب جماعت کو مائل کریں گے اُسی جانب جماعت مائل ہوگی۔ اگر تم جماعت کو مجد و فخر، نصرتِ دین اور اعلاے کلمۃ اللہ کی جانب بلاؤ تو وہ اسی طرح تمھاری صدا پر لبیک کہے گی، جس طرح وہ ۱۷۹۳ء میں "حمایتِ وطن" کی صدا پر لبیک کہہ کر برسرِ پیکار ہوگئی تھی، پس جماعت کو کسی خیال پر آمادۂ عمل کر دینا تمھارا فرض ہی اگر تاریخ کے صفحات میں جماعت کے اُن کارناموں کو تلاش کرو جو اُس نے حالتِ سکون و اطمینان میں انجام دئے ہیں، تو تمھیں اس قسم کا واقعہ ایک بھی نہ ملے گا، سکون و اطمینان کو بالاے طاق رکھکر ایک بار نفوسِ جماعت میں اضطراب و ہیجان پیدا کر دو، پھر دیکھو جماعت کیا کیا گل کھلاتی ہے،

فصل دوم

جماعت کے حسیات اخلاق جذبات

۱۔ جماعت کی اثر پذیری تلون مزاجی اور غیظ و غضب

جماعت مہیجات اور عواملِ خارجیہ کے قابو میں ہوتی ہے اور وہی اس کے تغیرات کے باعث ہوتے ہیں، وہ مہیجات جن سے جماعت اثر پذیر ہوتی ہے، اس قدر قوی ہوتے ہیں، کہ اُن کے مقابلہ میں منفعت ذاتی کا جذبہ فنا ہو جاتا ہے، جماعت کا کوئی فعل غور فکر اور ارادہ پر مبنی نہیں ہوتا، جماعت پر قومی عادات کا اثر،

۲۔ جماعت کی اثر پذیری اور زود اعتقادی

چند عواملِ خارجیہ کے اثر کی بنا پر جماعت بعض خیالی باتوں کو حقیقت سمجھنے لگتی ہے تمام افراد جماعت کے ذہنوں میں ایک قسم کی خیالی اشباح کیوں پیدا ہوتی ہیں، اور ان کو عالم، و جاہل سب یکساں طور پر کیوں تسلیم کر لیتے ہیں، ان اشباح کی بعض مثالیں جن سے افراد جماعت اثر پذیر ہوتے ہیں، یہ بحث کہ جماعت جو شہادتیں پیش کرتی ہے وہ قابلِ قبول نہیں ہوتیں، یہ بحث کہ کسی واقعہ کی صحت پر متعدد شہادتوں کا اتفاق

اس واقعہ کی صحت کی دیل نہیں ہو سکتا، کتبِ تاریخی کی قدر وقیمت،

۳- جماعت کی مبالغہ پسندی اور سادہ لوحی

جماعت شک وتردد سے نابلد ہوتی ہے اور ہمیشہ یک طرفہ رائے قائم کرتی ہے، جماعت کے احساسات اور جذبات ہمیشہ نہایت قوی اور حد سے متجاوز ہوتے ہیں،

۴- جماعت کا تعصب اور قدامت پسندی

جماعت کے مذکورۂ بالا اوصاف کے پائے جانے کی وجہ، جماعت ہمیشہ اپنے سے قوی شخص کے آگے سرِ تسلیم خم کرتی ہے، فتنہ پردازی کا میلان جو کبھی کبھی جماعت سے ظاہر ہوتا ہے، وہ اس بات کی دیل نہیں ہے کہ وہ قدامت پسند نہیں ہوتی، جماعت کے احساساتِ ترقی، اور انقلاب کے مانع ہوئے ہیں،

۵- جماعت کے اخلاق وعادات

جماعت کے اخلاق وعادات کبھی افراد کے اخلاق وعادات سے ترقی یافتہ اور کبھی انحطاط پذیر ہوتے ہیں، اس کے مختلف اسباب اور امثلہ، یہ بحث کہ جماعت کسی منفعتِ ذاتی کے خیال پر آمادۂ عمل نہیں ہوتی، حالانکہ افراد کے اعمال کا بیشتر حصہ اسی خیال پر مبنی ہوتا ہے، تہذیبِ اخلاق میں جماعت کی حالت اور درجہ،

فصلِ سابق میں ہم نے بالاجمال نفسِ اجتماعی کے خصوصیات کا ذکر کیا تھا، اب اوراقِ ذیل میں ہم انہی سابق بیانات کو کسی قدر تفصیل اور وضاحت کے ساتھ

بیان کریں گے،

جماعت کی بہت سی خصوصیتیں، مثلاً قابلیتِ غیظ و غضب، ضعفِ عقلی، فقدانِ ملکۂ استقلال، اور غلبۂ جذبات وغیرہ، اکثر ان افراد میں بھی پائی جاتی ہیں جن کا نشوونما مکمل نہیں ہوتا، مثلاً عورت، بچہ، مجنون وغیرہ، لیکن یہ بحث کہ یہ اوصاف جو عورتوں، بچوں اور ناقص الشعور افراد میں پائے جاتے ہیں، جماعت میں اُن کا پایا جانا کن اسباب کی بنا پر ہے، دائرۂ کتاب سے خارج ہے، اس لئے میں اس کو یہاں چھیڑنا نہیں چاہتا، علاوہ بریں ان اسباب کے دریافت کرنے کی ان لوگوں کو تو بالکل حاجت نہیں، جو فطری اور ناقص الشعور افراد کے نفسانی حالات سے بخوبی واقف ہیں، اور جن کو اس قسم کے افراد کی نفسانی حالتوں کا بالکل علم نہیں، وہ اس بحث سے کوئی مفید نتیجہ نہیں اخذ کر سکتے،

پس اب ہم ذیل میں اُن اوصاف کی تشریح کرتے ہیں، جو اغلباً تمام جماعتوں میں پائے جاتے ہیں،

(۱)

جماعت کی تلون مزاجی قابلیتِ غیظ و غضب

ہم نے پہلے جہاں جماعت کے خصوصیاتِ امتیازی کا ذکر کیا تھا، وہاں یہ بھی بیان کیا تھا کہ اس کے اعمال کا بیشتر حصہ کیفیاتِ نیم شعوری کا معلول ہوتا ہے، اور اُس کے اعمال و افعال میں نخاع کی تاثیر دماغ کی تاثیر سے بہت زیادہ ہوتی ہے یعنی حالتِ اجتماع میں افراد پر بجائے کیفیتِ شعوری کے کیفیتِ نیم شعوری کا غلبہ ہوتا ہے، اور یہ خصوصیت ایسی ہے جس میں جماعت کے ساتھ وحشی انسان اور ناقص الشعور افراد بھی شریک ہیں اس بنا پر

وہ افعال، جو جماعت سے صادر ہوتے ہیں بعض اوقات گو تنقیدی حیثیت سے کامل ہوتے ہوں مگر چونکہ عقل کو اس کی رہنمائی میں بالکل دخل نہیں ہوتا اس لئے افراد جماعت کے دائرہ میں آکر اُن مؤثرات کی اطاعت کرنے لگتے ہیں، جو اُن کو عمل کی جانب مائل کر رہے ہیں پس جماعت ہمیشہ اُن مہیجات و عوامل کی قید میں مقید رہتی ہے اور اُن مؤثرات خارجیہ کے سامنے سرِ نیاز جھکاتی ہے، جو وقتاً فوقتاً اس پر اپنا اثر ڈالتے اور اُس کے تقلبات و تغیرات کے باعث ہوتے ہیں، ہاں اگرچہ افراد کی حیات میں بھی اکثر یہی سانحہ پیش آتا ہے، اور وہ بھی مؤثرات کے حلقہ میں چاروں طرف سے گھر جاتے ہیں، لیکن اُن کی عقل ان کو مضرات سے آگاہ کرتی رہتی ہے اس لئے وہ کبھی مؤثرات کے دام میں نہیں پھنستے، یہی بات ہے جس کی بنا پر علم وظائفِ اعضا کے ماہرین نے کلیہ قائم کیا ہے کہ افراد اپنے اعصاب کو قابو میں رکھ سکتے ہیں اور جماعت نہیں رکھ سکتی،

لیکن وہ مؤثرات اور عواملِ خارجیہ جن سے جماعت اثر پذیر ہوتی ہے، چونکہ ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں، اس لئے جماعت کے اعمال و افعال میں بھی تنوع ہوتا رہتا ہے، مؤثرات کے اسی اختلاف و تنوع کے باعث کبھی جماعت مجسمۂ رحمت بن جاتی ہے، اور کبھی پیکر قہاریت، کبھی بزدلی کا اظہار کرتی ہے، اور کبھی میدانِ عمل میں شجاعت کے ساتھ اقدام کرتی ہے لیکن باوجود اس کے وہ ہمیشہ اس طرح حد سے گذر جاتی ہے کہ کبھی منافعِ ذاتیہ حتی کہ حفظِ ذات کے جذبہ سے بھی متاثر نہیں ہوتی، اور چونکہ جماعت کے مؤثرات مختلف قسم کے ہوتے ہیں، اور وہ ہر ایک سے برابر اثر پذیر ہوتی ہے، اس لئے اس کے اعمال و افکار میں ہمیشہ انقلاب ہوتا رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر تم نے دیکھا ہوگا، کہ جماعت دردناک سے دردناک کام چھوڑ کر یکبارگی شفقت آمیز کام کو انجام دینے لگتی ہے:۔ ایک

وقت جماعت سے قساوتِ قلبی اور بے رحمی کے افعال ظاہر ہوتے ہیں، تو دوسرے وقت وہ نہایت نرم دل اور انصاف پسند بنجاتی ہے، دنیا میں جب کبھی مذاہب کی تائید کے لئے خونریزی ہوئی ہے، تو جماعت ہی نے اس کا بیڑا اٹھایا ہے۔ جماعت کی انتہا قوی طاقت کا اندازہ کرنے کے لئے ہمیں دور جانے کی ضرورت نہیں کچھ زمانہ پیشتر ایک بغاوت کے دوران میں جماعت نے جو جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، اور جن کی بدولت یک بارگی ایک جنرل نے ایک نمایاں شہرت حاصل کی ہے، وہ ابھی کی بات ہے، اگر یہ جنرل اپنی صدا بلند کرتا، تو لکھوکھا آدمی اُس کی مدد کے لئے جان دینے پر آمادہ ہو جاتے[1]، یہی بات ہے کہ جماعت سے کوئی فعل بالقصد وارادہ صادر نہیں ہوتا، اور گو اس کا میلان متناقض مشاعر کی جانب ہر دم ہوتا رہتا ہے لیکن ہمیشہ وہ اسی شعور سے اثر پذیر ہوتی ہے، جس نے وقت فعل کے، اس پر غلبہ پا لیا ہو، اس بارے میں جماعت کی حالت درختوں کے پتوں سے کس قدر ملتی جلتی ہے، کہ جب تند ہوا چلتی ہے تو پتے پراگندہ ہو جاتے ہیں، اور جب فضا میں سکون طاری ہوتا ہے، تو پھر وہ ٹھہر جاتے ہیں، ہم آگے چل کر جہاں جماعت کی اثر پذیری سے بحث کریں گے وہاں اس قسم کی مثالیں بکثرت پیش کریں گے،

---

[1] غالباً مؤلف کا اشارہ جنرل بولنگر کی جانب ہے۔ جو گذشتہ صدی میں ایک مشہور فرنچ کمانڈر تھا، لوگ اس قدر اس کے شیفتہ ہو گئے تھے، کہ آخر کار وہ فتنہ و فساد کے خوف سے تمام عام مجامع اور مجالس سے کنارہ کش ہو گیا، اگر وہ کچھ زمانہ اور زندہ رہتا تو ایک بار نپولین کے زمانہ کا نقشہ لوگوں کی آنکھوں میں پھر جاتا، اور فرنچ افواج اس کی ماتحتی میں ایک بار پھر اندازہ سے زیادہ کارہائے نمایاں انجام دیتیں، (مترجم)

جماعت کی اس متلون المزاجی کی بدولت اس پر قابو پانا، اور اس کی قیادت کرنا سخت مشکل ہے، خصوصاً اس حالت میں جب اس کو تھوڑا سا تسلط حاصل ہو گیا ہو، یہاں تک کہ اگر روزانہ زندگی کے ضروریات پوشیدگی کے ساتھ نظام قائم نہ رکھیں، تو نیابی حکومتوں کا قیام بھی دشوار ہو جائے، کیونکہ جس طرح جماعت سرعت سے کسی بات کا ارادہ کر لیتی ہے۔ اسی طرح سرعت کے ساتھ اس ارادہ سے عدول بھی کر جاتی ہے، اور جس طرح وہ طویل مدت تک غور و فکر کی زحمت نہیں برداشت کر سکتی، اسی طرح اس کا ارادہ بھی وقتی اور آنی ہوا کرتا ہے،

لیکن جماعت کا خاصۂ امتیازی صرف یہی نہیں ہے، کہ وہ از حد متلون مزاج اور اثر پذیر ہوتی ہے، بلکہ باوجود ان اوصاف کے وہ ایک وحشی انسان کی طرح اپنے ارادہ کے درمیان کسی چیز کا حائل ہونا بھی گوارا نہیں کرتی، اور اس ناگواری کے احساس میں جو بات اس کی مساعدت کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ کثرت افراد کی بنا پر اس کو بے انتہا طاقت کا شعور پیدا ہو جاتا ہے، اور جماعت میں شامل ہو کر افراد کے ذہنوں سے "ناممکن" اور "محال" کا خیال بالکل نکل جاتا ہے، انفرادی حالت میں ایک شخص کسی محل میں آگ لگا دینے کے خیال سے ہچکچائے گا، اور اگر وہ اس فعل پر مجبور کیا جائے، تو وہ اس کی مقاومت کرے گا، اور اُس سے اس فعل کا کبھی صدور نہ ہو گا، بخلاف اس کے جب وہ جماعت میں شامل ہو جاتا ہے تو پہلے سے بے انتہا طاقت کا احساس کرنے لگتا ہے، اور کثرت تعداد کے خیال سے شجاع بن جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے ارادہ میں اس قدر مضبوط ہو جاتا ہے کہ اگر اس کے راستہ میں مشکلات حائل ہوتی ہیں، تو وہ سختی سے اُن کا مقابلہ کرتا ہے، انسان کی جسمانی حالت اگر ابدی غصہ کی متحمل ہوتی تو ہم کہتے کہ جماعت کی طبعی حالت دائمی غصہ ہے،

لیکن باوجود اس کے یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ جماعت کے مذکورۂ بالا اوصاف یعنی تلون مزاجی، اثر پذیری اور قابلیتِ غیظ وغضب وغیرہ پر قبائل کے اُن موروثی خصائص کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے، جو ہمارے تمام اعمال وافعال کی بنا ہوتے ہیں، اور گو یہ ضرور ہے کہ ہر جماعت میں کم وبیش اثر پذیری اور تلون مزاجی کی قابلیت پائی جاتی ہے لیکن اقوام کے موروثی خصائص کے اختلاف وتنوع کی بنا پر جماعت کی ان خصوصیتوں میں بھی تفاوت درجات ہوتا ہے، بعض قومیں اپنے موروثی خصائص کی بنا پر بے انتہا متلون مزاج ہوتی ہیں، اور بعض قوموں میں تلون کا اثر کم پایا جاتا ہے، مثال کے طور پر لاطینی اور سکسن انگلش قوموں کو لو، لاطینی قوم عورتوں کی طرح اس قدر متلون مزاج اور اثر پذیر واقع ہوئی ہے کہ ایک ذراسی بات پر ساری قوم میں غیظ وغضب کی بجلی دوڑ جاتی ہے۔ بخلاف انگریز قوم کے کہ اس کا پائے ثبات مشکل سے مشکل وقت میں بھی بہت کم لغزش کھاتا ہے، ہمیں وہ واقعہ خوب یاد ہے، جب ایک ٹیلیگرام کی بنا پر جس میں ہمارے سفیر کی فرضی اہانت کا واقعہ مندرج تھا، ہماری قوم میں اس قدر ہیجان پیدا ہوا کہ فوراً ہولناک جنگ برپا ہوگئی، اور پھر جب لانگسون میں ہماری فوج کو شکست ہوئی، تو اس وقت کے جوش کا کیا پوچھنا تھا، فوراً وزارت میں انقلاب ہوگیا، حالانکہ اسی زمانہ میں انگریزوں کو بمقام خرطوم سخت شکست ہوئی، لیکن انگریزوں کے ثبات وعزم کو دیکھو کہ اس واقعہ سے انگریزی رائے عامہ میں نہ کوئی ہیجان پیدا ہوا اور نہ وزارت میں کوئی تغیر واقع ہوا،

غرض یوں تو ہر جماعت عورتوں اور ناقص الشعور افراد سے مشابہ ہوتی ہے لیکن لاطینی قوموں میں یہ خصوصیت دنیا کی تمام قوموں سے زیادہ پائی جاتی ہے، اسی وجہ سے جو شخص ان قوموں کا اعتماد حاصل کرتا ہے، وہ تھوڑی سی مدت میں ترقی پاجاتا ہے

لیکن ہمیشہ اسے یہ خوف لگا رہتا ہے، کہ ایک معمولی قصور کے سرزد ہونے پر اس کی یہ تمام ترقی ملیامیٹ ہو جائے گی، اور وہ اوج رفعت سے گر جائیگا،

(۲)

اثر پذیری اور زود اعتقادی

جماعت کی تعریف کرتے ہوئے ہم نے بیان کیا تھا، کہ اس کا مخصوص وصف یہ ہے کہ اس میں نہایت شدت کے ساتھ اثر پذیری کی استعداد پائی جاتی ہے، اور یہ بھی بیان کیا تھا، کہ حالتِ اجتماع میں تعدیہ اثر کس طرح وقوع پذیر ہوتا ہے، نیز ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ جماعت کے تمام احساسات و مشاعر کا ایک مرکز پر جو اتحاد و اجتماع ہوتا ہے، اسکا کیا سبب ہے، غرض گذشتہ بیانات سے خوب اچھی طرح واضح ہو چکا ہے کہ جماعت پر گو اطمینان و سکون کے کتنے ہی آثار طاری ہوں تاہم وہ اپنے خاصہ اثر پذیری کی بدولت ہمیشہ اس بات کے لئے آمادہ رہتی ہے، کہ ادھر کوئی موثر اس پر اپنا اثر ڈالے، اور وہ اس کا اثر قبول کرے، اور صرف یہی نہیں بلکہ جوں ہی اثر کا تعدیہ تمام افراد پر ہو چکتا ہے، تمام افراد اس اثر سے متاثر ہو کر مشغولِ کار ہو جاتے ہیں، پھر افراد کو اس سے غرض نہیں رہتی، کہ یہ مقصد جس کے حاصل کرنے کے لئے وہ ایک متاثرانہ شان سے بیتاب نظر آتے ہیں، کس قسم کا ہے، بلکہ وہ اس اثر سے اس قدر مسحور ہو جاتے ہیں کہ اپنی جان تک کی پروا نہیں کرتے، اور جان، مال، دولت، غرض ہر عزیز سے عزیز شے کی قربانی کرنے کیلئے آمادہ ہو جاتے ہیں، یہانتک کہ افراد میں اس آمادگی اور مستعدی کے پیدا کرنے کے لئے

اس کی ضرورت بھی نہیں ہوتی، کہ عقلی استدلال سے اس مقصد کی برتری اور اباحت یا اسکی قباحت اور حرمت کو ثابت کیا جائے، جیسا کہ انفرادی حالت میں ہوتا ہے، بلکہ اس آمادگی اور مستعدی کے پیدا کرنے کا اصلی دار مدار اس موثر کی ذات اور کیفیتِ تاثیر پر ہوتا ہے، جس نے افراد کو اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے آمادہ کیا ہے،

لیکن چونکہ جماعت ہمیشہ احساسات نیم شعوری کے تابع ہوتی ہے، یعنی یہ کہ بسہولت تمام مؤثرات کے اثر کو قبول کر لیتی ہے، اور ان افراد کے مثل جو عقل سے اثر پذیر نہیں ہوتے مغلوب الحس اور ملکۂ انتقاد اور قوتِ ممیزہ سے بے بہرہ ہوتی ہے، اس لئے اسکی شان سے یہ ہے کہ زود اعتقادی اور سریع التصدیق ہو، اس قانون کو ذہن میں رکھنے سے اس بات کا سبب جلد سمجھ میں آجاتا ہے، کہ ناممکن اور غیر معقول قصے اور خرافات اس قدر جلد لوگوں میں کیوں منتشر ہو جاتے ہیں، اور قبولیتِ عامہ کیوں حاصل کر لیتے ہیں۔

پھر ان خرافات کے اختراع و انتشار کا اصلی سبب صرف یہی نہیں ہے کہ جماعت زود اعتقاد اور سریع التصدیق ہوتی ہے، بلکہ ان قصوں کی مقبولیت کا ایک سبب نفسِ اجتماعی کا ایک یہ خاصہ بھی ہے، کہ جماعت جب کبھی واقعہ کا ادراک کرتی ہے تو

لہ جو لوگ محاصرۂ شہر پیرس کے زمانہ میں موجود تھے، ان کو جماعت کی زود اعتقادی اور سرعتِ تصدیق کی بہت سی مثالوں کا علم ہوگا، چنانچہ ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک شب اتفاق سے ایک مکان کی کھڑکی سے لوگوں کو چراغ کی روشنی نظر آئی، لوگ یہ سمجھے کہ اس مکان میں کوئی جاسوس ہے، اور وہ روشنی کے ذریعہ سے جرمنوں کو راہ بتا رہا ہے، باوجودیکہ ادنیٰ توجہ سے یہ بات ہر شخص سمجھ سکتا تھا کہ غنیم جو کوسوں دور ہے، اس چراغ کی روشنی کو کیونکر دیکھ سکتا ہے، لیکن لوگوں نے اس افواہ پر یقین کر لیا، (مؤلف)

ہمیشہ اس کا اعتقاد صورِ خیالی کے ذریعہ سے ہوا کرتا ہے، جو جماعت کے ذہن میں پیدا ہوتے ہی واقعات کی اصلی حقیقت کو کچھ سے کچھ کر دیتی ہیں، ایک واقعہ جو نہایت سادہ ہوتا ہے جماعت کے مخیلہ میں آکر اُس کی صورت بالکل بدل جاتی ہے، اور اُس کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے، کہ جماعت صرف ان ہی واقعات کا ادراک کر سکتی ہے، جو تمثیلی رنگ میں اس صورت سے اس کے سامنے پیش کئے جائیں، کہ شدتِ مبالغہ کی بدولت اُن واقعات کی ذہنی صورت اور اصل حقیقت کے مابین کوئی ادنیٰ علاقہ بھی باقی نہ رہا ہو، اس حالت کا ادراک ہم بخوبی اُس وقت کر سکتے ہیں، جب ہم اپنے ذہن میں اُن اجنبی ذہنی اشکال وصور کی یاد تازہ کریں جو کبھی کسی واقعہ کے تصور کرتے وقت ہمارے ذہن میں پیدا ہوئی تھیں، البتہ ہمارے اور جماعت کے مابین جو فرق ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ ہماری عقل ہم کو اس مناسبت اور تفارق سے آگاہ کرتی رہتی ہے، جو ان مذہبی صور اور اصل واقعات کے درمیان ہوتا ہے لیکن چونکہ جماعت کی قدرت سے یہ تمیز باہر ہوتی ہے، اور جو کچھ اُس کے ذہن میں آتا ہے، اسے وہ بلا نقد کئے ہوئے اصلی حادثہ کی جانب کرنے کی عادی ہے اس لئے وہ خود کسی شئے اور اُس کی ذہنی صورت کے باہمی فرق کا ادراک نہیں کر سکتی، بلکہ تمام اُن خیالات اور ذہنی صورتوں کو جذب و ہضم کر لیتی ہے، جو اس کے ذہن میں پیدا ہوں، حالانکہ اغلباً اُن ذہنی صور کو اصلی واقعات سے کوئی نسبت نہیں ہوتی،

پھر چونکہ وہ افراد جن سے جماعت کی تشکیل ہوتی ہے اُن کے امزجہ باہم بالکل مختلف اور متبائن ہوتے ہیں، اس لحاظ سے ہونا تو یہ چاہئے کہ ذہنی اشباح جو کسی واقعہ کے تصور کے وقت جماعت پیدا کر لیتی ہے، افراد کے اختلافِ طبائع کی بنا پر مختلف قسم ہوں، لیکن تجربہ سے اس کے خلاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ بجائے اس کے کہ یہ ذہنی صورتیں

مختلف ہوں، بالکل یکساں ہوتی ہیں، بلکہ ہوتا یہ ہے کہ پہلے جماعت کے کسی ایک فرد کے ذہن میں کسی واقعہ کا تصور کرتے وقت ایک ذہنی صورت پیدا ہوتی ہے جو مثل خمیر کے ہوتی ہے، اور اس کے بعد قانونِ تعدیہ کی بنا پر اسی خمیر کے آب و گل سے باقی افراد کے ذہنوں کے اندر بھی یہی ذہنی پیکر اور یہی خیالی مرقع تیار ہو جاتا ہے، مثال کے طور پر ہم کہتے ہیں کہ قبل اس کے کہ تمام صلیبیوں کو بیت المقدس کی چار دیواری پر سینٹ جارج کی صورت نظر آتی، فطری بات تھی کہ سب سے پہلے کسی ایک فرد کے تخیل میں یہ تصویر آئی ہوگی، اس کے بعد جماعت کی اثر پذیری اور تعدیۂ اثر کی خصوصیتوں نے اس تخیل کو ایک جسم مرئی کی صورت میں لاکر تمام افراد کے پیش نظر کر دیا ہوگا،

یہی حالت اُن تمام ذہنی صورتوں کی ہوتی ہے، جن کو تاریخ نے روایت کے ذریعہ سے ہم تک پہنچایا ہے، اور جن پر اس وجہ سے حقیقت کا ملمع چڑھا ہوا ہے کہ لاکھوں آدمیوں نے بیک وقت اپنی آنکھوں سے ان کا مشاہدہ کیا،

لیکن اب یہاں پر یہ سوال قدرتی طور پر پیدا ہوتا ہے، کہ آخر جماعت میں بہت سے افراد ایسے بھی ہوتے ہیں، جو عقل و ذکاوت سے بہرہ مند ہوتے ہیں، وہ کس طرح ان ذہنی اشکال و اشباح کی حقیقت کو تسلیم کر لیتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے، کہ جماعت کی اس خصوصیت یعنی اثر پذیری اور زود اعتقادی میں عقل و ذکاوت بالکل کام نہیں دیتی، اور عالم و جاہل دونوں کی حالت اس بارہ میں یکساں ہوتی ہے کہ وہ جب تک جماعت میں شامل رہتے ہیں تعقل و تمیز کی قدرت نہیں رکھتے، اور اگرچہ معترض یہ کہہ سکتا ہے، کہ یہ خیال کہ جماعت میں عالم و جاہل دونوں مساویانہ حیثیت سے تعقل و تمیز کی صلاحیت نہیں رکھتے سفسطۂ محض ہے، گو اس میں بھی شک نہیں کہ اپنے دعویٰ کے

اثبات کے لئے ہمیں بہت سے تاریخی واقعات دہرانا پڑیں گے، جن کے لئے ایک عمر کی حاجت ہے لیکن چونکہ ہم ناظرین کو غیر مدلل قضایا کے سامنے تاریکی میں نہیں چھوڑنا چاہتے، اس لئے اپنے دعوی کے ثبوت میں متعدد شہادتیں سپرد قلم کرتے ہیں،

سب سے پہلے ہم وہ واقعہ نقل کرتے ہیں، جو ہمارے دعویٰ کی جلی شہادت ہے کیونکہ اس واقعہ میں خیالی صورت جن افراد کے ذہنوں میں پیدا ہوتی ہے، وہ مختلف قسم کے لوگ تھے، اُن میں جاہل بھی تھے اور عالم بھی، یہ واقعہ ایک بحری لفٹننٹ جولین فنالیکس نے اپنی کتاب" بحری سفرنامہ" میں درج کیا ہے، اور اس سے قبل مجلہ علمیہ (سائنٹفک میگزین) میں بھی شائع ہو چکا ہے، وہ لکھتا ہے :-

"آہن پوش جہاز بیل پول سطح آب پر جہاز لیبر سو کو جو ایک سخت طوفان کے باعث گم ہو گیا تھا، تلاش کر رہا تھا، موسم خوشگوار اور آفتاب نور افگن تھا کہ ناگاہ چلتے چلتے ایک جھنڈی دکھائی دی، جو ایک غرق ہونے والی کشتی کی جانب اشارہ کر رہی تھا، جہاز پر جتنے آدمی تھے سب نے دیکھا کہ ایک جہاز جو آدمیوں سے پر ہے، غرق ہو رہا ہے، اور لوگ شور و غل مچا رہے ہیں، یہ سب کچھ گو تخیل تھا، لیکن کپتان نے فوراً ایک کشتی ان نا امیدوں کے بچانے کے لئے سمندر میں چھوڑ دی، ہم جتنا قریب ہوتے جاتے، آدمیوں کی چیخ پکار زیادہ سنائی دیتی، لیکن جب منزل مقصود پر پہنچے تو وہاں بجز درختوں کے جو برگ و بار سے لدے ہوئے تھے، اور کچھ نہ تھا نہ کوئی جہاز غرق ہوا تھا، اور نہ کسی آدمی کا پتہ تھا، جوں ہی اصل حقیقت آشکارا ہوئی تخیل رفوچکر ہو گیا"

اس واقعہ سے بڑھ کر کیا کوئی دوسری مثال پیش کیجا سکتی ہے، جو جماعت کی اس

خلاق قوتِ مصورہ کے وجود پر کافی ضمانت ہوسکے، اور جس سے یہ پتہ چلتا ہو کہ جماعت کس عجیب وغریب طریقہ سے ایک خیالی صورت اپنے ذہن میں پیدا کرلیتی ہے، اور اس کی صحت پر اس شدومد سے یقین کرتی ہے کہ اس کے متعلق شک وابہام کی گنجایش ہی نہیں رہتی، دیکھو اس واقعہ میں ایک طرف ایک جماعت حالتِ انتظار و استعداد میں محو تھی اور دوسری جانب شاہدِ مقصود کی ایک جھلک اُسے دکھائی دی، خیال تو کرو کہ یہ کتنا قوی مؤثر تھا، جس کے اثر سے جہاز پر جتنے لوگ تھے سب مسحور ہو گئے، اور سب نے اس خیالی صورت کو واقعہ سمجھ لیا،

پھر جماعت کا اشیاء کی اصلی حقیقت کو نہ سمجھنا، اور واقعات کو غیر مربوط تخیلات کی شکل میں منتقل کرنا، اس کے لئے کچھ اس کی بھی ضرورت نہیں کہ جماعت کی تشکیل ایک جمِ غفیر سے ہوئی ہو، بلکہ جب چند افراد اکٹھا ہو جاتے ہیں، تو گو یہ سب کے سب اکابر علماء سے ہوں لیکن جماعت کی تشکیل ہوتے ہی ان میں بھی وہ اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں جو عموماً جماعتوں میں پائے جاتے ہیں، ان میں کا ہر فرد ایسے اوصاف کا جامہ پہن لیتا ہے، جو اگرچہ اسکی خصوصیتِ علمی کے بالکل خلاف ہوتے ہیں لیکن تشکیلِ جماعت کے لئے ضروری ہیں، اور ان میں کا ہر فرد فی الفور محروم التمیز اور مسلوب العقل ہو جاتا ہے، اس حقیقت کی ایک عجیب وغریب مثال ایک وہ واقعہ ہے جو ایک مشہور ماہر نفسیات موسیو ڈیوی کے حیرت انگیز طلسمی اعمال کے متعلق مشہور ہے جسے ہماری زبان کے مشہور رسالہ "روزنامہ علم النفس" نے اپنی ایک قریبی اشاعت میں شائع کیا ہے، وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک بار موسیو ڈیوی نے یورپ کے سائنسدان ماہرین کو جنہیں انگلستان کا مشہور عالم مسٹر ولیس بھی تھا، اس بات کی دعوت دی کہ ایک جگہ جمع ہو کر اسکے حیرت انگیز طلسمی اعمال کا مشاہدہ کریں، جب سب لوگ جمع ہو گئے، تو موسیو ڈیوی نے ان کے

سامنے کچھ چیزیں پیش کیں، اور ان کو اجازت دی کہ ان اشیار پر جہاں جہاں چاہیں مہر لگادیں، پھر ان کے سامنے موسیوڈیوی نے تمام وہ طریقے استعمال کئے جو فن استخدام ارواح اور فن تجسیم ارواح میں استعمال کئے جاتے ہیں، یہ اعمال اس قدر حیرت انگیز تھے کہ ان کو دیکھکر سارے مجمع نے جو اکابر علمار پر مشتمل تھا، موسیوڈیوی کو اس مضمون کے سارٹیفکٹ دئے کہ جو باتیں اس وقت ہمارے سامنے گذریں وہ طاقتِ بشری سے بالاتر تھیں، لیکن جب یہ سارٹیفکٹ موسیوڈیوی کے ہاتھ میں آگئے تو اس وقت اس نے مجمع کے سامنے اقرار کیا کہ یہ سارے کا سارا کھیل صرف ایک شعبدہ تھا، اس واقعہ کا راوی کہتا ہے، کہ موسیوڈیوی کے حیرت انگیز اعمال کے مشاہدہ کرنے سے جس بات پر حیرت ہوتی ہے وہ اس کی مہارت اور صفائی نہیں ہے، بلکہ حیرت اس بات پر ہوتی ہے، کہ ان لوگوں نے اس کو سارٹیفکٹ کس طرح دیدئے، اور اس بات پر کہ سارٹیفکٹ دینے والوں نے ایسے بہت سے واقعی افسانے بیان کئے، جو سب کے سب جھوٹے تھے، جو باتیں ان لوگوں نے اپنے روایت کردہ واقعات کے متعلق بیان کیں، وہ اگر صحیح مان لی جائیں، تو پھر ان واقعات کو شعبدہ کہنا غلط ہوگا، نیز اس بات پر سخت حیرت ہوتی ہے کہ موسیوڈیوی کو اس قسم کے اعمال کی کس طرح جرأت ہوئی، حالانکہ وہ محض شعبدہ تھے، اور ایک مجمع پر ان کا اس قدر شدید اثر پڑا، کہ جو اس وقت تم نہیں دیکھ سکتے، وہ اُنھوں نے دیکھ لیا، یہ کون سا اثر تھا؟ یہ اسی قسم کا اثر تھا، جو مسمریزم کا عامل معمول پر ڈالتا ہے، پھر جب کہ مذکورۂ بالا واقعہ سے یہ معلوم ہوگیا، کہ اس قسم کا اثر روشن دماغ لوگوں پر بھی ڈالا جا سکتا ہے، تو اب جماعت کی معمولی عقلوں میں اس تاثیر کے عمل سے کون انکار کرسکتا ہے،

غرض مذکورۂ بالا دعوے کے ثبوت میں ہمارے پاس متعدد شہادتوں کا ایک انبار

موجود ہے، جن کا نقل کرنا موجبِ تطویل ہوگا، البتہ ذیل کے واقعہ کا ذکر کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے
مصنف کتاب کو مرتب کر رہا تھا کہ اخبارات میں زور وشور کے ساتھ یہ خبر شائع ہوئی کہ
دو لڑکیاں دریائے سین میں غرق ہوگئیں، اور اُن کی لاشیں دریا سے نکال کے مجمع کے سامنے رکھی
گئیں، تو متعدد شاہدوں نے اُن کی شناخت کی، یہ شہادتیں اس قدر زبردست تھیں کہ آخر کار
ججوں کو بھی ان شہادتوں کا یقین آگیا، اور اُنھوں نے دونوں کے دفن کئے جانے کی اجازت
دے دی، لوگ دفن کا سامان کر ہی رہے تھے کہ وہ لڑکیاں جن سے یہ لاشیں مشابہ تھیں
اور جن کے شبہہ پر شاہدوں نے گواہی دی تھی اتفاقیہ طور پر آگئیں، اور اب معلوم ہوا کہ تمام شاہدوں
کو شبہہ ہوگیا تھا، حالانکہ ان لاشوں اور زندہ لڑکیوں کے مابین کچھ یوں ہی سی مشابہت تھی
جو مغالطہ شاہدوں کو یہاں ہوا وہ بعینہ وہی ہے، جس کا اوپر کی مثالوں میں تذکرہ کیا جا چکا ہے
اور وہ یہ ہے کہ پہلے شاہداوں کے ذہن میں ایک معمولی تشابہ کی بنا پر یہ خیال گذرا کہ یہ غرق شدہ
لاشیں غالباً فلاں اور فلاں کی بیٹیوں کی ہیں اور محض اس خیال کے پیدا ہوتے ہی اُس نے
گواہی دیدی، پھر بقیہ شاہد بھی تعدیۂ اثر کی بنا پر اس کے اثر سے متاثر ہوگئے، اور اُنھوں نے
بھی اپنی شہادتوں سے شاہداوں کی تائید کی،

ان واقعات میں جماعت کی اثر پذیری کا پہلا درجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے ایک شخص کے ذہن
میں چند مبہم مشابہتوں کی بنا پر ایک خیال پیدا ہوتا ہے، اور اس شدت سے اُس کے ذہن
میں گھر کرتا ہے، کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کی رائے یہی ہے، پھر اس کے بعد اسی خیال سے
کچھ لوگ اور اثر پذیر ہونا شروع ہوتے ہیں پس اب اگر وہ پہلا شخص جس کے سامنے پہلے واقعہ
گذرا ہے سریع التاثر ہے، تو بس اس کے لئے اتنی ہی بات کافی ہوتی ہے، کہ لاش میں
جو اُس کے سامنے پیش کی گئی ہے، کوئی علامت ایسی پائی جاتی ہو جو کسی دوسرے زندہ شخص

کے جسم میں بھی پائی جاتی ہے، اور جسے یہ شخص پہلے دیکھ چکا ہے، بس اتنے سے تشابہ پر اس شخص کو یقین ہو جائیگا، کہ یہ جسم وہی پہلا جسم ہے، خواہ واقع میں ان دونوں جسموں میں کوئی بہت مشابہت بھی ہو یا نہ ہو، اور اب اس تخیل کا اثر اس قدر قوی ہو جاتا ہے کہ حد ادراک میں اس کے قدم رکھتے ہی قوتِ ممیزہ بالکل مسلوب ہو جاتی ہے، اور ملکۂ انتقاد بالکل فنا ہو جاتا ہے، اس حالت میں یہ شخص وہ نہیں دیکھتا جو اس کی نظر کے سامنے ہوتا ہے، بلکہ وہ دیکھتا ہے، جو اس کے تخیل کے اندر ہوتا ہے،

اسی واقعہ سے ملتا جلتا ایک دوسرا واقعہ اور ہے، اور اس میں بھی شاہدوں نے اسی قسم کی غلط شناخت کی جیسی کہ اُس واقعہ میں کی تھی، بلکہ اس واقعہ میں حیرت انگیز امر یہ ہے کہ ایک عورت اپنے بیٹے کی غلط شناخت کرتی ہے، یہ واقعہ گو کسی قدر پرانا ہو گیا ہے تاہم اخبارات میں اب اس کا ذکر آیا ہے، وہ واقعہ حسبِ ذیل ہے :-

"شہر پیرس میں کسی مقام پر کسی بچہ کی لاش پڑی ہوئی ملی، اتفاقاً ایک دوسرا لڑکا ادھر آنکلا، اور اُس نے بیان کیا، کہ یہ میرے ایک ہمدرس دوست کی لاش ہے، دوسرے دن اُس کی ماں طلب کی گئی، وہ لاش کو دیکھتے ہی چلا اٹھی کہ یہ میرا بچہ ہے جو ماہ جولائی سے لاپتہ ہو گیا تھا، لوگ اُسے پکڑلے گئے اور اب اسے قتل کر کے اس مقام پر چھوڑ گئے، اس عورت کا نام چاونڈریٹ تھا، اس کے بعد اس کی ماں کے بہنوئی کو اطلاع ہوئی جس نے آکر بیان کیا، کہ ہاں یہ میرے بھانجے فلیبر کی لاش ہے، اسکے بعد پولیس نے مزید شہادتیں اور طلب کیں جن میں اس لڑکے کے اسکول ماسٹر کی شہادت بھی تھی، اسکول ماسٹر نے لاش کی گردن میں سونے کا تمغہ دیکھکر کہا کہ ہاں یہ لڑکا اسی عورت کا ہے، اور اس کی شناخت یہ ہے کہ اس لاش کے گلے میں جو تمغہ پڑا ہوا ہے، یہ

وہی ہے جو اس بچہ کو اسکول سے انعام میں ملا تھا، کیا کسی دعویٰ کی تائید میں اس سے زیادہ قطعی الدلالت شہادت آسانی سے تصور میں آسکتی ہے، لیکن واقعات مابعد سے ثابت ہوگیا، کہ یہ تمام ذخیرۂ شہادت مجموعۂ خرافات تھا چھ ہفتہ کے بعد پتہ لگا کہ وہ قعۃً جس لڑکے کی یہ لاش تھی، وہ پیرس کا تھا ہی نہیں، اور یہ لاش شہر بورڈو کے ایک لڑکے کی ہے، جسے ایک کمپنی شہر پیرس میں اُٹھا لائی ہے، چنانچہ بالآخر خالو، اُستاد، کلاس فیلو، اور دیگر معزز گواہوں میں سے سب نے اپنی غلط شناسی کا اعتراف کیا[1]

لیکن واقعات بالا کے متعلق یہ پیش نظر کرلینا بھی ضروری ہے کہ اس قسم کی غلط شہادتیں عموماً عورتیں اور بچے اور وہ افراد پیش کرتے ہیں جو دوسروں سے زیادہ سریع التاثر اور زود اعتقاد ہوتے ہیں،

اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر ہمیں اس قسم کی تمام شہادتوں کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوجائیگا جو عموماً عدالتوں میں پیش ہوتی ہیں، عام طور پر تمام ججوں کی متفقہ شہادت ہے، کہ سن طفولیت میں آدمی جھوٹ نہیں بولتا، حالانکہ میں کہتا ہوں کہ یہ لوگ اگر نفسیات سے کسی قدر واقف ہوتے تو ان کو معلوم ہوجاتا کہ آدمی اس عمر میں ہمیشہ جھوٹ بولتا ہے، گو اس کا جھوٹ معصومانہ ہوتا ہے لیکن وہ جھوٹ ضرور ہوتا ہے،

ہاں تو ہم پھر اپنے گذشتہ بیان کی طرف رجوع کرتے ہیں، ہم کہہ یہ رہے تھے کہ جماعت کے اقوال اور شہادتیں عموماً سب سے زیادہ غلط ہوتی ہیں، اور جماعت کی شہادت کا مطلب یہ ہوتا ہے، کہ شہادت جو جماعت پیش کر رہی ہے، ایک فرد کا خیال ہے، جو تمام افراد

---

[1] اخبار "اکلیر" ۱۲ر اپریل ۱۸۹۵ء۔

کے ذہنوں میں متعدی ہو گیا ہے، اس قسم کی مثالیں کہاں تک پیش کی جائیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت کی شہادت پر یقین کرنے سے ہمیں احتراز کرنا چاہئے، اس کلیہ کی ایک بڑی مثال یہ ہے کہ سب جانتے ہیں کہ واٹرلو کے واقعہ میں کس قدر لوگ شریک تھے، لیکن اب تک اختلافِ آراء کے باعث یہ پتہ نہ چلا کہ اس حملہ کا کمانڈر کون تھا؟ یہاں تک کہ مشہور انگریز جنرل لارڈ وولزلی نے اب جو کتاب شائع کی ہے، اس میں تصریح کی ہے کہ راویوں نے واقعات کی روایت میں سخت دھوکے کھائے ہیں، حتیٰ کہ جنگِ سیڈان کے ان واقعات کی روایت میں بھی جن کی صحت پر ہزاروں آدمیوں کا اجماع ہو چکا ہے۔[۱]

---

[۱] اس میں بالکل شک نہیں کہ ہمیں کسی جنگ کی اصلی حقیقت کا کچھ علم نہیں ہوتا، اور اس بارے میں جو کچھ ہمارے معلومات ہوتے ہیں، وہ یہ ہوتے ہیں، کہ غالب کون اور مغلوب کون ہوا، اور اس کے علاوہ ہمیں کسی بات کا علم نہیں ہوتا، میرے خیال میں ڈی ہارکوٹ نے جنگِ سولفرینو کی بابت جو کچھ لکھا ہے، وہ ہر جنگ پر صادق آتا ہے، وہ لکھتا ہے:۔

"قائدین عساکر اپنی اپنی رپورٹیں متعدد سپاہیوں کے اقوال کی بنا پر پہلے تحریر کرتے ہیں، اب ان ہی رپورٹوں کے سامنے رکھ کر ذمہ دار افسر احکام جاری کرتے ہیں اور آخری رپورٹ تحریر کرتے ہیں، لیکن یہ تحریر جب قائد عام (فیلڈ مارشل) کے سامنے پیش کیجاتی ہے، تو وہ جھلا کر کہتا ہے کہ یہ رپورٹ تم نے غلط لکھی ہے، اس کے بعد وہ خود اس رپورٹ کے بجائے اپنی رپورٹ مرتب کرتا ہے جسمیں اصلی حقیقت کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔"

جنگ مذکور کے متعلق ڈیوک ہارکوٹ نے یہ واقعہ اس غرض سے تحریر کیا ہے کہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مشہور واقعات کی اصلی حقیقت دریافت کرنا بہت مشکل ہے، حتیٰ کہ ان واقعات کی حقیقت بھی جو فوراً ضبط تحریر میں لے آئے جائیں، (مولف)

غرض جماعتوں کی شہادتیں جس قسم کی ہوتی ہیں، واقعاتِ بالا سے ان کی قدر وقیمت کا خوب اچھی طرح اندازہ ہوسکتا ہے لیکن باوجود اس کے یہ عجیب بات ہے کہ منطقیین نے متعدد اشخاص کے کسی مسئلہ پر متفق ہو جانے کو اُن قطعی دلائل میں سے شمار کیا ہے، جو کسی امر کے ثابت کرنے کے لئے کافی ہوتے ہیں، بخلاف اس کے نفسیات سے جو بات ہمیں ان کے متعلق معلوم ہوتی ہے، اور علم النفس جس جانب ہمیں ہدایت کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ شک اور اصلی شک کی گنجایش انہی وقائع میں ہوتی ہے، جن کو ایک جم غفیر نے روایت کیا ہو، اور اس بنا پر منطقیین کی خدمت میں ہمارا مشورہ یہ ہے، کہ وہ ذرا تکلیف کر کے متواترات کی بحث پر ایک عمیق نظر اور ڈالیں، تاکہ اس بحث کی اچھی طرح تنقیح ہو جائے، یہ کہنا کہ اس واقعہ کو بیک وقت متعدد لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، یا فلاں واقعہ کے متعلق شہادت عینی کا یہ بیان ہے، اس کا غالباً دوسرے الفاظ میں یہ مطلب ہوتا ہے کہ جماعت جو شہادت پیش کر رہی ہے، اصل میں واقعہ اس سے بہت مختلف ہے،

غرض اس پوری بحث کا نتیجہ یہ نکلتا ہے، کہ تاریخی کتابوں کو صرف اس نگاہ سے دیکھنا چاہئے کہ گویا ان کو وہم وخیال نے تصنیف کیا ہے، اور بہت سے ایسے خرافات اور خیالی واقعات ان میں مندرج ہیں، جن کا وقوع مشکوک ہے، اور جن پر بعد کو بہت سے حاشیے چڑھائے گئے ہیں، اس بنا پر میرا خیال یہ ہے کہ واقعاتِ تاریخی کی ترتیب وتدوین میں اپنے وقتِ عزیز کے خون کرنے سے یہ بہتر ہے، کہ انسان کسی دوسرے ذلیل کام کرنے میں مشغول رہے، صفحاتِ تاریخ میں جن اعاظم رجال کے کارنامے درج ہیں اُن کی حالت یہ ہے، کہ قوموں کے وہم وخیال نے ان کی اصلی حقیقت کو کچھ سے کچھ کر دیا ہے، ہیرکلیز، بدھ اور دیگر تاریخی اشخاص کے کارنامے صرف قوموں کے وہم وخیال کے نتائج ہیں، اُن کی اصلی

زندگی کچھ اس قدر زیادہ اہم نہ تھی، جتنی بعد کو کر دی گئی، اور حقیقت یہ ہے کہ چونکہ بڑے سے بڑا شخص بھی جماعت کو اثر پذیر کرنے میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ وہ اپنی زندگی کو ایک مافوق العادۃ صورت میں دنیا کے سامنے پیش نہ کرے، اس لئے اس کی زندگی کے واقعات کا بعد کو کچھ سے کچھ ہو جانا ایک ناگزیر امر ہوتا ہی،

پھر ان مراحل کو طے کرنے کے بعد دوسری نحوست یہ پیش آتی ہے کہ باوجودیکہ یہ قصے اور کارنامے کتابوں کے اندر محفوظ کر دئے جاتے ہیں، لیکن جماعت کا بدقسمت تخیل یہاں بھی اُن کا پیچھا نہیں چھوڑتا، اور وہ برابر ان میں تحریف کرتا رہتا ہے، مثال میں دیکھو کہ وہ خونخوار یہواہ جس کا تذکرہ تورات میں ہے اور وہ یہواہ جو محبت کا دیوتا ہے اور جس کا ذکر **سینٹ ٹیریزنے** کیا ہے، ان دونوں میں کتنا فرق ہے، پھر دیکھو کہ وہ **گوتم** بدھ جس کی پرستش **چین** میں ہوتی ہے اور وہ بدھ جس کی پرستش **جاپان** اور **ہندوستان** میں ہوتی ہے، ان دونوں میں اب کون سی مشابہت باقی رہی ہے،

اعاظم رجال کے حالات و واقعات میں جماعت کا بدقسمت وہم و تخیل جس طرح تحریف سے کام لیتا ہے، اس کے لئے کچھ زیادہ مدت گذرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ یہ انقلاب چند سالوں کے اندر اندر دیکھتے ہی دیکھتے ہو جاتا ہے، ہم نے اعاظم رجال میں سے ایک بڑے شخص کی تاریخ پڑھی ہے، جس نے پچاس برس سے بھی کم مدت میں مختلف صورتیں بدلیں، **آل بوربون** کے زمانہ میں نپولین کی تصویر لوگوں کے ذہنوں میں یہ تھی کہ وہ ایک محب انسانیت، آزاد، مفکر، اور مسکینوں کا غمگسار ہے، اور اگر شاعروں کا قول درست ہو تو وہ ایسا شخص ہے کہ جس کی یاد مسکینوں کی جھونپڑیوں میں مدتوں تازہ رہے گی، پھر تیس برس کے بعد وہی نپولین ایسا پلٹا کہ اب وہ لوگوں کو استبداد کا دیوتا ظالم و جفاکار اور لوگوں

کی آزادی سلب کرنے والا نظر آنے لگا، لیکن اس کے بعد ہم نپولین کو ایک دوسرے ہی رنگ میں پاتے ہیں، یوں ہی انقلاب ہوتے ہوتے ایک زمانہ وہ آئے گا کہ اس زمانہ کے لوگ متناقض خیالات و آراء سے گھبرا کر سرے سے اس کے وجود ہی سے انکار کرنے لگیں گے، جیسا کہ اس وقت بعض لوگ گوتم بدھ کے وجود میں شک کرتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں، کہ وہ بھی یونانی پہلوان ہیرکلیز کی طرح ایک خیالی انسان تھا، البتہ لوگوں کے احوالِ جماعت کی واقفیت کی بدولت جتنا جتنا یہ معلوم ہوتا جائیگا، کہ تاریخ صرف خرافات اور توہمات اور خیالی واقعات کے باقی رکھنے کی کوشش کرتی ہے، اسی قدر وہ کسی امر کے متعلق شک ظاہر کرنے اور اصلی حقیقت کے پوشیدہ رکھنے کی وجہ سے عمیق حزن و غم زیادہ محسوس کرتے جائیں گے،

(۳)

جماعت کی مبالغہ پسندی، ساڈلوجی۔

مشاعر جماعات، خواہ کسی طرح کے ہوں یعنی مفید ہوں یا غیر مفید، مضرت رساں ہوں یا فائدہ رساں، نیک ہوں یا بد، ہر صورت میں اُن کے دو مخصوص اوصاف ہوتے ہیں نہایت سادگی اور بے انتہا مبالغہ آمیزی، لیکن جس طرح اور دیگر خصائص کے اعتبار سے افراد جماعت اور وحشی انسانوں کے مابین بہت کم فرق ہوتا ہے، اسی طرح ان دو خصائص میں بھی افراد جماعت اور وحشی انسان بہت کچھ ایک دوسرے سے مشابہ ہوتے ہیں، وحشی انسانوں کے افراد جماعت بھی فاقد التمیز ہوتے ہیں، ان کی نظر تمام اشیاء پر یکساں پڑتی ہے، اور اشیاء کے باہمی فروق کا ادراک نہیں کرسکتے، جماعت اپنے مشاعر و احساسات میں

مبالغہ پسند کیوں واقع ہوئی ہے؟ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ہر اثر یا خیال جو اس میں پیدا ہوتا ہے، جماعت کے خاصۂ اثر پذیری کے بدولت تمام افراد میں پھیل جاتا ہے، اور پھر تمام افراد جب ایک وہم اس کو قبول کر لیتے ہیں، تو اس وجہ سے اس وہم کو قوت حاصل ہو جاتی ہے،

جماعت کی مبالغہ پسندی اور سادہ لوحی کا ایک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جماعت شک و تردد نا آشنا محض اور عورتوں کی طرح بہت زیادہ انتہا پسند ہوتی ہے جماعت کو اول تو کسی امر کے متعلق شک و شبہہ لاحق ہی نہیں ہوتا، لیکن جب کسی امر کے متعلق اس کے ذہن میں شک پیدا ہوتا ہے، تو نہایت قوت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، حالتِ انفرادی میں گو انسان کبھی کسی امر کا اقرار کرتا، اور کبھی کسی بات سے نفرت کا اظہار کرتا ہے، کبھی کسی بات کو مانتا اور کبھی کسی بات کے متعلق شک کرتا ہے، لیکن جماعت میں شامل ہو کر اسے جب کسی بات سے نفرت پیدا ہوتی ہے، تو نفرت حقد شدید، شک انکار شدید اور رغبت نفرت کی صورت اختیار کر لیتی ہے،

یوں تو تمام جماعتیں مبالغہ پسند اور انتہا پسند ہوتی ہیں، لیکن خصوصیت سے یہ وصف ان جماعتوں میں زیادہ نمایاں نظر آتا ہے، جن کی ترکیب مختلف اصناف کے افراد سے ہوتی ہے، چونکہ ان جماعتوں میں توازنِ اعمال مفقود ہوتا ہے، اس لئے ان جماعتوں سے وہ اعمال سرزد ہوتے ہیں، جن کا صدور ایک فرد سے بالکل محال ہوتا ہے، کیونکہ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ نتیجۂ بد میں وہی اکیلا مبتلا نہ ہوگا، پھر جماعت جس قدر زیادہ افراد سے مرکب ہوتی ہے اسی قدر اس میں یہ اعتقاد شدومد سے پیدا ہوتا ہے، یہاں آکر بزدل، نامرد، جاہل، اور حاسد اپنے اپنے انحطاط اور ضعف کو فراموش کرکے ایک وقتی خیال کی بنا پر وحشی اور خوفناک بن جاتے ہیں،

لیکن بد قسمتی یہ ہے کہ جماعت کا غلو مشاعر عموماً بد اخلاقی میں زیادہ نمایاں ہوتا ہے، اور یہی وصف (یعنی بد اخلاقی) ہے جو ابتدائی زمانہ کے لوگوں نے اپنے اجداد سے ورثہ میں پایا ہے یہی بد اخلاقی کے مشاعر ہیں جن کو افراد حالت انفرادی میں عقاب اور سزا کے خوف سے اپنے ذہنوں سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن جماعت میں اگر اسی قسم کے مشاعر کا زیادہ زور ہوتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ بُرے سے بُرے کام اور بد اخلاقی کی جانب جماعت کو مائل کرنا زیادہ آسان ہوتا ہے،

لیکن اگر ہوشیاری کے ساتھ اس کی قیادت کی جائے، تو اکثر ان سے عمدہ اور بہترین افعال بھی سرزد ہوتے ہیں، بلکہ عظائم اعمال کے انجام دینے کی صلاحیت اس میں افراد سے کچھ زیادہ ہی زیادہ پائی جاتی ہے، ہم عنقریب اس مسئلہ کے متعلق اس مقام پر بحث کریں گے جہاں جماعت کے اخلاق کا ذکر آئے گا،

چونکہ جماعت اپنے مشاعر و احساسات میں حد درجہ مبالغہ پسند ہوتی ہے، اس لئے اس پر انہی مشاعر و احساسات کا اثر ہوتا ہے، جو مبالغہ سے پر اور حدِ اعتدال سے متجاوز ہوں اور اسی لئے خطبا رجو قوم کے قلوب کو اپنی جانب مائل کرتے ہیں، ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے غیر معتدل اور مبالغہ آمیز تاکیدات اور تمثیل بیانی کے ذریعہ سے جماعت کے جذبات کو مشتعل کر دیں، کیونکہ جماعت کے جذبات میں اگر اشتعال پیدا کیا جا سکتا ہے، تو صرف اسی ذریعہ سے کہ مبالغہ آمیز تاکیدات کا استعمال کیا جائے اور عقلی استدلالات سے کسی بات کے ثابت کرنے کی کوشش نہ کی جائے، یہی اور صرف یہی ذرائع ہیں جن سے خطبا جماعت کے جذبات کو مشتعل کر سکتے ہیں،

لیکن جماعت کے جذبات کو مشتعل کرنا تو ایک طرف جماعت اپنی مبالغہ پسندی کی وجہ

سے خود رہنماؤں اور قوا دستے بھی اس بات کی منتظر و متوقع رہتی ہے، کہ ان سے بھی جماعت ہی کے ایسے افعال صادر ہوں، نیز یہ کہ ان کے القاب مفخم اور ان کے معنوی اور صوری فضائل میں زور اور عظمت ہو، اسی کا نتیجہ ہے، کہ جماعت تھیٹر اسٹیج پر ناٹکوں کے ہیروز (ابطال) کی بابت شجاعت اور ایسے محاسنِ اخلاق کی متوقع رہتی ہے، جو ابتک عالمِ وجود میں نہ آئے ہوں،

لیکن اکثر لوگ جماعت کے اس جذبہ اور میلان کو جس کا اظہار جماعت سے تھیٹر ہال میں ہوتا ہے، تھیٹر کے اُن خصوصیات کی جانب منسوب کرتے ہیں جن کی وجہ سے تماشہ بینوں میں یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے، بلاشبہہ اسٹیج کی تنظیم و ترتیب بھی ایک مخصوص فن ہے، جس کے آئین وضوابط مرتب ہیں، تاہم وہ ایسے قواعد ہیں، جو ذوقِ سلیم اور قوانینِ منطقیہ سے جوڑ نہیں کھاتے، اور واقعہ یہ ہے کہ گو فنِ خطابت عام لوگوں میں بہت انحطاط پذیر اور گرا ہوا ہے، لیکن جماعت کو مخاطب کرنا کوئی معمولی فن نہیں ہے، اس کے لئے بھی مخصوص اوصاف کی ضرورت ہوتی ہے، اکثر انسان جب کسی ڈرامہ کو اٹھا کر دیکھتا ہے تو اس کی مقبولیت کو دیکھکر حیرت میں آجاتا ہے، یہاں تک کہ تھیٹر کے منیجر بھی جن کی خدمت میں یہ ڈرامے پیش کئے جاتے ہیں، خود ان کی مقبولیت کے بابت سوچ میں پڑجاتے ہیں، یہ بات ہوتی ہے، کہ یہ لوگ خود ڈراموں کی بابت کوئی حکم نہیں لگا سکتے، تاوقتیکہ یہ ڈرامے تماشہ بینوں کی ایک جماعت کے سامنے کئے نہ جائیں،[1]

---

[1] مذکورہ بالا بیان سے ہمیں اس بات کا سبب بھی معلوم ہوتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ بعض اوقات تقریباً تمام تھیٹر کی کمپنیاں جس ڈرامے کے کھیلنے سے انکار کر جاتی ہیں، وہی ڈراما پھر کچھ عرصہ کے بعد جب کھیلا جاتا ہے، تو مقبولیت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے، موسیو کوبی کے ڈرامے تاج و تخت کی قدردانی کی مقبولیتِ عام سے ہر شخص واقف ہے، باوجودیکہ دس سال تک تمام تھیٹر کمپنیاں اس کے کھیلنے سے انکار کرتی رہیں، اور باوجودیکہ اس کے مصنف کی ادبی قابلیت ہر شخص پر روشن تھی، یہی حال دوسرے (باقی صفحہ ۳ پر)

اگر اس بحث پر گفتگو کرنے کا موقع ہوتا تو میں قومی اخلاق و عادات کی شدّتِ تاثیر کے بابت بھی بہت تفصیل سے گفتگو کرتا، جماعت کے جذبات و احساسات میں قومی اخلاق و حسیات کو جو اہمیت حاصل ہے، اس کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ بعض اوقات اگر ایک ڈرامے کو کسی شہر میں مقبولیت حاصل ہو جاتی ہے تو وہی ڈراما جب دوسرے شہر میں کھیلا جاتا ہے، تو اس کی جانب کوئی توجہ بھی نہیں کرتا، اس کا سبب یہی ہوتا ہے کہ چونکہ قومی عادات و حسیات کو جماعت کے جذبات و حسیات میں بہت بڑا دخل ہوتا ہے، اس بنا پر دوسرے شہر میں جب یہ ڈراما کھیلا گیا، تو شاید حسیاتِ قومی کے اختلاف کی وجہ سے وہ اس شہر کے تماشہ بینوں کے جذبات کو مشتعل کرنے کرنے میں جو اس کی کامیابی کا راز تھا، ناکام رہا، اور اس لئے اُسے کسی نے پسند نہ کیا،

اب آخر میں مجھے یہ بیان کرنے کی تو شاید حاجت نہ ہو گی، کہ جماعت کی مبالغہ پسندی کا اثر صرف اس کے مشاعر و احساسات تک محدود رہتا ہے، اور قوتِ عاقلہ تک متعدی نہیں ہوتا، اسلئے کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ افراد کی قوتِ عاقلہ جماعت میں شامل ہو کر بہت جلد

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۱) ڈرامے لا مارین دی شارل کا بھی ہوا، ایک بار تمام کمپنیوں نے اس کے کھیلنے سے انکار کر دیا تھا، لیکن پھر جب ایک ایجنٹ نے زرِ کثیر خرچ کر کے اس کا ساز و سامان مکمل کیا، تو پھر وہ ایسا مقبول ہوا، کہ تقریباً دو سو بار فرانس میں اور ہزار سے زیادہ مرتبہ لندن میں کھیلا گیا، اگر ہم نے پہلے یہ نہ بیان کر دیا ہوتا، کہ تھیٹر کمپنیوں کے منیجروں کی نظر تماشہ بینوں پر پڑتی رہتی ہے تو اس بات کا سبب آسانی سے سمجھ میں نہ آسکتا، کہ بعض اوقات تھیٹر کی کمپنیاں کسی ڈرامے کے کھیلنے سے پہلے ہی سے کیوں انکار کر دیتی ہیں، اور اتنی فاش غلطی ان سے کس طرح سرزد ہوتی ہے، حالانکہ وہ ادبیات کے بڑے ماہر ہوتے ہیں، اور پھر ڈراموں کے ایکٹ کرنے میں ان کے بہت سے مقاصد بھی مضمر ہوتے ہیں، جس کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیئے تھا کہ وہ اس قسم کے احکام لگانے میں عجلت نہ کرتے، اس عنوان پر میں مکمل بحث نہیں کر سکتا، کیونکہ اس موضوع پر صرف وہ شخص بحث کر سکتا ہے جو موسیو گوبی کی طرح نفسیات اور ایکٹنگ دونوں فنون میں مہارت رکھتا ہو، (مؤلف)

انحطاط پذیر ہو جاتی ہے، اور اسی باعث افراد اپنی قوت عاقلہ سے کسی طرح کا کام نہیں لے سکتے اور اب ان کے افعال پر صرف ان کے جذبات و احساسات کا اثر پڑتا ہے، (یہ بات ایک بہت بڑے فاضل جج موسیو تارڈ کے تجربہ میں آئی ہے، جب کہ وہ جماعت کے مجرمانہ افعال کی تفتیش و تحقیق کر رہے تھے) اور یہی وجہ ہوتی ہے کہ جماعت ہمیشہ مشاعر و احساسات ہی کے دائرہ میں رہ کر ترقی یا تنزل اختیار کرتی ہے،

(۴)

جماعت کی قدامت پسندی و تعصب

ہم بیان کر چکے ہیں کہ جماعت کے مشاعر و احساسات میں ہمیشہ سادہ لوحی، اور انتہا پسندی کا اثر بہت زیادہ ہوتا ہے، اسی بنا پر جماعت کو جو عقائد یا خیالات تلقین کئے جاتے ہیں، ان کو یا تو وہ بالکل تسلیم کر لیتی ہے، یا سرے سے ان کا انکار کر دیتی ہے، انکار و اقرار کے متضاد پہلوے یا تردد و شک کے آثار جو اکثر انفرادی حالت میں نظر آتے ہیں جماعت میں ان کا پایا جانا محال ہے، یہ حقیقت کسی شہادت کی محتاج نہیں ہر شخص جانتا ہے کہ دینی معتقدات اپنے مخالف پہلو کے ابطال میں کس قدر زور دار اور قلوب پر غلبہ حاصل کرنے میں کس قدر طاقتور ہوتے ہیں،

لیکن چونکہ کسی امر کی حقیقت یا بطلان اعتقاد کی بابت جماعت کے سامنے باب شک مسدود ہو جاتا ہے، اور اس کے ساتھ ہی جماعت اپنی طاقت و قوت کے متعلق شعور تام رکھتی ہے، اس لئے اظہار تعصب کے ساتھ ساتھ اس کا تسلط اور غلبہ بھی اس قدر قوت پکڑ جاتا ہے کہ اُسے کسی قسم کے مناظرہ یا بحث مباحثہ کی تاب نہیں رہتی، افراد مناظرہ اور مجادلہ کی

یاقت رکھتے ہیں، لیکن یہ عادت نہ صرف یہ کہ ہمیشہ مناظرہ کے وقت سر انداز ہو جاتی ہے، بلکہ غیظ و غضب کا اظہار کرنے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی خطیب کسی مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے مباحثہ یا مناظرہ شروع کرنا چاہتا ہے تو سامعین کی جانب سے فوراً اس پر طعن و تشنیع شروع ہو جاتی ہے، اور سب و شتم اور غصہ کی آوازیں بلند ہونا شروع ہوتی ہیں، پھر اگر وہ اس پر اور مصر ہوتا ہے تو بلا کسی تاخیر کے مستوجب عذاب ہو جاتا ہے، اور اگر اس مجمع کو پولیس کا خوف نہ ہوتا تو شاید وہ اس کے قتل کرنے میں بھی دریغ نہ کرتے،

متعصبانہ جوش اور تسلط حاصل کرنے کا شوق، گو یہ دونوں اوصاف جماعت میں یکساں پائے جاتے ہیں، لیکن قومی اخلاق و عادات کا اثر جس طرح جماعت کے دیگر اوصاف میں ہمیشہ نمایاں رہتا ہے، اسی طرح قومی اخلاق و عادات کے اختلاف کی بنا پر ہر قوم میں یہ دونوں اوصاف بھی اپنے مختلف درجے کے نظر آتے ہیں، اور قوموں کے یہ اوصاف بھی دیگر اوصاف کی طرح موروثی مؤثرات کے تابع اور زیر اثر رہتے ہیں، لاطینی جماعتوں میں یہ دونوں جذبے اپنے موروثی مؤثرات کے ماتحت اس قدر اعلیٰ مرتبہ کمال پر پہنچ گئے ہیں کہ افراد کی روح استقلال جو انگلوسیکسن قوم کا ایک ممتاز خاصہ ہے، قوم کے شوقِ تسلط کے آگے بالکل پژمردہ ہو گئی ہے، یہاں تک کہ اب لاطینی جماعتیں افراد کے استقلال کو برقرار رکھنے کے بجائے صرف جماعت ہی کے مجموعی استقلال کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتی ہیں، اور چونکہ استقلال کی اس نوع کا ایک اہم اور ممتاز خاصہ یہ ہوتا ہے، کہ قوموں میں اپنی مخالف رائے کے فنا کرنے اور اپنی مخالف جماعت کو بجبر اپنے موافق بنانے کا جذبہ اور میلان پیدا ہو جاتا ہے، اس لئے حریت و استقلال کی یہی صنف ہے، جسے عموماً ہر زمانہ میں مخصوص خیالات کے جنبہ داروں اور معتقدوں نے دنیا میں رواج دینے کی کوشش کی ہے، لاطینی قوموں میں

جب محکمۂ انکویزیشن (محکمۂ تفتیشِ جرائم) قائم ہوا تھا اُس وقت سے لے کر ابتک ہمیشہ یہ قومیں
لفظ حریت کا یہی مفہوم سمجھتی رہی ہیں اور ہمیشہ ان قوموں نے انفرادی استقلال کے بجائے
جماعت کے مجموعی استقلال کی پرستش کی ہے،

غرض شوقِ تسلط اور تعصب یہ دو باتیں ہیں جن سے جماعت خوب واقف ہوتی
ہے، اور بوقتِ ضرورت ان سے کام بھی لیتی ہے، جماعت کے نزدیک قوت و طاقت ہی
قابلِ احترام چیزیں ہیں، اس لئے وہ کبھی احسان سے متاثر نہیں ہوتی، کیونکہ اس کے نزدیک
احسان کرنا دراصل ضعف کی علامت ہے، اور اسی بنا پر وہ ان لوگوں کی قیادت قبول نہیں
کرتی، جو لینت اور نرمی کے خوگر ہوں، بلکہ ہمیشہ وہ جفاکاروں اور استبدادپسندوں کے
تابعِ فرمان رہتی ہے، جماعت نے ہمیشہ جفاکاروں اور ظالموں ہی کی یاد تازہ رکھنے کے
لئے ان کے اسٹیچو قائم کئے ہیں، اور جب کسی جفاکار کو اپنے پاؤں سے روندا ہے تو صرف
اس لئے کہ اس کا اقتدار گھٹ گیا تھا، غرضیکہ نفوسِ جماعت میں ہمیشہ جن لوگوں کے متعلق برتری
اور عظمت کا اعتقاد پیدا ہوتا ہے، وہ وہی لوگ ہوتے ہیں، جن کا دبدبہ قیصر کی طرح زبردست
ہوتا ہے، جن کی سطوت سے جماعتوں کے دلوں میں ہیبت طاری ہوتی ہے، اور جن کا رعب
لوگوں کو مغلوب کرلیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جماعت ہمیشہ اس تہیہ میں رہتی ہے کہ ادھر حکمراں
کی طاقت وقوت میں فرق آئے، اور اُدھر وہ فوراً علمِ بغاوت بلند کردے، اور وہ اگر جھکتی بھی
ہے تو اس کے سامنے جو مضبوطی سے اس پر اپنا اقتدار قائم کرلیتا ہے، اور جہاں اُسے کمزوری
لاحق ہوئی، بس فوراً جماعت اپنے مخصوص مشاعر کے ماتحت بجائے سرگرم اطاعت ہونے کے
مصروفِ پیکار، اور بجائے سرِ تسلیم خم کرنے کے مشغولِ کارزار ہوجاتی ہے،

غرض جماعت کا اصلی خاصہ یہ ہے کہ وہ بجز مخصوص حالتوں کے ہمیشہ اپنے رہنماؤں

کی مطیع وفرماں بردار رہے، لیکن نفس اجتماعی کے خصائص اور اُس کی حقیقت کے سمجھنے میں ان لوگوں نے سخت دھوکا کھایا ہے، جو یہ خیال کرتے ہیں کہ جماعت کی اصلی اسپرٹ انقلاب انگیزی اور شورہ پشتی ہے، اُن کو جس بات سے شبہہ لاحق ہوا وہ یہ ہے کہ اُنھوں نے دیکھا کہ جماعت حد سے زیادہ قسی القلب اور سنگ دل واقع ہوئی ہے، اس لئے اُنھوں نے خیال کیا کہ انقلاب انگیزی جماعت کی سرشت میں داخل ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جماعت سے شورہ پشتی کے زہریلے مادہ کا پھوٹ پڑنا، اعمالِ تخریب کا ظاہر ہونا محض وقتی ہوتا ہے، ورنہ جماعت سے زیادہ کوئی شے عواملِ وراثت اور آثار میراث پر قناعت کرنے والی نہیں پائی جاتی اور اسی لئے جماعت ہمیشہ اپنی قدیم حالت کے بنا ہنے اور برقرار رکھنے کی بے انتہا کوشش کرتی ہے، اگر اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے، تو وہ خود شورہ پشتی سے تنگ آجائے اور اطاعت وفرماں برداری کرنے لگے، دیکھو نپولین کے زیر قیادت جس جماعت نے ہنگامۂ محشر خیز برپا کیا تھا، وہ نپولین کے پنجہ سے زیادہ سخت ہاتھوں کی گرفت میں کیونکر آگئی، حالانکہ اُس سے زیادہ نشۂ جمہوریت میں بدمست اور آمادۂ پیکار کون جماعت ہو سکتی تھی، -

پس اگر ہمیں اس بات کا علم نہ ہو، کہ جماعت کا اصلی میلان ہمیشہ قدامت پرستی کے جانب ہوتا ہے، تو ہمیں دنیا کی تاریخ خصوصًا فانہ جنگیوں کی تاریخ کے سمجھنے میں سخت دقت پیش آئے، یہ بلا شبہہ صحیح ہے، اور واقعات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ جماعت کبھی کبھی اپنے مخصوص رسوم وآئین اور ضوابط کے اسمار اور اُن کی ظاہری صورتوں میں تغیر کر دیتی ہے، یہاں تک کہ سطحی نظر میں یہ معلوم ہونے لگتا ہے، کہ قومی آئین وضوابط میں انقلاب ہوگیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان اصول وضوابط کا اصلی عنصر اور خمیر، جو اقوام

کی مختلف ضروریات کے مطابق فن تو ورثہ حاصل ہوتا ہے۔ سماجیں کسی قسم کی تغیرات ہو اور پیہم انقلابات و حوادث کا اثر ہمیشہ ان رسوم و آئین کی ظاہری صورتوں ہی تک محدود رہتا ہے، حاصل یہ ہے کہ جذبۂ قدامت پرستی کو وحشی انسانوں کی طرح اقوام کے طریق کار میں بھی بہت بڑی اہمیت حاصل ہے، اور جماعت کبھی رشتۂ قدامت پرستی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتی، بلکہ تقلید اور قدامت پرستی کے نشہ میں وہ اس قدر مدہوش ہو جاتی ہے کہ ہر جدید شے کے ساتھ جو اُس کے احوالِ معیشت اور طرز بود و باش میں تغیر کرنا چاہے، اُسے تعصّب و عناد ہو جاتا ہے، موجودہ زمانہ کی طرح اگر کہیں جمہوریت کا تسلط اُس وقت بھی قوت پذیر ہو گیا ہوتا، جب میکانک دستکاریاں، کہربائی اور بھاپ کی انجنوں کی اختراعیں عمل میں آرہی تھیں تو یہ مخترعات یا تو کب کی ختم ہو گئی ہوتیں، اور یا اُن کی قیمت کا بازار جماعت میں انسانی خون سے بہت زیادہ اندازہ لگایا جاتا، اسے موجودہ تمدن کی خوش قسمتی تصور کرو کہ جماعت کا اقتدار اس وقت ترقی پذیر ہوا ہے، جب تمام بڑی بڑی علمی اور صنعتی اختراعات دنیا میں رواج پا چکی ہیں ورنہ ان کی کامیابی میں بے انتہا دقتیں حائل ہوتیں اور کسی طرح دنیا میں ان کا عام رواج نہ ہو سکتا،

(۵)

جماعت کے اخلاق

اگر ہم لفظ اخلاق سے صرف یہ مراد لیں کہ جن باتوں کو عام لوگ اچھی نگاہ سے دیکھتے ہیں، ان کو اختیار کرنا، اور نفس کو اس کی خواہش اور ذلیل باتوں سے روکنا تو اس معنی کے لحاظ سے بیشک جماعت نہایت بد خلق ہوتی ہے، لیکن ہم اگر اخلاق کے ضمن میں

یہ بات بھی داخل کر لیں، کہ وقتی طور پر بعض عمدہ باتیں اختیار کر لینا، مثلاً ایثار اور اخلاص وغیرہ، تو اس وقت ہم یہ کہہ سکیں گے، کہ جماعت خوش اخلاقی اور اعلیٰ اوصاف سے بھی مزین ہوتی ہے،

لیکن بعض ماہرینِ نفسیات نے جو جماعت پر صرف اس کی مجرمانہ حیثیت سے نگاہ ڈالتے ہیں، مطلقاً یہ حکم لگا دیا ہے کہ جماعت کے اخلاق ہمیشہ انحطاط پذیر ہوتے ہیں اس کا باعث صرف یہ ہے کہ اُنھوں نے جماعت کے اخلاق پر یک طرفہ نظر ڈالی ہے، یعنی اُنھوں نے صرف یہ دیکھ لیا، کہ وہ شر و فساد کی جانب زیادہ مائل ہوتی ہے، اور اسی بنا پر اُنھوں نے کہدیا کہ جماعت ہمیشہ بد اخلاق ہوتی ہے،

بلاشبہہ جماعت کے اخلاق کا زیادہ تر حصہ شر و فساد ہی پر مشتمل ہوتا ہے، لیکن بات یہ ہے کہ ادوارِ گذشتہ کی سخت مزاجی اور درشتی کا بچا کھچا اثر ہم میں سے ہر ایک کے قلب میں کچھ اس طرح پیوست ہو گیا ہے، کہ گو افراد تو بعض مصائب کے خوف سے اس اثر کے اشارہ پر کام کرنے سے دہشت کھاتے اور سمٹتے ہیں، لیکن جماعت کو تو مسئولیت اور باز پرس کا کچھ خوف نہیں ہوتا، اس لئے وہ علی الاعلان مسئولیت کے قیود سے محفوظ و مصئون رہ کر اسی گذشتہ طریق کار پر نہ صرف مائل ہوتی ہے، بلکہ اپنی خواہش کے مطابق مشغولِ کار ہونے پر اور شیر دل ہو جاتی ہے، دیکھو تو سہی وہ ان خلافِ انسانیت اعمال کے ارتکاب کرنے پر کس قدر جری ہے، کہ جب اسے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے اس کے اپنے ابنائے جنس نہیں ملتے، تو کس طرح وہ جانوروں کو مختلف ایذائیں دینے کی کوشش کرتی ہے، حقیقت میں جماعت کا جذبۂ ایذا رسانی اور صیادوں کا شوقِ صید و شکار دونوں یکساں اور متناسب جذبات ہیں،

اسے جب غصہ آتا ہے تو بلا جذبہ شفقت سے متاثر ہوئے، وہ اپنے ابنائے جنس کو چیرنے پھاڑنے لگتی ہے، اور یہ جس وقت مبتلائے جنون ہوتے ہیں، تو اپنے دوستوں کے مجمع کے ساتھ کس سنگدلی سے بے کس ہرن کا شکار کرتے ہیں، حالانکہ ایک فلسفی کی نگاہ میں دونوں کی وقعت ایک جنگلی بھیڑئیے سے کم نہیں،

غرض باوجودیکہ جماعتیں بعض اوقات قتل وغارت، آتش زنی، جرائم اور ہر قسم کے افعال شنیعہ کا ارتکاب کرگذرتی ہیں، لیکن ان میں مخلصانہ اعمال، ایثار، منافع ذاتی اور دیگر بہترین اعمال کے انجام دینے کی بھی صلاحیت افراد سے زیادہ ہی زیادہ پائی جاتی ہے، بلکہ جماعت کو جب کبھی دین یا وطن کی خاطر قربانی کرنے کے لئے دعوت دی گئی ہے تو وہ نہایت ذوق وشوق کے ساتھ اس پر آمادہ ہوگئی ہے، تاریخ کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ افراد نے نہیں بلکہ جماعت ہی نے ہمیشہ نزاہت، اخلاصِ عمل اور عظائم اعمال کی مسلم الثبوت مثالیں پیش کی ہیں، کتنی جماعتیں تھیں، جنھوں نے اپنی جانوں اور روحوں کو محض ان معتقدات کی خاطر جو انھیں تلقین کئے گئے تھے، موت کا شکار بنادیا! بڑی بڑی جماعتوں کو جانے دو، چھوٹی چھوٹی جماعتیں بھی جو اعتصاب اور اسٹرائیک کے ذریعہ سے مظاہرہ کرتی ہیں، تو اُن کا یہ مظاہرہ اس غرض سے نہیں ہوتا کہ اُن کی قلیل اجرت میں جو اُن کے لئے ناکافی ہوتی ہے، اضافہ کردیا جائے، بلکہ ان کا یہ مظاہرہ اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ انھیں کہیں سے اس ایثار اور قربانی کی جانب دعوت دی گئی ہے، جو اُن کے مظاہرہ کی روحِ رواں ہے، مصلحت ذاتی کا خیال گو افراد کے لئے تہییج وتحریک کا باعث ہوتا ہو، لیکن جماعتیں کبھی اس خیال کی بناء پر نہ مشغولِ پیکار ہوئی ہیں، اور نہ آسانی سے اُنھیں اس پر آمادہ کیا جاسکتا ہے

تا وقتیکہ انھیں مقصد حقیقی سے آگاہ نہ کیا جائے۔

جماعت کی خوش اخلاقی اور سلامت روی کا یہ حال ہے کہ بعض اوقات کمینوں اور اوباشوں کی شمولیت سے بھی کوئی نقصان نہیں ہوتا، بلکہ ان کی شمولیت بعض اوقات جماعت کے محاسنِ اخلاق کو اور چمکا دیا کرتی ہے، موسیو ٹائن نے ماہ ستمبر کی شورہ پشت جماعت کے متعلق لکھا ہے کہ اُس نے جتنا مالِ غنیمت لوٹا تھا، وہ سب جماعت کے سامنے لاکر رکھ دیا، حالانکہ وہ مال قیمتی اشیاء پر مشتمل تھا، اسی طرح جس جماعت نے قصر ٹولیری پر ۱۸۴۸ء کی بغاوت کے دوران میں حملہ کیا ہے اس کے متعلق بھی تاریخ میں مذکور ہے، کہ اس نے بھی قصر کی کسی نفیس شے کو ہاتھ نہیں لگایا، حالانکہ قصر میں بہت کچھ تھا، اور وہ جماعت غصہ میں بیتاب ہو رہی تھی، جماعت کی خوش خلقی بعض اوقات اس قدر ترقی کر جاتی ہے، کہ وہ جماعتیں بھی جو اوباشوں سے مرکب ہوتی ہیں، اکثر خلافِ تہذیب منظر کو دیکھ کر یا ناشایستہ الفاظ کو سُن کر اپنے آپے میں نہیں رہتیں،

پس مذکورۂ بالا بیان سے ظاہر ہوا کہ جس طرح جماعتوں سے قبیح اعمال سرزد ہوتے ہیں، اسی طرح جماعتیں اپنے اعمال سے بعض اوقات محاسنِ اخلاق کے نمونے بھی پیش کرتی ہیں، اور اس قسم کی مثالیں دو ایک نہیں بلکہ اگر یہ کہنا صحیح ہے کہ ایک خیالی اور وہمی محورِ نظر کے خاطر قربانی کرنے کے لئے اخلاصِ مطلق اور ایثار کی سخت ضرورت ہوتی ہے، تو پھر یہ بھی صحیح ہوگا کہ عقلاے زمانہ سے زیادہ جماعتیں ہمیشہ قربانی کی اس قسم کی مثالیں پیش کرتی رہی ہیں، گو ان

بہرحال ان کا ظہور جماعتوں سے قصداً نہ ہوتا ہو، لیکن قصد و ارادہ کو ہمارے دعوی سے کوئی لگاؤ نہیں، علاوہ بریں اگر سچ پوچھو، تو واقعہ یہ ہے کہ جماعت سے غیر ارادی اعمال جو صادر ہوتے ہیں، اُن کی شکایت ہمیں نہیں کرنا چاہئے، اس لئے کہ اگر جماعتیں کہیں اپنی عقل سے کام لینے لگیں اور اپنے منافع کا انہیں احساس پیدا ہو جائے، تو تمدن کا تختہ اُلٹ جائے، اور عالم میں سراسیمگی اور پراگندگی پھیل جائے،

فصل سوم

جماعت کے قوائے عقلی

قوت عقلی، قوت فکری، تخیل آرائی

۱۔ جماعت کی قوتِ فکری، جماعت کے اساسی اور طبعی افکار کا فرق، یہ بحث کہ ذہنِ جماعت میں متناقض فکروں کا اجتماع کیونکر ہوتا ہے۔ جماعت کسی خیال کو اس وقت تک جذب نہیں کر سکتی، تاوقتیکہ اپنے خیال کے مطابق اس میں تغیر نہیں کر لیتی ہے، جماعت پر کسی خیال کے اثر کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ خیال عقلی پہلو سے صحیح بھی ہو۔

۲۔ قوتِ عقلی، جماعت عقلی استدلال سے کبھی اثر پذیر نہیں ہوتی، جماعت کی قوتِ عقلی ہمیشہ انحطاط پذیر ہوتی ہے، جماعت کا عقلی استدلال ہمیشہ قیاسِ تمثیلی پر مبنی ہوتا ہے،

۳۔ تخیل آرائی، جماعت کا شدتِ تخیل، جماعت اپنے ذہن میں ایسی صورتیں اور اشباح پیدا کر لیتی ہے، جن کو اصلی واقعہ سے کوئی نسبت نہیں ہوتی، جو چیز جس قدر عجیب ہو گی اسی قدر جماعت پر زیادہ اثر کرے گی، اسی قسم کے کرامات اور بادر ہوا قصے ہر تمدن کی بنیاد ہوتے ہیں، جماعت کا تخیل ہمیشہ قوموں کے رجالِ سیاست کا دست بازو رہا ہے، کسی حادثہ سے جماعت کو اثر پذیر کرنے کے لئے اس کو جماعت کے سامنے کس رنگ میں پیش کرنا چاہئے،

(۱)

جماعت کی قوتِ فکری

ہم نے اگلی تصنیف میں نہایت تفصیل سے اس مسئلہ پر بحث کی تھی کہ قوموں کی ترقی میں افکار اور خیالات کا کتنا اثر ہوتا ہے، اور اس باب میں ان کی کیا اہمیت ہے، اور یہ بھی بیان کر دیا تھا کہ ہر تمدن کی بنا چند افکار اساسی پر ہوتی ہے جو تجدد اور تغیر کی صلاحیت نہیں رکھتے، نیز اس کی بھی تشریح کر دی تھی، کہ افکار و خیالات نفوسِ جماعت پر کیونکر تسلط حاصل کرتے ہیں، اور وہ کون سی طاقت ہوتی ہے جو نفوسِ جماعت پر اثر کرتے وقت اُن میں پیدا ہو جاتی ہے، پھر ہم نے اس کی بھی وضاحت کر دی تھی کہ بڑے بڑے سیاسی انقلابات اس وقت واقع ہوتے ہیں جب ان اساسی افکار و خیالات میں کوئی تغیر یا انقلاب ہو جاتا ہے، سابق تصنیف میں ہم ان تمام اُمور کی بخوبی وضاحت کر چکے ہیں، اس لئے ہم یہاں پر دوبارہ ان مضامین کا اعادہ نہ کریں گے، بلکہ نہایت اختصار کے ساتھ صرف یہ بتا دیں گے کہ اس قسم کے افکار اور خیالات جماعت کے ذہن میں جب پیدا ہوتے ہیں تو کیا صورت اختیار کرتے ہیں، اور ان افکار و خیالات کا جماعت پر کتنا اثر پڑتا ہے،

جماعت جن افکار و خیالات سے عموماً اثر پذیر ہوتی ہے، اُن کی دو قسمیں ہیں :۔

(۱) ایک وہ وقتی افکار و خیالات جو بعض وقتی حوادث اور واقعات کے اثر سے جماعت کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں، مثلاً کسی مذہب یا کسی ذات کے ساتھ غلو

اعتقاد وغیرہ،

۲۔ وہ اساسی اور غیر فرعی افکار و خیالات جو مخصوص ماحول اور وراثت وغیرہ کی بنا پر جماعت کے ذہن میں پیدا ہو کر رسوخ حاصل کرتے ہیں۔ ان اساسی اور غیر فرعی افکار کی مثال میں ہم زمانۂ قدیم کے معتقداتِ مذہبی اور زمانۂ حال کے جمہوری اور اجتماعی خیالات کو پیش کر سکتے ہیں، جو مخصوص ماحول اور مخصوص وراثت کے نتائج ہیں،

اساسی افکار و خیالات کی حالت اُس پانی کی سی ہوتی ہے، جو دریا میں سکون کے ساتھ بہتا رہتا ہے اور فرعی افکار اُن چھوٹی چھوٹی موجوں کے مثل ہوتے ہیں جو دریا کے پانی کو تھپیڑے دے دے کر پیدا ہوتی اور مٹتی رہتی ہیں، اور جو باوجود اپنی قلت وضعف کے آنکھ کے سامنے خود دریا سے زیادہ نمایاں ہوتی ہیں،

اب اس زمانہ میں وہ تمام اساسی افکار و خیالات جو ہمارے اجداد کے دستور العمل تھے، درجہ بدرجہ مضمحل ہو ہو کر اپنے رسوخ اور قوت کو برباد کر رہے ہیں، اور اُن کے زوال کے ساتھ اس نظام معاشرت اور نظام حکومت کی بنیادیں بھی ہل گئی ہیں، جو ان اساسی افکار وعقائد پر مبنی تھے، اور اُن کی جگہ پر ہر روز نئے نئے خیالات اور عقائد پیدا ہوتے جاتے ہیں جنہیں نشو ونما کی صلاحیت ہم کو بہت کم نظر آتی ہے، تاہم انہی پر جماعت کے مستقبل کا مدار ہے،

پھر وہ افکار و خیالات جو جماعت کو تلقین کئے جاتے ہیں، اُس وقت تک کوئی نتیجہ خیز رسوخ نفوسِ جماعت میں نہیں پیدا کر سکتے۔ تاوقتیکہ ان کو ایک دلفریب اور سادہ شکل میں نہ پیش کیا جائے، اور یہ صرف اسی صورت سے ہو سکتا ہے کہ جماعت کو جن خیالات کی تلقین کی جا رہی ہے ان کی حقیقت تصاویر و اشباح یا تشبیہ و استعارات کے ذریعہ سے اس کو سمجھائی جائے تاکہ وہ ذہن میں خوب پیوست ہو جائیں، پھر جب ان خیالی تصاویر کے ذریعہ

سے کوئی حقیقت جماعت کے ذہن نشین ہو جاتی ہے، تو باوجود یکہ ان ذہنی اشباح اور خیالی تمثیلات وتشبیہات میں کوئی باہمی تعلق ایسا نہیں ہوتا کہ ایک خیالی تصویر کے ذریعہ سے دوسری خیالی تصویر کی جانب ذہن کا انتقال ہو سکے، لیکن جماعت کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اس کے ذہن کو ایک خیالی تصویر سے دوسری خیالی تصویر کی جانب نہ صرف انتقال ہوتا ہے بلکہ وہ ان مختلف اور متناقض تصاویر سے اثر پذیر بھی ہوتی ہے، اور یہی بات ہے کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جماعتیں ان متضاد اور متناقض ذہنی تصاویر سے اثر پذیر ہو کر متضاد اور متناقض افعال کا ارتکاب کرنے لگتی ہیں،

لیکن جماعت کے افعال و اعتقادات میں جو تناقض پایا جاتا ہے، وہ صرف جماعت ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ اس قسم کا تناقض اکثر افراد کے اعمال و اعتقاد میں بھی نظر آتا ہے میں وحشی انسانوں کے متعلق نہیں کہتا: اُن کے اعمال و اعتقادات میں اگر تناقض پایا جائے تو محلِ تعجب نہیں ہے، مجھے تو اس تناقض وتضاد کا مشاہدہ اکثر ان ہندوستانی روشن خیال لوگوں کے اعتقادات میں بھی ہوا ہے، جنھوں نے ہمارے یوروپین مدارس میں تعلیم پائی ہے ان لوگوں کے خیالات میں میں نے یہ عجیب تناقض پایا کہ گو ہماری تربیت کے اثر سے ان کے موروثی اعتقادات پر اجنبی افکار نے غلبہ حاصل کر لیا ہے، لیکن ان کے موروثی اعتقادات کا استیصال نہیں ہوا ہی یہی تناقضِ خیالات ہے، جس کی وجہ سے گو بعض اوقات ہم افراد کو متضاد اعمال کا ارتکاب کرتے ہوئے تو پاتے ہیں، لیکن میرا خیال یہ ہے کہ افراد کے خیالات کے اندر اختلاف کی خلیج خواہ کتنی ہی وسیع ہو جائے، اس عملی تناقض کا اثر کبھی ظاہر سے تجاوز نہیں کرتا، بات یہ ہے کہ افراد سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں، ان کا مصدر حقیقی اور منبع اصلی صرف اُن کے موروثی خیالات ہوتے ہیں، اور اسی بنا پر افراد کے اعمال میں حقیقی

تناقض صرف اس وقت نمودار ہوتا ہے، جب دو موروثی طاقتیں باہم متصادم ہوتی ہیں میں اس مسئلہ پر طویل گفتگو کرنا نہیں چاہتا، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے خیال میں اس حقیقت کا مشاہدہ کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ مختلف ممالک میں سیر و سیاحت کر کے قوموں کے موروثی اخلاق و عادات سے واقفیتِ تامہ حاصل کیجائے۔

پھر جماعت میں کسی خیال کے پھیلانے کے لئے صرف اتنا ہی ضروری نہیں ہوتا کہ اسکی حقیقت کو ذہنی تصاویر اور تشبیہات کے ذریعہ سے جماعت کے ذہن نشین کرایا جائے، بلکہ جماعت میں کسی فکر و خیال کو اُس وقت تک مقبولیت حاصل نہیں ہوتی تا وقتیکہ ترمیم و تغیر کر کے اس کو ذہنِ جماعت کے قریب نہ کر دیا جائے اس اصول کا مشاہدہ فلسفیانہ اور علمی خیالات میں آسانی سے ہو سکتا ہے، دیکھو کسی علمی خیال کو مقبولیت کا جامہ پہنانے کے لئے اس میں کتنا تغیر کرنا پڑتا ہے، اور سرتاسر اسے جماعت کے مزاجِ عقلی کے مطابق بنانا پڑتا ہے، اور گو یہ ترمیم و تنسیخ مختلف اقوام کی حالت کے اعتبار سے عمل میں لائی جاتی ہے تاہم اس کا قدر مشترک یہ ہوتا ہے کہ خیالات کی سادگی اور سطحیت کا جامہ پہن لیں، یہی سبب ہے کہ جب ہم اجتماعی نظر سے خیالات و افکار کو دیکھتے ہیں تو ان میں بلحاظ بلندی و پستی ہمیں کوئی فرق نظر نہیں آتا، کیونکہ اب وہ جیسے ہی ذہنِ جماعت میں پیوست ہوئے اُن کی عظمت تشریف لے گئی، اب اگر اُن کی کوئی حیثیت رہ گئی ہے، تو صرف یہ کہ جماعت پر اُن کا کس قدر اثر پڑتا ہے،

علاوہ بریں اجتماعی نقطۂ نظر سے تو کسی فکر و خیال کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، اجتماعی نقطۂ نظر سے جس بات کو اہمیت ہے، وہ صرف یہ ہے کہ جماعت میں کسی فکر و خیال کے اشاعت پذیر ہونے سے اس جماعت کی حالت پر کیا اور کتنا اثر پڑتا ہے، ذرا دیکھو کہ قرونِ وسطیٰ میں مذہبی معتقدات کو کس قدر اہمیت حاصل تھی، اور زمانۂ حال میں جمہوری اور اجتماعی خیالات کس درجہ پر

اور مافوق البحث خیال کئے جاتے ہیں، حالانکہ فلسفہ ان تمام خیالات کی انتہائی تغلیط کرتا ہے اور باوجود اس کے زمانۂ گذشتہ میں تو خیر ان خیالات کو جو اہمیت تھی، وہ تھی، اب بھی ان کا اثر ترقی پر ہے، اور آیندہ بھی ایک عرصہ تک حکومتوں اور قوموں کی حیات و ممات میں انہی خیالات کی تہیج و تحریک کو بڑا دخل رہے گا،

لیکن اب فرض کرو کہ ہم نے کسی فکر و خیال میں اقوام کے نفسانی حالات کے مطابق تغیر بھی کر لیا، اور جماعت میں اس فکر و خیال کی اشاعت بھی ہو گئی، لیکن اب بھی اس فکر و خیال کا اثر جماعت پر اُس وقت تک نہیں ہو سکتا، تاوقتیکہ وہ جماعت کے ذہن میں پیوست ہو کر مقتضیاتِ فکری اور احساساتِ غیر شعوری کی صف میں داخل نہ ہو جائے، اور اس کے لئے تو ظاہر ہی کہ ایک طویل مدت درکار ہوتی ہے،

غرض جماعت میں کسی فکر و خیال کے اشاعت پذیر ہونے کے لئے پہلے اس فکر و خیال کو مختلف مدارج طے کرنا ہوتے ہیں، اس کے بعد پھر کہیں جا کر وہ جماعت میں اشاعت پذیر ہوتا ہے، پس اب ناظرین کے ذہن میں یہ شبہہ نہ گذرے کہ جب کسی فکر و خیال کی صحت کا حسن معلوم ہو گیا تو کوئی وجہ نہیں کہ جماعت میں یہ خیال اشاعت پذیر نہ ہو اور جماعت اس کا اثر نہ قبول کرے کیونکہ جماعت تو ایک طرف خود افراد کی یہ حالت ہوتی ہی کہ وہ خیال جس کی اشاعت کیجا رہی ہے اُس کی صحت و واقعیت کا حال معلوم کرنے کے بعد اگر سامعین روشنخیال ہوئے تو وہ گو اسکی صداقت کا اعتراف کر لیتے ہیں، لیکن چونکہ افراد پر اُن کے موروثی خیالات کا بڑا اثر ہوتا ہی، اسلئے تھوڑے عرصہ کے بعد اُن کا قدیم اعتقاد ان پر پھر غالب آجاتا ہے، اور اب اگر تم ان سے کچھ مدت کے بعد پھر ملو تو وہ تمہارے سامنے اپنا وہی پہلا خیال پھر ظاہر کریں گے، جس کے باطل کرنے کی تم ایکبار کوشش کر چکے ہو، وجہ یہ ہے کہ افراد ان افکار و خیالات کے پابند اور زیر فرمان ہوتے ہیں جو امتداد زمانہ

سے ان کے ذہنوں میں راسخ ہوگئے ہیں، اور انہی خیالات کا اثرات سے اعمال و افعال میں نمایاں رہتا ہے، پس جب افراد کی یہ حالت ہے تو جماعت کا کیا پوچھنا؟ وہ تو افراد سے زیادہ عوامل وراثت کی پرستار ہوتی ہے۔ اس کا اجنبی خیالات کو جذب و ہضم کرلینا تو نہایت دشوار ہے،

لیکن جب متعدد وسائل کی مدد سے کسی خیال کو نفوسِ جماعت میں رسوخ حاصل ہو جاتا ہے، تو پھر کوئی قوت اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتی، اور اس وقت جو واقعات ظاہر ہوتے ہیں اُن کی اطاعت اور فرماں برداری ناگزیر ہوتی ہے، فلسفیانہ خیالات جو انقلابِ فرانس کے باعث ہوئے تھے ایک مدت تک مختلف منازل طے کرتے رہے، اور اس کے بعد جب ان کو رسوخ حاصل ہوا تو ان خیالات سے اثر پذیر ہو کر تمام قوم کی قوم معاشرتی مساوات حاصل کرنے اور حریت کی عظیم الشان بنیادیں قائم کرنے کے لئے یکبارگی اٹھ کھڑی ہوئی، تمام تاج و تخت اُلٹ دیئے گئے، مغرب کا طبقہ زیر و زبر کر دیا گیا، اور بیس سال کی مدت تک ایک ایسی ہولناک جنگ کے شرارے ممالک یورپ کو خاک سیاہ کرتے رہے، جس کے خیال تک سے تیمور لنگ اور چنگیز خاں کو لرزہ آتا ہوگا۔ ایک ایسا ہولناک منظر جو ہمارے دائرۂ تصور سے باہر ہے،

لیکن جس طرح نفوسِ جماعت میں کسی فکر و خیال کو ایک مدتِ دراز میں مختلف منازل طے کرنے کے بعد رسوخ حاصل ہوتا ہے، اسی طرح ذہنوں سے اس فکر کے ازالہ کے لئے بھی ایک مدت درکار ہوتی ہے، جو خیال ایک بار ذہنوں میں راسخ ہو جاتا ہے، اس کا ازالہ بھی اگر ہو سکتا ہے تو اسی صورت سے کہ جن ذرائع یا وسائل کی مدد سے اس خیال کو رسوخ حاصل ہوا تھا، اسی قسم کے قوی ذرائع اور عواملِ وراثت کی مدد سے اس خیال کو اپنی جگہ سے ہلایا جائے، یہی وجہ ہے کہ جن خیالات تک قوم کے اعلیٰ طبقہ اور علماء اور فلاسفہ کی رسائی پہلے سے ہو جاتی ہے، قوم کا

ادنیٰ طبقہ ان خیالات تک ایک مدت دراز کے بعد رسائی حاصل کرتا ہے، اور گو عموماً رجالِ سیاست اپنے زمانہ کے خیالاتِ اساسی کی خطا و صواب سے واقف ہوتے ہیں، لیکن چونکہ اُن کے پیشِ نظر یہ بات ہوتی ہے کہ یہ خیال قوم کے دماغوں میں رسوخ حاصل کر چکا ہے، اور قوم کی قیادت بلا اس خیال کی مراعات کئے ہوئے ناممکن ہے، اسلئے فرضِ قیادت انجام دینے کے لئے وہ ان اساسی خیالات کو چھوتے تک نہیں، گو وہ خود ان کی صحت کا اعتقاد نہ رکھتے ہوں،

(۴)

قوتِ عقلی

جماعت کی قوتِ عقلی کے متعلق گو مطلقاً یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جماعت میں قوتِ عقلی سر سے مفقود ہوتی ہے، یا جماعت عقلی استدلال سے بالکل اثر پذیر نہیں ہوتی، البتہ یہ ضرور ہے کہ جس قسم کے دلائل وہ کسی امر کی تائید میں قائم کرتی ہے، یا جن دلائل سے وہ اثر پذیر ہوتی ہے، وہ عموماً منطقی نگاہ سے گرے ہوئے ہوتے ہیں،

بلاشبہہ یہ انحطاط پذیر دلائل بھی جو جماعت کسی امر کی تائید میں قائم کرتی ہے صحیح دلائل و براہین کی طرح اشیار کی باہمی مماثلت پر مبنی ہوتے ہیں، لیکن اشیار کی یہ مماثلت جو جماعت کے ذہن میں آتی ہے، وہ اسقدر سطحی ہوتی ہے، کہ اس کی بنار پر جو قیاس قائم ہوتا ہے، علمی نگاہ میں اسکی کوئی قدر و منزلت نہیں ہوتی، جماعت کے استدلالات کی شان بالکل ویسی ہی ہوتی ہے جسطرح ایک اسکیمو اپنے اس تجربہ کی بنار پر کہ برف شفاف ہے، اور منہ میں جاکر پگھلتی ہے، یہ استدلال قائم کرتا ہے کہ چونکہ شیشہ بھی شفاف ہے اس لئے وہ بھی منہ میں جاکر پگھلے گا، یا جس طرح ایک وحشی یہ سمجھتا ہے کہ بہادر شخص کا کلیجہ چبانے سے ہم میں بھی بہادری پیدا ہو سکتی ہے، یا

جس طرح ایک مزدور کا قصہ ہے کہ اتفاق سے ایک پروفیسر نے اسکی مزدوری نہیں دی تو اُس نے صرف اسی واقعہ کی بنا پر یہ کلیہ قائم کر لیا کہ تمام پروفیسر حقوق غصب کر لیتے ہیں،

غرض جماعت کے قیاسات اور استدلالات کی شان ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر اُن دو چیزوں کے مابین رابطۂ اتحاد یا علاقۂ علیت پیدا کر لیتی ہے جن میں واقعۃً کوئی علاقہ اور رابطہ نہیں پایا جاتا، اس بنا پر اگر جماعت کے استدلالات کو کسی صنفِ استدلال میں داخل کیا جا سکتا ہے تو وہ استدلالِ تمثیلی ہے، اور چونکہ جماعت پر صرف اسی صنفِ استدلالات کا اثر پڑتا ہے، اسلئے وہ لوگ بھی جو جماعت کی قیادت کرتے ہیں، اسی قسم کے دلائل و براہین اس کے سامنے پیش کرتے ہیں، بخلاف منطقی دلائل کے کہ اوّل تو یہ دلائل اس کے فہم و ادراک سے بالاتر ہوتے ہیں، پھر اگر کسی طرح جماعت کو ان کا ادراک ہو بھی جائے تو وہ ان استدلالات سے ذرہ برابر اثر پذیر نہیں ہوتی، پس اگر ان وجوہ کی بنا پر یہ کہا جائے کہ جماعت کی قوتِ عقلی اور قوتِ استدلالی کمزور نہیں ہوتی ہے، تو بجا ہے، لیکن اکثر یہ ہوتا ہے کہ جب ہم ان خطبوں کو اٹھا کر دیکھتے ہیں، جو اپنی بے نظیر موثرانہ اور ساحرانہ طاقت کے لئے مشہور ہوتے ہیں تو ہم کو رکاکتیں اور نقائص دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے، کہ اس مجموعۂ خرافات نے بھلا جماعت پر کیا اثر ڈالا ہوگا، اس میں تو صدہا نقص ہیں، پھر کیا یہ ممکن ہے کہ ان نقائص کے باوجود جماعت اس سے اثر پذیر ہوئی ہو؟ لیکن بات یہ ہے کہ جماعت پر کسی خطبہ کا موثر ہونا، اور غیر معقول دلائل و براہین پر کسی خطبہ کا مشتمل ہونا، یہ دونوں علیحدہ علیحدہ باتیں ہیں، یہ کوئی ضروری نہیں کہ جس خطبہ سے جماعت اثر پذیر ہوتی ہے، وہ معقول دلائل و براہین پر بھی مشتمل ہو، بلکہ اکثر تو اس کے خلاف یہ ہوتا ہے کہ جو خطبہ اپنے اندر جس قدر زیادہ غیر معقول دلائل کا ذخیرہ مخفی رکھتا ہے، اسی قدر زیادہ اس کے مخفی اثر سے جماعت پر بے شعوری کی کیفیت طاری ہوتی ہے، خطبوں اور لکچروں کی غرض یہ نہیں ہوتی کہ علماء اُن کے مطالعہ سے محظوظ

ہوں، اور اپنے معلوماتِ عامہ میں ان کے ذریعہ سے اضافہ کریں، بلکہ ان کی غرض صرف یہ ہوتی ہے کہ جس طرح بن پڑے، مجمع پر اثر ڈال کر اس کو مدہوش کر دیا جائے، اگر خطیب اس میں کامیاب ہو گیا تو خواہ اس کے دلائل کتنے ہی غیر معقول ہوں اسکی غرض حاصل ہو گئی، اور اگر اب تم یہ چاہو کہ اس خطبہ کے مطالعہ سے وہی اثر اپنے میں پھر پیدا کر لو تو یہ ناممکن ہے، اب صدہا بار بھی اسکے پڑھنے سے وہ اثر نہ پیدا ہو گا جو خطیب نے خطبہ دیتے وقت پیدا کر دیا تھا،

پس جب تقریر بالا سے خوب یہ بات ذہن نشین ہو گئی کہ جماعت کی قوتِ استدلالی ضعیف ہوتی ہے، تو اب اس کے بعد مجھے یہ بتانے کی حاجت نہیں رہی، کہ جماعت حق و باطل اور غلط و صحیح کی تمیز کرنے سے بھی قاصر ہوتی ہے، اور جن افکار و خیالات کو وہ قبول کرتی ہے، وہ کسی واقعیت پر مبنی نہیں ہوتے بلکہ ان کا دار و مدار اپنی موثرانہ طاقت پر ہوتا ہے جو ان کے اندر مخفی ہوتی ہے، اور چونکہ جماعت کی قدرت سے یہ باہر ہے، کہ اپنے کسی ذاتی خیال کی بناء پر وہ کوئی خاص نتیجہ اخذ کرے، بالفاظ دیگر جماعت کا اپنا کوئی خاص خیال نہیں ہوتا، اسلئے عموماً وہ بعض خیالات کو نہایت آسانی کے ساتھ قبول کر لیا کرتی ہے،

(۳)

قوتِ تخیّل

جماعت میں ان وحشی انسانوں کی طرح جو غور و فکر کی صلاحیت نہیں رکھتے تخیل آرائی اور وہم پرستی کی قوت بہت زیادہ ہوتی ہے اور اس کے ذہن میں کسی واقعہ یا کسی ذات کی جو تصویر آتی ہے وہ اس سے اتنا اثر پذیر ہوتی ہے کہ اگر اس تصویر کے بجائے خود وہ شے اُس کی نظر کے سامنے آجائے تو شاید وہ اس سے اسقدر اثر پذیر نہ ہو جیسا کہ ہم بار بار بیان کر چکے ہیں جماعت

کی حالت مسمریزم کے معمول سے بہت کچھ مشابہ ہوتی ہے مسمریزم کے معمول کی طرح وہ کچھ دیر کے لئے فاقد العقل ہو کر اپنے ذہن کی اُن پیدا کردہ تصاویر و اشباح سے اثر قبول کرتی ہے جو ذرا سے غور و تامل میں غیر معقول اور مہمل ثابت ہو سکتی ہیں، لیکن چونکہ جماعت غور و فکر کی صلاحیت سے عاری ہوتی ہے، اسلئے اسکو یہ پتہ نہیں لگتا، کہ ان تصاویر و اشباح میں کونسی غیر معقولیت ہے، بلکہ اسکے خلاف جو ذہنی تصویر معقولیت سے جتنی زیادہ دور ہوتی ہے اس سے اسی قدر وہ زیادہ اثر پذیر ہوتی ہے،

یہی وجہ ہے کہ کسی واقعہ کے وہ حیثیات جن پر قصہ اور خرافات کا رنگ زیادہ چڑھا ہوتا ہے جماعت پر انہی کا زیادہ اثر ہوتا ہے، اگر ہم کسی تمدن کے عناصر کی دقیق تشریح کریں تو ہمیں نظر آئے کہ بے بنیاد قصوں اور بے معنی خرافات کا اس تمدن کے مظاہر پر کتنا اثر تھا، یہ کچھ تمدن کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ تاریخ کی بھی یہی حالت ہے، واقعات تاریخی میں بھی خیال کو واقعہ پر اور وہم کو حقیقت پر بڑا غلبہ ہوتا ہے،

لیکن چونکہ جماعت کسی بات کا ادراک ان ذہنی تصاویر کے بغیر نہیں کرسکتی، اسلئے اسکو متاثر اور مشتعل کرنے کا اگر کوئی ذریعہ ہو سکتا ہے، تو یہی ذہنی تصاویر ہیں، وعدہ وعید ترہیب و ترغیب، تحریض، تخویف، غرض اشتعال انگیزی کے تمام مظاہر کے مطابق جماعت اگر کاربند ہو سکتی ہے، تو اسی صورت سے کہ ذہنی تصاویر کے ذریعہ سے اسکو سبز باغ دکھایا جائے،

لیکن تخیل کو متاثر کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ تھیٹروں، ناٹکوں اور تماشوں کے ذریعہ سے کسی خیال کو مجسم شکل میں جماعت کے سامنے پیش کیا جائے یہ ایسا بہترین طریقہ ہے کہ افکار مجردہ جو جماعت کے فہم و ادراک سے باہر ہوتے ہیں، اس ذریعہ سے اُن کی تصویر جماعت کی آنکھوں میں پھر جاتی ہے، اور جماعت کو اس فکر و خیال کی حقیقت کا نہ صرف پورا اندازہ ہو جاتا ہے، بلکہ یہ مجسم تصاویر نفوس جماعت میں ایک عمیق اثر چھوڑ جاتی ہیں، رومن قوم نے جو دنیا کی تمام قوموں سے زیادہ نباض فطرت تھی اس اصول کو نہایت مرعی رکھا تھا کہ تھیٹر اسٹیج اسکی بزم تمدن کا زیب و زینت بن گیا تھا، اور امن و سعادت کا جلوہ اس کو

تھیٹر اسٹیج ہی پر نظر آنے لگا تھا، رومیوں کے بعد بھی یہ اصول ہمیشہ مہذب دنیا کے پیش نظر رہا، اور آج اس اصول کو جو ترقی دی گئی اسکو ہم خود اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں تخیل کو متاثر کرنے کا ذریعہ اس قدر کارگر ہوتا ہی کہ سارے کا سارا مجمع ان مناظر اور مجسم تصاویر سے ایکدم متاثر ہو جاتا ہے اور گو ناٹک کے پلاٹ کیجا بسے ناظرین کیتنی ہی بے لطفی کا اظہار کر رہے ہوں، مگر اس وقت تخیل کی بلند پروازی کا یہ عالم ہوتا ہی کہ بعض اوقات ناظرین اس خیالی دنیا کے واقعات و حوادث سے متاثر ہو کر بیخودی کے عالم میں رو پڑتے ہیں، اور کبھی یہ اثر اتنا ترقی کرتا ہی کہ لوگ غیر معمولی جذبات سے بے قابو ہو جاتے ہیں، اور ان سے بعض غیر معمولی افعال کا صدور ہونے لگتا ہی، ایک تھیٹریکل کمپنی ٹریجڈی کا پلاٹ اکثر کھیلتی تھی، اسکی بابت اکثر یہ سننے میں آیا ہی کہ جس ایکٹر نے "بدمعاش خائن" کا پاٹ کیا تھا، وہ جب تھیٹر ہال سے باہر آیا تو پولیس اسکو گھیرے ہوئے تھی، اس خوف سے کہ چونکہ اس نے ایک مجرم کا پارٹ کیا ہی، مبادا مجمع جوش غضب میں اس پر ٹوٹ پڑے، ناٹکوں اور تماشوں میں جماعت کی یہ اشتعال پذیری اس بات کو بتاتی ہی کہ جماعت کے قوائے عقلی کس قدر کمزور ہوتے ہیں اور جماعت کو مشتعل کر دینا کس قدر آسان ہے، غرض جماعت میں ایک بہت بڑا نقص یہ بھی ہی کہ وہ کسی واقعہ اور اسکی ذہنی تصویر کے باہمی فرق کا ادراک نہیں کر سکتی ہی، اور یہی اسکے ضعف عقلی اور اشتعال پذیری کی بنا رہے،

پس چونکہ جماعتیں اسوقت تک آمادۂ عمل نہیں ہوتیں، تا وقتیکہ مختلف ذرائع سے انکے تخیل کو بیدار نہ کیا جائے، اسلئے فاتحین اپنے اثر و غلبہ کی توسیع اور سلطنتیں اپنی قوت و سطوت کو ترقی دینے میں ہمیشہ جماعت کے تخیل سے کام لیتی رہی ہیں، اور قوموں کے تخیل ہی نے ہمیشہ روے زمین کا کایا پلٹ کیا ہی، بڑے بڑے تاریخی واقعات جو وقوع میں آئے ہیں، مثلاً بدھ مذہب کا ظہور، عیسائیت، اسلام اور پروٹسٹنٹ مذاہب کی ترویج یا گذشتہ زمانہ کے سیاسی انقلابات اور زمانۂ حال کے اشتراکی فرقے یہ سب واقعات ان مختلف تاثیرات کی قریب یا بعید مثالیں ہیں جو وقتاً فوقتاً انسانی تخیل پر اثر کرتی رہی ہیں،

یہی بات ہے کہ ہر زمانہ اور ہر قوم کے سیاست داں حتی کہ وہ لوگ بھی جو سب سے زیادہ استبداد پسند

ہوتے ہیں، اپنی اپنی قوموں کے تخیلات و اعتقادات کا ہمیشہ احترام کرتے ہیں، اور ان کے خلاف عمل پیرا ہونے سے گریز کرتے ہیں، انکے اندیشہ میں بھی کبھی یہ بات نہیں آتی کہ وہ ان اعتقادات کو پس پشت ڈال کر فرضِ قیادت انجام دیں اور اگر وہ ایسا کریں تو انکی ساری عزت خاک میں ملجائے نپولین نے ایک بار حکومت کی مجلسِ شوریٰ میں کہا تھا،

"تم جانتے ہو میں نے جنگ وِنڈین میں کب فتح حاصل کی، اُس وقت جب میں نے کیتھولک مذہب اختیار کرلیا، پھر مجھے مصر میں اسوقت کامیابی حاصل ہوئی جب میں نے جامع ازہر میں اپنے اسلام کا اعلان کیا اُسی طرح اٹلی میں اسوقت کامیاب ہوا جب میں عصمتِ پوپ کے مسئلہ کا قائل ہو گیا، اور اگر میرے زیر سایہ کوئی یہودی خاندان بھی آباد ہوتا، تو یقیناً میں عبادتگاہ سلیمان کی بھی جاروب کشی کرتا"

مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سکندر اعظم اور قیصر کے بعد سے ابتک عظماے رجال میں بجز نپولین کے کوئی ایسا شخص نہیں پیدا ہوا جو اعتقادات پر اثر ڈالتا، اور اس سے کام لینا جانتا ہو، نپولین کے فتوحات، اس کے خطبات، اس کے مکاتبات، غرض اس کے ہر ہر عمل سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ قلوبِ انسانی پر فتح حاصل کرنے کا مقصد ہمیشہ اپنے پیشِ نظر رکھتا تھا، یہاں تک کہ جب وہ بسترِ مرگ پر پڑا ہوا کروٹیں بدل رہا تھا، اُس وقت بھی یہی مقصد اس کے پیشِ نظر تھا،

جماعت کے اعتقاد و تخیل کو جن جن طریقوں سے متاثر کیا جا سکتا ہے ان کو تو ہم آگے چل کر بیان کریں گے، البتہ یہاں پر صرف اتنا بتا دینا ضروری ہے، کہ جماعت مؤثرات کے آگے کبھی دلائل و براہین کے چکر میں آکر سرِ تسلیم خم نہیں کرتی، دیکھو انٹونی جب تک محض اپنے ساحرانہ کلام اور خطیبانہ انداز کے ذریعہ سے مجمع پر اثر ڈالنے کی کوشش کرتا رہا، کامیاب نہ ہوا، لیکن اس نے جوں ہی مقتول قیصر کی وصیت کو جیب سے نکال کر پڑھنا شروع

کیا اور مجمع کے سامنے قیصر کی لاش کو رکھکر زخموں کے نشان دکھانا شروع کئے، بس فوراً ہی جماعت اس حیرت انگیز منتر سے مسحور ہو گئی،

غرض جماعت کے تخیل پر جس چیز کا اثر پڑتا ہے، وہ اس ذہنی تصویر کا جو ایک مبہم انداز سے حیرت انگیز معجزانہ رنگ میں ایک خوش آیند امید کے ساتھ یا عقاب کا خوف دلاکر جماعت کے سامنے پیش کی جاتی ہے، وہ سرتاسر راز ہی راز ہوتی ہے، لیکن باوجود اس کے جماعت کا رشتۂ امید اس سے منقطع نہیں ہوتا، یہی ذریعہ ہے جو مختلف زمانوں کے پیغمبرانِ مذاہب اور انسانی فطرت کے نبض شناسوں نے اختیار کیا ہے،

جماعت کے تخیل کی حالت یہ ہے کہ بعض اوقات صدہا مجرمانہ افعال کا جماعت کے تخیل پر اتنا اثر نہیں ہوتا جتنا ایک جرم کا ہوتا ہے، یا اکثر متعدد چھوٹے چھوٹے واقعات سے وہ جتنا اثر پذیر ہوتی ہے اتنا کسی ایک سخت واقعہ سے بھی نہیں ہوتی، وجہ یہ ہے کہ انبوہ کے دماغ پر کثرت وقلت یا ضعف وقوت کا اثر نہیں ہوتا، بلکہ اس کے دماغ پر کسی واقعہ کا اثر محض اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اس واقعہ کے اندر کوئی ندرت یا کوئی حیرت انگیز بات اس کو نظر آجاتی ہے جس سے وہ متاثر ہو جاتی ہے، مثال میں دیکھو ابھی کچھ سال ہوئے پیرس میں جب وبا پھیلی ہے، اور پانچہزار نفوس ایک ہفتہ کے اندر اندر راجل ہو گئے تو یہ جماعت کی نگاہ میں کتنی چھوٹی سی بات تھی، چونکہ لوگوں کو اس کا حال تھوڑا تھوڑا کر کے ان شمار و اعداد کے ذریعہ سے معلوم ہوتا تھا جو ہفتہ وار شائع ہوتے تھے، اس لئے ان کو اسکی چنداں پروا بھی نہیں ہوتی تھی، لیکن اگر اس کے بجائے کوئی ایسا حادثہ پیش آجاتا کہ ایک دن کے اندر اور ایک ہی شاہراہ پر بجائے پانچہزار آدمیوں کے صرف پانچسو جانوں کا نقصان ہو جاتا، یا مثلاً برج ایفل ایک دم آرہتا، تو دیکھئے کتنا شور وغل مچتا اور کتنا بڑا انقلاب ہو جاتا،

ایک مرتبہ بحر اٹلانٹک کے بیڑے کا ایک جہاز لاپتہ ہو گیا تھا، جب ایک عرصہ تک اس کا پتہ نہ لگا، تو عام طور پر یہ گمان غالب ہو گیا کہ یہ جہاز غرق ہو گیا، اس خیال کا اتنا سخت اثر ہوا کہ تقریباً آٹھ روز تک پبلک پر انتشار کی کیفیت طاری رہی، لیکن اس کے بعد ایک بار (۱۸۹۴ء میں) سرکاری اعداد میں جب یہ خبر شائع ہوئی کہ ۵۰۰ بادبانی کشتیاں اور ۲۰۳ دخانی جہاز ایک بارگی غرق ہو گئے اور جانوں اور غلہ کا جو نقصان ہوا وہ شمار میں نہیں آسکتا تو اس خبر پر لوگوں نے کچھ خیال بھی نہ کیا، حالانکہ یہ نقصان پہلے نقصان سے بہت زیادہ تھا،

اس سے معلوم ہوا کہ تخیل جماعت پر خود واقعات کا اثر نہیں پڑتا بلکہ جس بات کا اثر پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ فلاں واقعہ کس طرح وقوع پذیر ہوا، نیز کسی واقعہ کو اگر رنگ آمیزی کیساتھ اس طرح بیان کیا جائے کہ اس کی مجموعی کیفیت سن کر جماعت مرعوب ہو جائے تو یہ پیرایۂ ادا بھی جماعت پر بہت زیادہ اثر کرتا ہے، پس اگر جماعت کی قیادت کرنا چاہو تو سب سے زیادہ جماعت کو پہلے اشتعال پذیر کرنا سیکھو، اگر تمھیں یہ نہیں آتا تو جماعت کی قیادت بھی نہیں کر سکتے،

فصلِ چہارم

جماعت کے افعال پر مذہب کا اثر

مذہب سے کیا مراد ہے، جماعت جو مذہب قبول کرے، اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ کسی معبود کی عبادت اور پرستش پر مبنی ہو، شعور مذہبی کے خصائص، جماعت کے مذہبی اعتقادات کی قوت اور غلبہ، سابق بحث کی چند مثالیں، جماعت جن معبودوں کی پرستش کرتی ہے، وہ کبھی فنا نہیں ہوتے، بلکہ ہمیشہ نئی نئی صورتوں میں نمودار ہوتے ہیں، الحاد و دہریت کا دینی شکل میں کس طرح ظہور ہوتا ہے، تاریخی نقطۂ نظر سے مذہبی معتقدات کی کیا اہمیت ہے، یہ بحث کہ واقعۂ اصلاحِ مذہب، واقعۂ سینٹ بارتھولیمو، واقعۂ ہول ریئن آف ٹیرا اور تمام اسی قسم کے واقعات جماعتوں کے مذہبی مشاعر و احساسات کے نتائج ہوتے ہیں اور کبھی انکا ظہور افراد سے بالارادہ نہیں ہوتا۔"

ہم ابوابِ سابق میں بیان کر چکے ہیں کہ جماعت کی قوتِ عقلی نہایت ضعیف ہوتی ہے اسلئے جو خیالات اسکو تلقین کئے جاتے ہیں، اُن کو یا تو وہ بجنسہٖ قبول کر لیتی ہی، یا اُن کا سرے سے انکار کر دیتی ہے، نیز یہ کہ جو عوامل اسکی تہییج و تحریک کے باعث ہوتے ہیں اُن سے جماعت اثر پذیر ہوتے ہی آمادۂ عمل ہو جاتی ہے، اور اگر ہوشیاری کے ساتھ اسکو متاثر کیا جائے تو وہ اپنے پیشِ نظر مقصد کے خاطر قربانی کرنے پر بھی تل جاتی ہے، نیز ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ اسکو

اپنے معتقدات اور اپنے مشاعر و احساسات کیساتھ الفت بلکہ ایک قسم کا تعصب ہوتا ہے، اور اسکی الفت اور میلان کا ظہور عبادت کے رنگ میں اور نفرت کا اظہار بغض و تعصب کے پردے میں ہوتا ہے، غرض ان گذشتہ بیانات سے جماعت کے معتقدات اور حسیات پر کافی روشنی پڑ چکی ہے لیکن جماعت کے ان تمام احساسات و جذبات کی دقیق تعلیل کرنے کی غرض سے اگر ہم ان تمام بڑے بڑے سیاسی اور مذہبی انقلابات پر غائر نظر ڈالیں جو ابتک دنیا میں وقوع پذیر ہو چکے ہیں نیز ان انقلابات کی آڑ میں جو مختلف عوامل پوشیدہ ہوتے ہیں، اُن کی بھی جستجو کریں، تو ہمکو نظر آئیگا کہ ان حالات کے دوران میں جماعت ہمیشہ خیالات کا ایک مخصوص جامہ پہن لیتی ہے، اور اس دوران میں اس پر مخصوص خیالات کا غلبہ ہوتا ہے، جس سے وہ اثر پذیر ہوتی ہے اور وہی اس وقت اس کے اعمال کے محرک ہوتے ہیں لیکن یہ مجموعۂ خیالات جو اس وقت جماعت پر حاوی ہوتا ہے اس کی تعبیر اگر ہو سکتی ہے تو لفظ "مذہب" یا شعور دینی" سے ۔

جماعت کا یہ شعورِ مذہبی جو اس وقت اس کے تمام اعمال و افعال کا باعث ہوتا ہے ہمیشہ چند سیدھے سادے اعتقادات پر مشتمل ہوتا ہے، جو حسبِ ذیل ہیں :۔

۱۔ کسی ایسی ذات کی عبادت کا خیال جو تمام افراد سے برتر تصور کی گئی ہو،

۲۔ اس پوشیدہ ذات سے خوف کرنا اور اسکی کورانہ اطاعت و فرمانبرداری کرنا،

۳۔ اس قوت کی تعلیمات و احکام کو بحث و مباحثہ سے مافوق سمجھنا،

۴۔ ان تعلیمات کی اشاعت و ترویج کی جد و جہد کرنا،

۵۔ جو لوگ ان تعلیمات کو نہ مانیں اُن سے دشمنی اور عداوت کا اظہار،

لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جماعت کو کسی ان دیکھے معبود کے ساتھ اعتقاد پیدا ہوتا ہے اور وہ اس کی پرستش کرتی ہے، کبھی وہ کسی حجر یا شجر کو پوجنے لگتی ہے، اور کبھی اس کا معبود کوئی

محیر العقول سیاسی یا مذہبی خیال ہوتا ہے، جو اس کے اعتقاد کو اپنی جانب جذب کر لیتا ہے، مگر
ان تمام صورتوں میں مذہبی شعور کی حالت یکساں رہتی ہے، اور جماعت ان سب سے یکساں متاثر
ہوتی ہے، بشرطیکہ جماعت کو اپنے معبودوں کے اندر کوئی مخفی معجزہ یا خرقِ عادت نظر پڑا ہو
جماعت کا خیال اس قدر پست ہوتا ہے کہ وہ ہر اُس محیر العقول خیال یا اس رہنما کو مافوق الفطرۃ
تسلیم کرتی ہے، جو اسکی توجہ کو اپنی جانب جذب کرے، یا جس کی کامیابی اسکے نزدیک ایک اعجوبہ
حقیقت یہ ہے کہ انسان کی اصلی دینداری یہ نہیں ہے، کہ وہ کسی معبود کی پرستش کرتا ہے،
بلکہ انسان میں اصلی دینداری کا ظہور اُس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے ارادہ، اپنی مرضی اور اپنی ذات
کو اس معبود کی مرضی اور اس کے ارادہ پر چھوڑ دیتا ہے اور اپنی مرضی کو اسکی مرضی کے لئے بالکل
فنا کر دیتا ہے، جب یہ اعتقادی کیفیت انسان میں پیدا ہو جاتی ہے، تو اُس وقت تمام دوسرے
خیالات کے گرد وغبار سے اس کا شیشۂ دل پاک وصاف ہو جاتا ہے، اور اسکے تمام اعمال افعال
کا محور اور مرجع وحید صرف وہی ذات ہوتی ہے جسکی رضاجوئی اور ذات پر اُس نے اپنی مرضی اور شخصیت کو نثار کر دیا ہے
لیکن جب دینی عقیدہ اور مذہبی خیال کا غلبہ ہوتا ہے تو چونکہ اس غلبہ کے ساتھ تعصب
اور غلوے دینی کا پایا جانا بھی ضروری ہے، اسلئے ہر اُس جماعت میں جو کسی مذہبی عقیدہ کی محکوم
ہوتی ہے یہ دونوں اوصاف بھی نمایاں طور پر پیدا ہو جاتے ہیں، واقعۂ انقلابِ فرانس میں جب چند روزہ
جمہوری حکومت قائم ہوئی ہے، تو اُس وقت یعقوبی فرقہ کے عیسائیوں پر اسی قسم کا سودا سوار تھا اور تعصب
اور غلوے دینی کا اثر ان کے ہر ہر فعل وعمل سے نمایاں ہوتا تھا اور یہ تعصب کسی طرح اس مذہبی تعصب سے
کم نہ تھا جو کیتھولک فرقہ کے عیسائیوں سے محکمۂ انکویزیشن کے قائم کرانے کا باعث ہوا تھا،
غرض جب جماعت پر کسی خیال کا غلبہ ہوتا ہے، تو وہ دیوانگی، کورانہ اطاعت وانقیاد
اور وحشیانہ تعصب کے ساتھ مصروفِ عمل ہو جاتی ہے، لیکن چونکہ کورانہ تقلید اور وحشیانہ تعصب کا رنگ

جماعت کے اعمال و افعال پر اس وقت تک نہیں چڑھ سکتا تا وقتیکہ جماعت کے معتقدات مذہبی جامہ نہ پہن لیں، اسلئے جماعت کے متعلق عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس کے افعال کا صدور ہمیشہ مذہبی پردے میں ہوتا ہے لیکن اس سودائے مذہبی کے پیدا ہونے کے لئے کچھ یہ ضروری نہیں کہ جماعت کو کسی خاص خیال یا کسی معبود ہی کے ساتھ اعتقاد پیدا ہوا ہو، بلکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جماعت جس حکمران کے آگے سرِ تسلیم خم کرتی ہے، وہ بھی اُس کی نگاہ میں معبود کا رتبہ حاصل کر لیتا ہے، اور جماعت اس وقت بھی انتہائی تعصب کے ساتھ اس حکمران کی فرماں برداری کرنے لگتی ہے، نپولین کو دیکھو کہ تقریباً پندرہ برس تک جس خلوص کے ساتھ اسکی پرستش کی گئی ہے، کیا اس کی نظیر کسی معبود یا کسی حکمران کے حالات میں آج تک دیکھنے یا سننے میں آئی ہے اور جو نفوذ قلوبِ انسانی پر اسکو حاصل ہوا، کیا اسکی کوئی مثال صفحاتِ تاریخ میں مل سکتی ہے ؟

قدیم زمانہ میں مختلف مذاہب اور حکومت کے جتنے بانی گذرے ہیں، اُنھوں نے اپنی اپنی قوموں میں اسی طرح نفوذ پیدا کیا، کہ جماعت کے ذہن میں تعصب کے جو دبے دبائے شرارے پہلے سے موجود تھے اُن کو بھڑکا دیا، اور اس کے ذہن میں تعصب کی آگ کچھ اس طرح سلگا دی کہ آخر کار جماعتوں کو بھی اپنی سعادت، عبادت و اطاعت ہی سے وابستہ نظر آنے لگی ہو، سیو واسٹل دی کولنج نے رومی ممالک گال (فرانس) پر جو کتاب لکھی ہے، اس میں کیا خوب کہا ہے کہ ممالک گال میں رومی سلطنت کو قوت و طاقت کے بل پر استحکام نہیں حاصل ہوا، بلکہ اُسے صرف اسلئے استحکام حاصل ہوا کہ اُس نے لوگوں کے ذہنوں میں اپنی بابت ایک دینی اعتقاد پیدا کر دیا، وہ لکھتا ہے :-

"تاریخ میں ہمیں کوئی مثال کسی ایسی سلطنت کی نہیں نظر آتی جس کی اُسکی رعایا نالاں ہو، اور باوجود اس کے اس کا ستارۂ اقبال عروج پر رہا ہو، بلکہ اس کے خلاف تاریخ سے ہمیں جو بات معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ ایسی حکومتیں کبھی دیرپا نہیں ہوتیں، اگر

گال کے باشندے رومن حکومت کو ناپسند کرتے ہوتے تو کیا یہ ممکن تھا کہ رومی شہنشاہ کی ۱۲۰۰ پلٹنیں ایک لاکھ باشندگانِ گال کو زیر کرلیتیں"

حقیقت یہ ہے کہ رومی نشان کے آگے جکیں اقوام سپر انداز ہو گئیں، تو اسکی وجہ یہ تھی کہ شہنشاہِ روم ان کی نگاہ میں ایک معبود کے رتبہ پر پہنچ گیا تھا، اور چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں اسکے نام کی محرابیں اور طاق تعمیر کئے جاتے تھے، اور رومی حکومت میں ایک سرے سے لیکر دوسرے سر تک ایک جدید مذہب کی اشاعت کی گئی تھی، جس کی بنا قیاصرۂ روم کی پرستش تھی، یہاں تک کہ مسیحیت کے ظہور سے کچھ مدت بیشتر سرزمینِ گال میں شہر لیون کے قریب قیصر آگسٹس کے نام کا ایک ہیکل تعمیر کیا گیا تھا، جس کے مجاوروں کی سطوت اور ہیبت باشندگانِ گال کے دلوں میں بیٹھی ہوئی تھی، اسے دیکھو اور سوچو کہ کیا یہ ہیبت کسی خوف کے باعث پیدا ہوئی تھی، اگر اس کا باعث خوف تھا تو ساری قوم میں یہ ہیبت کس طرح پیدا ہوگئی؟ پھر یہ خوف متواتر تین صدیوں تک کس طرح برقرار رہا، اصل یہ ہے کہ اس کا باعث خوف نہ تھا بلکہ یہ کچھ اور ہی بات تھی جس کے سبب سے سارا ملک گال بلکہ شہر روم، ملک اسپین، یونان اور ایشیائیہ تمام ممالک قیاصرۂ روم کے ناموں کا کلمہ پڑھتے تھے،

زمانۂ قدیم کو جانے دو، اپنے زمانہ کو دیکھو اس زمانہ میں گو نفوس پر غلبہ حاصل کرنے والوں کے نام کے ہیکل اور عبادت خانے نہیں تعمیر کئے جاتے ہیں لیکن تم دیکھتے ہو کہ وہ لوگ جو اس زمانہ میں نفوذ حاصل کر لیتے ہیں، کس کثرت سے قومیں ان کے مجسمے جا بجا گذرگاہوں پر نصب کرتی ہیں کس کثرت سے ان کے فوٹو لئے جاتے ہیں اور کس ذوق و شوق سے انکی تصویریں جا بجا ہاتھوں ہاتھ بکتی ہیں، اور پرستش کے جو طریقے آج کل رائج ہیں وہ میرے خیال میں عبادت کے ان طریقوں سے بدرجہا زیادہ موثر ہیں، جو اگلے زمانہ میں رائج تھے، حیاتِ اجتماعی کا یہی اعتقادی پہلو ہے، جس کو پیشِ نظر کر لینے سے

تاریخی واقعات کے سمجھنے میں جو دقتیں واقع ہوتی ہیں وہ رفع ہو جاتی ہیں، ان لوگوں کے مقابلہ میں جو جماعت کے اعتقادی پہلو کو سرسری نگاہ سے دیکھتے ہیں، تاریخ کی یہ زبردست شہادت ہے کہ جماعتوں کو ہمیشہ سب سے پہلے ایک معبود کی تلاش ہوتی ہے، جس کے لئے وہ ہر وقت سرگرداں رہتی ہے، لیکن جب اس شاہد خیالی کا وصال نصیب ہو جاتا ہے، تو اس سے دیوانگی کے عالم میں عجیب وغریب اور محیر العقول حرکات صادر ہونے لگتے ہیں، یہ ہی تاریخ کا وہ زبردست تحکمانہ دعویٰ جس کے ثبوت کی شہادت تاریخ کے ایک ایک صفحہ سے ملتی ہی،

لیکن اس مسلّم الثبوت تاریخی حقیقت کو فراموش کرکے بعض لوگ اس دعوی کی عمومیت سے انکار کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ جماعت کے افعال پر مذہب کا جو اثر تھا وہ صرف زمانہ قدیم کیساتھ مخصوص تھا، معبود اور عبادت یہ سب چیزیں زمانہ قدیم کے خرافات ہیں، جن کو اس زمانہ کی ترقی یافتہ عقلیں باور نہیں کر سکتیں، اس لئے مذہب کا اثر جماعت پر اب نہیں پڑ سکتا، اور نہ اب جماعت کسی معبود کی پرستش کر سکتی ہی، اب مذہب کا دور ختم ہو گیا، اور بہت سے معبود جو زمانہ سابق میں لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل رہنے کے باعث جماعت کو اپنے دام میں پھنسا لیا کرتے تھے، اب بے نقاب کر دیے گئے ہیں، اسلئے جماعت اب زمانہ سابق کی طرح ان معبودوں کے پھیر میں نہیں آئیگی، یہ اُن لوگوں کا خیال ہے جو سمجھتے ہیں کہ اس ترقی یافتہ دور میں علم کو مذہب پر اور عقل کو جذبات پر فتح حاصل ہو گئی ہی، اور علم کی روشنی کے سامنے توہمات کی تاریکی غائب ہو گئی ہی، یہ خیال قائم کرتے وقت شاید ان لوگوں کو نفسِ انسانی کا یہ عالمگیر قانون یاد نہیں رہا، کہ جب عقل اور شعور کا باہم تصادم واقع ہوتا ہی، تو عقل کو شعور پر کبھی فتح حاصل نہیں ہوتی، تم اپنی عقلوں کو علم کے تیزاب سے خواہ کتنا ہی صیقل کرو مگر جب عقل اور جذبات کا مقابلہ ہوگا تو جذبات کی تاریکی کے آگے عقل کی تیز روشنی ہمیشہ مدھم رہے گی، عقل پر جذبات کا رنگ جو چڑھ

جاتا ہو، اس کا صیقل کسی تیزاب سے ممکن نہیں، پس علم کی ترقی مذہب کے اس اثر کو کبھی نہیں مٹا سکتی جو مذہب کو جماعت پر زمانۂ دراز سے حاصل ہو یہی وجہ ہے کہ جماعت کو جو رجحان اپنے معبودوں کی جانب زمانۂ قدیم میں تھا، انہیں اب بھی کوئی فرق نمودار نہیں ہوا، اور جماعت اب بھی سابق کیطرح اپنے معبودوں کے نام پر قربان ہونے کیلیے تیار ہو، البتہ معبودوں کی جو کثرت زمانۂ سابق میں تھی اس میں ضرور فرق آگیا ہے لیکن مذہبی اثر و غلبہ کا مدار معبودوں کی کثرت و قلت پر نہیں بلکہ جماعت کے ان مذہبی جذبات اور اسکے اس رجحان قلبی پر ہو، جسکا اظہار وہ اپنے معبودوں کیساتھ کرتی ہو، اور اس قلبی رجحان اور مذہبی جذبہ میں کسی قسم کا ضعف نمودار نہیں ہوا ہو، دیکھو جب جنرل بولنگر کا فتنہ اٹھا ہو، تو اس وقت جماعت کا مذہبی جذبہ کس سہولت سے مشتعل ہوگیا تھا اور ایک ایک دیہات و قصبہ میں اس جنرل کے مجسمے اور بت نصب کیے گئے تھے، یہانتک کہ عام طور سے لوگوں کے ذہنوں میں اسکی جانب سے یہ اعتقاد راسخ ہوگیا تھا کہ اس کو رد مظالم اور مصائب آلام سے نجات دینے پر قدرت تامہ حاصل ہو، پھر اس اعتقاد میں یہانتک ترقی ہوئی تھی کہ لکھوکھا آدمی اس کے ساتھ جان دینے پر آمادہ ہوگیا تھا، اور اگر کہیں اسکے اخلاق و عادات اسکی بڑھتی ہوئی شہرت کے ممد و معاون ہوتے تو وہ تاریخ میں ایک عالیشان مرتبہ حاصل کر لیتا، اور اس کا نام لوح تاریخ پر سنہرے حروف میں کندہ کیا جاتا،

پس اب ہمکو اس بات کا باربار دہرانا کچھ بیکار سا معلوم ہوتا ہے، کہ جماعت کو ایک دین اور مذہب کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہو، اور جب تک کوئی مذہبی عقیدہ اس کے دماغ پر غلبہ حاصل نہیں کر لیتا، اس وقت تک اسکے قوائے عمل شل اور اس کے اعضا بے حس و حرکت رہتے ہیں، پھر یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ اس مذہبی عقیدہ میں بھی ان عقائد کیطرح جو الہامی مذاہب نے دنیا کو تلقین کیے ہیں مثلاً روح و فدا، سزا و جزا وغیرہ کی حقیقت تسلیم کی گئی ہو، اور یہ مذہب بھی دیگر مذاہب کی طرح اسی قسم کے عقیدوں پر مشتمل ہو، بلکہ اسحاد و دہریت کو بھی مذہبی رنگ میں لاکر جماعت کے سامنے پیش کیا جائے تو

اس مذہب کو بھی اسی جوش و خروش کیساتھ قبول کرے گی جس طرح وہ دیگر الہامی مذاہب کو بلاچون وچرا تسلیم کرلیتی ہے، ایک جدید مذہب جو فلسفہ ایجابی کے نام سے فرانس میں اب شائع ہوا ہے اس کے معتقدین جس کثرت کیساتھ پیدا ہوتے جاتے ہیں، وہ ہمارے دعوی کا ایک بر دست ثبوت ہے اسکے علاوہ نہاسٹ فرقہ کے ایک شخص کی سرگذشت جو ہم سے ایک وسیع خیال مفکر موسیو ڈسٹو یسکی نے بیان کی وہ بھی ہمارے دعوی کی مزید شہادت ہے، اس شخص کو ایک روز یہ خیال پیدا ہوا کہ لوگوں کا گرجوں میں تصویروں اور بتوں کی پرستش کرنا قدیم زمانہ کے توہمات سے ہے، یہ خیال پیدا ہوتے ہی، اس نے بزرگان دین کی تصویروں کو جو ایک گرجے میں لٹک رہی تھیں، پھینک یا شمعوں کو گرجے کے اندر جا بجا روشن تھیں گل کردیا، اور ان تصاویر کی جگہ پر دہریہ فلاسفہ میں سے بوخنر اور مولیشاٹ کی تصانیف لاکر رکھدیں اسکے بعد اسکی حالت میں پھر تغیر ہوا تقوی کا جنون اس پر پھر سوار ہوا، اور اب اس نے انہی کتابوں کے گرد موم کی شمعیں روشن کردیں، اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کے ان عقائد میں جو ارثاً حاصل ہوتے ہیں کبھی تغیر نہیں ہوتا، البتہ کبھی کبھی ان عقائد کی صورت بدل جاتی ہے،

پس مذہب کو جماعت کے مشاعر و احساسات اور اعمال و افعال پر جو تسلط اور غلبہ حاصل ہے اسکی بنا پر میرا یہ خیال ہے کہ کوئی شخص اہم تاریخی واقعات کی حقیقت کو اس وقت تک بتمام وکمال نہیں سمجھ سکتا، تاوقتیکہ وہ ان دینی معتقدات سے واقفیت نہ پیدا کرلے، جو ان واقعات کی آڑ میں مجمع کی قیادت کرتے ہیں، پھر بعض تاریخی واقعات تو ایسے گذرے ہیں کہ جنکی توجیہ جماعت کے اعتقادی پہلو کے علاوہ کسی اور پہلو سے ہو ہی نہیں سکتی، یہی وجہ ہے کہ موسیو ٹائن نے جو ایک زبردست مورخ گذرا ہے گو واقعہ انقلاب فرانس کی تاریخ لکھتے ہوئے اس واقعہ کے تمام جزئیات پر خوب غور اور محققانہ نظر ڈالی ہے لیکن چونکہ اسنے جماعتوں کی اس نفسانی حقیقت کو کہ وہ ہمیشہ مذہبی جذبہ کی محکوم ہوتی ہیں نظرانداز کردیا، اسلئے بعض واقعات کے اسباب دریافت کرنے میں وہ ناکام رہا،

یہانتک کہ آخر کارا ُس نے یہ قطعی فیصلہ سنا دیا، کہ چونکہ انقلاب فرانس کے بڑے بڑے نامور لیڈر خود غرض اور جفاکار تھے اور ان شورشوں کے پردے میں اپنے ذاتی اغراض حاصل کرنا چاہتے تھے، اسلئے جماعت کو اُنھوں نے حصولِ مقاصد کا آلہ بنا رکھا تھا، حالانکہ حقیقت یہ ہو کہ موسیو ٹائن کی یہ سخت غلطی ہو، اور انقلابِ فرانس کی تاریخ خونریزیوں اور وحشیانہ اعمال سے جو لبریز نظر آتی ہے، اسکی وجہ یہ نہیں ہو کہ ان خونریزیوں کے ذریعہ سے اس زمانہ کے لیڈر ذاتی اغراض حاصل کرنا چاہتے تھے، بلکہ ان واقعات کی اصلی حقیقت اُس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتی، تاوقتیکہ پہلے یہ پیشِ نظر نہ کر لیا جائے کہ یہ انقلاب ایک جدید دینی عقیدہ اور مذہبی جذبہ کا نتیجہ تھا جو اس زمانہ کی عقلوں پر غالب آگیا تھا، واقعۂ اصلاحِ مذہب، کارزار سینٹ بارٹلمی، فرانس کے حروبِ دینیہ محکمۂ انکوزیشن اور واقعۂ ہول، غرض اس قسم کے تمام واقعات اُس وقت تک ظہور پذیر نہیں ہوتے، تاوقتیکہ جماعتوں کا مذہبی جذبہ جماعتوں کی رہنمائی نہیں کرتا، یہ مذہب ہی کی کرشمہ سازیاں ہیں کہ وہ لوگ جو پہلے نہایت امن وسکون کے ساتھ بسر کر رہے تھے، ایکبارگی درندہ خصلت بنجاتے ہیں، امن وتہذیب کا خیال بالائے طاق کر دیا جاتا ہو، اور آتش و آہن کا استعمال شروع ہو جاتا ہے، کیا کوئی ظالم سے ظالم بادشاہ بھی لوگوں کے دلوں میں ایسا زبردست اعتقاد پیدا کر سکتا ہے کہ وہ خوشی خوشی دہکتی ہوئی آگ میں کود پڑیں؟

پس جن مورخوں نے اس قسم کے واقعات کے متعلق یہ فیصلہ کیا ہو کہ یہ فتنے چند خودغرض لیڈروں یا بادشاہوں کے ظلم وجور کی بدولت برپا ہوئے، اُنھیں معلوم ہونا چاہئے کہ بادشاہوں اور لیڈروں کی قدرت سے یہ باہر ہے کہ وہ انسانوں کو اپنی مرضی سے لقمۂ اجل بننے پر مجبور کر سکیں، پس واقعۂ ہول کے باعث روبسپیر یا ڈانٹن یا سینٹ جوسٹ نہ تھے، بلکہ ان افراد کے پردے میں جماعت کی روح کام کر رہی تھی جس پر ایک خاص مذہبی عقیدہ غالب آگیا تھا،

بابِ دوم

جماعت کے افکار اور معتقدات

فصلِ اوّل

معتقداتِ جماعت کے عوامل بعیدہ

" ان مختلف عوامل کا بیان جو معتقدات جماعت کو پیدا کرتے ہیں، معتقداتِ جماعت سابق محنت کا نتیجہ ہوتے ہیں، مختلف مؤثرات کی تجدید جو ان معتقدات کو پیدا کرتے ہیں"

۱۔ **قومیت کا اثر**:۔ معتقداتِ جماعت پر قومیت کا کیا اثر ہوتا ہے، یہ بحث کہ قومیت اجداد کی میراث ہوتی ہے، جو قوموں کو ترکہ میں ملتی ہے،

۲۔ **قومی روایات کا اثر**:۔ یہ بحث کہ قومی روایات قومی روح کا خلاصہ ہوتے ہیں، اجتماعی حیثیت سے قومی روایات کی کیا اہمیت ہے، قومی روایات تھوڑا عرصہ گذرنے کے بعد قوم کے لئے مضرت رساں ثابت ہوتے ہیں، قومیں اپنے قومی روایات کی بے انتہا حفاظت کرتی ہیں،

۳۔ **زمانہ کا اثر**:۔ معتقداتِ جماعت کی ترقی و تنزل میں زمانہ کو بڑا دخل ہوتا ہے یہ بحث کہ کسی شورش کے بعد جس سے قومی نظام درہم برہم ہو گیا ہو، زمانہ کی وساطت

سے پھر قومی نظام کی کس طرح اصلاح ہوتی ہے،

۴۔ نظامِ حکومت اور نظامِ معاشرت کا اثر:۔ نظامِ حکومت اور نظامِ معاشرت کے اثر کے بارہ میں موجودہ زمانہ کے علما سے غلط فہمیاں ہوئی ہیں، درحقیقت جماعت پر ان کا اثر بہت ضعیف ہوتا ہے، نظامِ حکومت اور نظامِ معاشرت خود قومی روح کے نتائج ہوتے ہیں، قوموں کے لئے یہ کوئی آسان کام نہیں ہے کہ جو نظامِ حکومت اور نظامِ معاشرت وہ چاہیں اختیار کریں، قوموں کے نظامِ حکومت اور نظامِ معاشرت کی پیدائش کس طرح ہوتی ہے، بعض نظامِ حکومت اور نظامِ معاشرت گو عقلی پہلو سے مہمل ہوتے ہیں، لیکن بعض قوموں کے لئے نہایت ضروری ہوتے ہیں،

۵۔ تعلیم و تربیت کا اثر:۔ تعلیم و تربیت کے بابت موجودہ زمانہ میں غلط فہمیاں ہوئی ہیں، تعلیم و تربیت کے اثر کی تائید میں چند اعدادی تفصیلات لاطینی تربیت اخلاق کی مضعف ہے، یہ بحث کہ تعلیم سے کیا اثرات پیدا ہوتے ہیں، مختلف اقوام کی مختلف مثالیں،

ابوابِ سابق میں ہم نفسِ اجتماعی کے قوائے ذہنی کی تفصیل بیان کر چکے ہیں یہ بھی معلوم ہو چکا کہ اس کے مشاعر و جذبات کیا کیا ہیں، اس کے فکر کرنے کا کیا طرز ہے اور وہ استدلال کس طرح کرتی ہے، غرض بیاناتِ سابقہ میں نفسِ اجتماعی کے مظاہر کی تشریح تفصیل کے ساتھ گذر چکی ہے، اب اس باب میں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جماعت کے اعتقادات اور افکار کس طرح پیدا ہو کر نفوسِ جماعت میں رسوخ حاصل کرتے ہیں، وہ کون سے عوامل ہیں جو افکارِ جماعت کی پیدائش کے باعث ہوتے ہیں، اور قوموں پر

ان عوامل کا کیا اثر پڑتا ہے ؟

وہ مؤثرات وعوامل جو معتقداتِ جماعت کی پیدایش کے باعث ہوتے ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں،

۱۔ موثرات وعواملِ بعیدہ،

۲۔ موثرات وعواملِ قریبہ،

عواملِ بعیدہ کی حالت یہ ہے کہ وہ جماعت میں صرف یہ استعداد پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ بعض اعتقادات، افکار اور خیالات کو قبول کرے اور بعض کو رد کر دے، اسکو دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو کہ عواملِ بعیدہ کا فعل واثر ایک مخصوص آب وہوا اور مخصوص تربیت کا پیدا کرنا ہوتا ہے جسمیں نئی قسم کے افکار حیرت انگیز اثر وقوت کے ساتھ پھلتے پھولتے ہیں انکا ظہور اگرچہ دفعۃً اور اچانک ہوا کرتا ہے اور اس لحاظ سے اُن کی حالت بجلی کی سی ہوتی ہے جو دفعۃً چمکتی ہے اور فوراً نظر سے غائب ہو جاتی ہے، لیکن ان معتقدات و افکار کے رسوخ حاصل کرنے کے لئے مدت دراز کی محنت اور ان عواملِ بعیدہ کی تاثیر وعمل کی نہایت شدید احتیاج ہوتی ہے، بعض اوقات قومی انقلاب کا منظر اچانک ہماری نگاہ کے سامنے آجاتا ہے، اور یہ منظر ہم کو حیرت وتعجب میں ڈال دیتا ہے، لیکن بات یہ ہے کہ اس انقلاب کا ظہور گو ہماری آنکھوں کے سامنے اچانک ہوا ہے، مگر اس کی تیاری مدت دراز سے عمل میں آرہی تھی اور مختلف عوامل اپنا فعل واثر کر رہے تھے، جو ہم کو دکھائی نہیں دیتے تھے،

لیکن عواملِ بعیدہ کی کارگذاری جب ختم ہو جاتی ہے تو اس وقت عواملِ قریبہ کی تاثیر کا وقت آتا ہے اور یہ عوامل اس کام کو جو عواملِ بعیدہ ادھورا چھوڑ گئے ہیں، انجام تک پہنچاتے ہیں، اور اس استعداد کو جو عواملِ بعیدہ ذہنِ جماعت میں پیدا کر گئے ہیں فعلیت کا جامہ

پہنچاتے ہیں یعنی وہ معتقدات وخیالات جو مدت سے ذہن جماعت میں موثرات بعیدہ کے زیر اثر استحکام ورسوخ حاصل کر رہے تھے اب موثرات قریبہ کے زیر اثر ذہنی جامہ اتار کر میدان عمل میں اپنے تئیں بے نقاب کر دیتے ہیں، اور انقلاب کی عالم سوز چنگاریاں جو مدتوں سے دبی چلی آرہی تھیں اب ان میں ان مؤثرات قریبہ کی بدولت ایکدم اشتعال پیدا ہو جاتا ہے، اور آخر کار جماعت آہنی ہتھیاروں سے مسلح ہو کر میدان کارزار میں یکبارگی کود پڑتی ہے، شورشیں برپا ہوتی ہیں، قیامت کے فتنے نمودار ہوتے ہیں، اور آدمیوں کا ایک جم غفیر اپنے قائد کے گرد جمع ہو کر حکومتوں کو پلٹ دیتا ہے،

جتنے اہم تاریخی واقعات اب تک گذر چکے ہیں، ان میں ان دو قسم کے مؤثرات کے فعل واثر کو ہمیشہ دخل رہا ہے، اور دنیا میں کوئی واقعہ اور کوئی انقلاب اُس وقت تک ظہور میں نہیں آسکتا تا وقتیکہ ان دونوں قسم کے مؤثرات جماعت پر اپنا فعل واثر مکمل نہ کر لیں، مثال میں واقعۂ انقلاب فرانس کو لو جو انسان کی تاریخ میں انقلاب کا ایک مکمل نمونہ ہے، اس کے مؤثرات بعیدہ میں یہ چند چیزیں تھیں، فلاسفہ کی تصانیف، امراء کا ظلم وجور اور علوم وفنون کی ترقی، لیکن جب ان موثرات کا عمل تمام ہو چکا اور جماعت کی روح جو مردہ تھی زندہ ہو گئی اُس وقت مؤثرات قریبہ کا ظہور ہونے لگا، خطبا لوگوں کو اپنے دھواں دھار خطبوں سے مسحور کرنے لگے، بادشاہ نے معمولی اصلاحات کے اجراء میں رکاوٹیں پیدا کرنا شروع کر دیں، یہ ہونا تھا کہ فتنہائے خوابیدہ جاگ اُٹھے اور ہنگامۂ محشر خیز برپا ہو گیا،

مؤثرات بعیدہ میں سے بعض وہ عوامل ہیں جن کا اثر عالمگیر ہوتا ہے، یعنی جو ہر جماعت کے معتقدات وافکار میں یکساں اثر کرتے ہیں، اور وہ حسب ذیل ہیں۔ (۱) قومیت (۲) قومی روایات (۳) قومی نظام حکومت اور نظام معاشرت (۴) زمانہ (۵) تربیت وتعلیم،

اب ہم ان میں سے ہر ایک پر علیحدہ علیحدہ بحث شروع کرتے ہیں،

(۱)

قومیت کا اثر

قومیت کا جو اثر جماعت پر پڑتا ہے، اس کو دیگر موثرات کے اثر سے بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے، کیونکہ یہ دیگر مؤثرات کے اثر سے زیادہ مستحکم ہوتا ہے، اور دیگر موثرات کا اثر جماعت پر ہمیشہ قومیت کے اثر کے تابع ہو کر ظاہر ہوتا ہے، قومیت کے اس مستحکم اثر کی بابت ہم اپنی دوسری کتاب " قوموں کی ترقی وتنزل کے قوانین نفسی[۱] " میں نہایت تفصیل سے بحث کر چکے ہیں، ہم اس کتاب میں یہ بھی بتا چکے ہیں کہ تاریخی قوموں کی پیدائش کس طرح ہوتی ہے، قوموں پر ان کی قومیت کا کیا اثر ہوتا ہے اور جب اسکا اثر درجۂ کمال کو پہنچ جاتا ہے، تو وراثت کے ذریعہ سے وہ کیونکر رسوخ واستحکام حاصل کرتا ہے، نیز یہ کہ قوموں کے مزاجِ عقلی کی تکوین کس طرح ہوتی ہے پھر ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ قومیت کا اثر اس قدر قوی ہوتا ہے کہ اس اثر کی موجودگی میں کسی قوم کے مظاہر تمدن (یعنی علوم وفنون، مذہب اور نظامِ حکومت ونظامِ معاشرت) اُسوقت تک دوسری قوم میں منتقل نہیں کئے جا سکتے، جب تک ان میں خود تغیر وتبدل نہ کیا جائے، اس بحث کو ہم نے چار فصلوں میں پھیلایا تھا، کیونکہ ہم کو خیال تھا کہ یہ ایک ایسا جدید نظریہ ہے، جس پر تاریخی واقعات کی حقیقت کا سمجھنا موقوف ہے، اس کے علاوہ اس کتاب میں یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ گو عناصرِ تمدن کو ایک قوم سے دوسری قوم کی جانب اس وقت تک منتقل نہ کیا جا سکتا ہو، تاوقتیکہ ان میں تغیر نہ کیا جائے، تاہم ماحول اور دیگر عواملِ خارجی کبھی کبھی اس تغیر کو پیدا کر دیتے ہیں، لیکن باوجود اس کے بھی قومیت کا اثر اتنا قوی ہوتا ہے کہ یہ تغیر وقتی ثابت ہوتا ہے،

---

[۱] انقلاب الامم جس کو دارالمصنفین اعظم گڈھ نے شائع کیا ہے، (مترجم)

علاوہ بریں اس کتاب میں بھی قومیت کے اس عالمگیر اثر کی جانب ناظرین کو جابجا اشارات ملیں گے اور ہم جابجا اس بات کو واضح کر دیں گے، کہ نفسِ اجتماعی کے میزات پر قومیت کا اثر کس قدر قوی ہوتا ہے اور یہی سبب ہے، کہ ایک شہر کے باشندے دوسرے شہر کے باشندوں سے اعتقادات، خیالات اور طرزِ عمل میں کس قدر مختلف ہوتے ہیں،

(۲)

قومی روایات کا اثر

قومی روایات کسی قوم کے اُن افکار، خیالات اور ضروریات سے عبارت ہیں جو زمانۂ گذشتہ سے سلسلہ وار نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتے چلے آتے ہیں اور جن سے قومی روح یا بالفاظِ دیگر قوموں کے مزاجِ عقلی کی تشکیل ہوتی ہے، اور چونکہ وراثت کے پے درپے اثر سے وہ یک گونہ رسوخ حاصل کر لیتے ہیں، اس لئے قوموں کے افکار، معتقدات اور اُن کے طریق کار کے متعین کرنے میں ان روایات کو بڑا دخل ہوتا ہے، اور قوموں کی ترقی و تنزل میں اُنکو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے،

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جو مختلف قوموں کی تاریخ کے مطالعہ سے مجھے معلوم ہوئی ہے اور میرا خیال ہے کہ جس طرح علم ترکیبِ اجسام کی تاریخ میں اس تحقیق سے کہ کائنات کے تمام تغیرات میں ماضی کی تاثیر کو بہت بڑا دخل ہوتا ہے، ایک جدید دور کا آغاز ہوا تھا، اسی طرح جب یہ تاریخی حقیقت بھی عام طور پر تسلیم کر لیجائے گی، تو اس وقت علم تاریخ میں بھی ایک نمایاں انقلاب ہو جائیگا، لیکن اب تک اس جدید تاریخی حقیقت کی اہمیت کا احساس لوگوں کو اس درجہ تک نہیں ہوا ہے، جس درجہ تک فی الواقعہ اسکو اہمیت حاصل ہے، اور اس زمانہ میں گذشتہ زمانہ کے سیاست دانوں کی طرح بعض سیاست دانوں کا یہ خیال ہے کہ قومیں اپنے ماضی کی پوشاک اُتار کر نورِ عقل کی رہنمائی میں جدید پوشاک زیبِ تن کر سکتی ہیں، حالانکہ انکو یہ خیال

نہیں رہا کہ قوم کی حالت بھی دیگر زندہ اجسام کے مانند ہے، جسے ماضی ہی نے پیدا کیا ہے پس دیگر اجسام کی طرح قوموں کو بھی یہ قدرت حاصل نہیں کہ اپنے آثار میراث میں خود کسی طرح کا تغیر کر سکیں،

علاوہ بریں قومیں اور جماعتیں تو برطرف خود افراد کی حالت تو دیکھو! ان کی رہائش انکا طرز بود و باش، انکا پیشہ، انکا کاروبار، غرض ان کی زندگی کا ہر مرحلہ کس طرح محض دوسروں کی تقلید کرنے میں بسر ہوتا ہے پھر جماعت جو افراد کے مجموعہ کا نام ہے وہ کس طرح اپنی مرضی کے مطابق اپنے آثار میراث میں کوئی تغیر کر سکتی ہے، بلاشبہہ بعض اوقات قومیں اپنے موروثی نظام حکومت اور نظام معاشرت میں کچھ تھوڑی سی ترمیم و تنسیخ کرتی ہیں، لیکن جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اس تغیر و تبدل اور اس ترمیم و تنسیخ کا اثر ظاہر سے کبھی تجاوز نہیں کرتا، صرف ناموں میں تغیر ہوجاتا ہے، باقی اصلیت وہی رہتی ہے،

ہاں، تو کیا یہ کوئی افسوسناک بات ہے؟ کیا جماعت کی تقلید پرستی تہذیب کی ترقی میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے؟ اور کیا جماعت کی تقلید پرستی قوموں کی ترقی کی سدّ راہ ہوتی ہے؟ نہیں ایسا نہیں، بلکہ اسکے خلاف مجھکو تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر ان مختلف قومی روایات کا وجود نہ ہوتا جو قوموں کے اعمال و افعال کے حقیقی رہبر ہوتے ہیں، تو شاید کوئی قوم معراجِ ترقی پر نہ پہنچ سکتی، بلکہ تہذیب و تمدن بھی اس درجہ سے گر جاتا جو انتہائی محنت سے اُس نے اب حاصل کیا ہے، خیال کرنے کی بات ہے، کہ انسان کا جب سے وجود ہوا ہے اُس وقت سے برابر یہی اسکا ایک مقصد رہا کہ کوئی نئی بات ایجاد کیجائے یہانتک کہ جب کبھی پرانی قومی روایات کا اثر زائل ہوگیا تو اُس نے فوراً اُن کو مٹا دیا، اور نئے سرے سے دوسری نئی نئی باتیں ایجاد کرلیں، غرض انسانی تہذیب و تمدن کی حقیقت پر اگر غور کرو تو معلوم ہوگا، کہ تہذیب و تمدن کا مدعا ہمیشہ یہی رہا ہے، کہ پرانی چیزیں مٹا دیجائیں اور اُن کی جگہ نئی نئی چیزیں ایجاد کیجائیں پس اگر ان پرانی چیزوں و قدیم

روایات اور قومی سرمایہ کا وجود نہ ہوتا تو قومیں کس چیز میں اصلاح کرتیں؟ یہ اختراع و ایجاد کس طرح عمل میں آتی؟ اور تہذیب کی نمو و نمایش کا جو انسان کی جدت پسندی کیساتھ قائم ہی مصرف کہاں سے ہاتھ آتا، حاصل یہ کہ اگر کسی قومی سرمایہ ورقدیم روایات کا وجود نہ ہوتا، تو تمدن کس مصرف کا تھا؟ تمدن کا تو مدعا ہی یہ ہے کہ قدیم روایات میں جو کمزوری پیدا ہو گئی ہی، اسکی اصلاح کرنا اور اگر ان روایات کا کوئی جزو بے مصرف اور ناکارہ ہو گیا ہو، تو اسکی جگہ پر کسی جدید جزو کا اضافہ کرنا، اور ظاہر ہے کہ اس کے لئے کسی قدیم محفوظ سرمایہ کی کس قدر حاجت ہی، پس اگر تہذیب و تمدن کے نقطۂ نظر سے دیکھو تو انسان کی تمدنی ترقی میں قومی روایات کی بہت بڑی اہمیت ثابت ہوتی ہے، لیکن جب ان قومی روایات کے کسی جزو کے بیکار ہو جانے کی وجہ سے تجدید و اصلاح کی ضرورت پیش آتی ہی، تو اُس وقت جس بات میں دشواری کا سامنا ہوتا ہی وہ یہ ہے کہ تغیر و بقا یا تجدید و تاسیس میں توازن کس صورت سے قائم کیا جائے، بات یہ ہے کہ قوموں کی فطرت کچھ اس طرح کی واقع ہوئی ہے، کہ جب بعض اخلاق و عادات امتداد زمانہ سے قوم میں راسخ ہو جاتے ہیں، تو چونکہ قومیں تقلید پرست واقع ہوئی ہیں، اسلئے قوموں کے ان اخلاق و عادات کا اپنی جگہ سے ہلانا کچھ آسان کام نہیں ہوتا، اب اس وقت اگر پے در پے فتنوں اور انقلابات سے کام نکالا جاتا ہی، تو دو ہی باتیں حاصل ہوتی ہیں، یا تو یہ کہ قومی عناصر کے ان اجزا میں باہم انفصال جو پیدا ہوا تھا، وہ سرے سے مفقود ہو جاتا ہی، اور ان شورشوں کی جو غرض تھی وہ بالکل فوت ہو جاتی ہی، یا یہ انفصال اسقدر کشادہ ہو جاتا ہی کہ قومی عناصر جو باہم پیوستہ تھے اور جن کی پیوستگی پر قومی نظام کا دار و مدار تھا، وہ بکھر جاتے ہیں، غرض ہر صورت میں ان شورشوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ قومی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے، اور تمام قوم میں سراسیمگی اور پراگندگی پھیل جاتی ہے، یہانتک کہ اس پریشان حالی کے باعث یہ خوف پیدا ہو جاتا ہی کہ کہیں زوال و

انحطاط کی باد تند قومی عمارت کو ڈھا نہ دے،

پس قوموں کیلئے بیش قیمت نصیحت صرف یہ ہے کہ وہ نہایت خاموشی کیساتھ اپنے ان قومی روایات پر کاربند رہیں جو آباواجداد سے اُن کو ورثہ میں ملے ہیں اور اگر کبھی انکو اپنے ان قدیم روایات میں کوئی تغیر کرنے کی ضرورت محسوس ہو تو نہایت ہوشیاری کیساتھ تھوڑا تھوڑا کرکے رفتہ رفتہ تغیر کریں، ورنہ خوف ہے کہ کہیں انتشار و بدامنی کی چنگاریاں مشتعل ہوکر قوم کی خرمن ہستی کو جلاکر خاک سیاہ نہ کردیں، لیکن چونکہ زمانہ کا ہاتھ اس قدر طاقتور اور زبردست ہے، کہ قوموں کو کسی نہ کسی وقت اپنے قومی روایات میں اصلاح و تجدید کی ضرورت ضرور پیش آتی ہے، اسلئے قوموں کی زندگی میں یہی ایک نازک موقع ہوتا ہے، جس میں بہت کم قوموں نے عزم و استقلال کا ثبوت دیا ہے، گذشتہ زمانہ میں رومیوں کی قوم اور موجودہ زمانہ میں انگریزی قوم صرف یہی دو حوصلہ مند قومیں ہیں، جن کا پائے ثبات نازک سے نازک موقعوں پر بھی بہت کم متزلزل ہوا ہے، باقی دنیا کی دوسری قومیں ایسے نازک وقت میں اکثر فنا ہوگئی ہیں،

یہی وجہ ہے کہ قومی روایات اور قومی سرمایہ کی حفاظت کا قوموں اور جماعتوں کو سب سے زیادہ خیال رہتا ہے، یہانتک کہ قومیں ان لوگوں سے لڑنے جھگڑنے پر تُل جاتی ہیں، جو انکے قومی روایات میں کوئی تغیر یا ترمیم کرنا چاہتے ہیں، اور پھر جماعتوں میں بھی وہ جماعتیں اس کا زیادہ خیال رکھتی ہیں جن کا دائرۂ اثر محدود ہوتا ہے، اور اصل یہ ہے کہ ان قوموں کی حفاظت بغیر اس کے ہو ہی نہیں سکتی، لہٰذا اگر یہ قومیں اپنے قدیم روایات کو محفوظ نہ رکھیں تو سب سے پہلے حوادث زمانہ کا شکار یہی ہوں، تقلید پرستی کا یہی وصف ہے جو قوموں کو اپنے قومی روایات میں اصلاح و تجدید کی اجازت نہیں دیتا، اور اگر قومیں کبھی اپنے حالات میں اصلاح کرتی بھی ہیں تو جیسا کہ میں بیان کرچکا ہوں، اس اصلاح کا اثر ظاہری نمود سے کبھی تجاوز نہیں کرتا، گذشتہ صدی میں

مذہب کی جانب سے جو عام نفرت پھیلی ہوئی تھی، اس سے یہ خیال ہوتا تھا کہ شاید اب مذہب کی سطوت کا خاتمہ ہو چکا، اور آیندہ کے لئے اس قید سے نجات مل گئی، لیکن تھوڑی ہی مدت گذری تھی کہ لوگوں میں مذہبی جوش نہایت سرعت سے پھر پیدا ہو گیا، اور گرجوں اور پادریوں کی حکومت پھر قائم ہو گئی، اب سلطنت نے جو یہ دیکھا تو چار و ناچار اس کو بھی ارکانِ مذہبی کی ترویج میں سہولت پیدا کرنی پڑی، ان واقعات کو ذرا فورکرائی کی زبانی سنو جو گذشتہ انقلابِ فرانس میں خود شریک تھا، اور جس کے قول کو موسیو ٹائن نے بھی نقل کیا ہے، فورکرائی کہتا ہے:۔

"اب کچھ دنوں سے یہ عجیب بات دیکھنے میں آتی ہی کہ یکشنبہ کے روز گرجوں میں نمازیوں کی کثرت ہوتی ہی، اور لوگ گرجوں میں آنے جانے لگے ہیں، ان واقعات سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ فرنچ قوم اپنے قدیم عادات کی جانب پھر عود کر رہی ہی، اور قوم میں یہ میلان جو پیدا ہوا ہی اسکو روکنا اب محال ہی، اسلئے کہ سواد اعظم اب اس وقت مذہب کا محتاج ہی، زمانۂ حال کے فلاسفہ کی یہ غلطی ہے جو وہ سمجھتے ہیں، کہ اگر تعلیم عام کر دیجائے گی تو یہ مذہبی اوہام وخرافات فنا ہو جائیں گے، اس غلط فہمی کا سب سے بڑا سبب یہ ہی کہ وہ یہ فراموش کر گئے ہیں کہ دنیا کے بہت سے بیکس لوگوں کے لئے مذہب تسلی اور سکون کے سامان فراہم کرتا ہی، اور اس بنا پر ہمیں قوم کیلئے گرجوں اور اس کے پادریوں کو باقی رکھنا چاہیئے"

پس قومی روایات کا ہمیشہ یہی حال ہوتا ہے، کہ اگر بعض وجوہ کی بنا پر کسی وقت انکا اثر زائل ہو گیا تو تھوڑے عرصہ کے بعد انکا غلبہ پھر عود کر آتا ہے، قومی روایات کی قوت اسقدر زبردست ہوتی ہی کہ کوئی بڑے سے بڑا انقلاب بھی ان کو پوری شکست نہیں دیسکتا، یہ قسم قسم کی تصویریں جو گرجوں میں لٹکتی ہیں، ان کا اثر گرجوں تک محدود نہیں، اور یہ ظالم وجفا کار لوگ جو عیش و آرام کیساتھ زندگی بسر کرتے ہیں، قلوبِ انسانی پر ان کا غلبہ نہیں ہوتا، کیونکہ ان کے شاہانہ جلال و

جبروت کے تحت تو چشم زدن میں الٹ دیئے جا سکتے ہیں، لیکن ارباب ایان کا جو غلبہ قلوب انسانی پر ہوتا ہے، اسے زمانہ ہی رفتہ رفتہ مٹا سکتا ہی،

(۳)

زمانہ کا اثر

قوموں کی ترقی و تنزل اور عروج و انحطاط میں جن عوامل و مؤثرات کے اثر کو دخل ہوتا ہے، ان میں زمانہ کے اثر کو بھی شمار کرنا چاہئے، زمانہ ہی کے ہاتھوں چیزیں بنتی بگڑتی ہیں، اور یہ زمانہ ہی کی کرشمہ سازیاں ہیں، کہ بالو کے تودے ایک مدت کے بعد پہاڑ دل کی شکل اختیار کرتے ہیں، غرض دنیا میں جو واقعہ ظہور پذیر ہوتا ہے، اور جو تغیرات پیدا ہوتے ہیں ان میں زمانہ کی صنعت گری کو بڑا دخل ہوتا ہے، کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ اگر چیونٹی کو کہیں ایک مدت کا عرصہ مل جائے تو وہ ایک پہاڑ کو پارہ پارہ کر سکتی ہی،

زمانہ کا اثر اس قدر قوی ہوتا ہے کہ وہ ان مؤثرات کے اثر پر بھی حاوی ہو جاتا ہی جن کے بغیر معتقداتِ جماعت کو پیدا ہونا ناممکن ہی مثلاً قومیت اور قومی روایات وغیرہ، زمانہ ہی معتقداتِ جماعت کو پیدا کرتا ہے، بڑھاتا ہے، نشو و نما دیتا ہی، اور پھر انکو مٹا دیتا ہی، معتقداتِ جماعت اسی کے سہارے پر نشو و نما حاصل کرتے ہیں اور اسی کی بدولت انکو ضعف لاحق ہوتا ہی،

یہ قدرت زمانہ ہی کو حاصل ہے کہ وہ معتقداتِ جماعت کو پیدا کرتا ہی، اور ان کی تربیت کے سامان فراہم کرتا ہے، یہی سبب ہے کہ بعض معتقدات و افکار ایک زمانہ میں خوب پھلتے پھولتے ہیں، لیکن زمانہ کا رخ بدلتے ہی ان کی بہار پر بھی خزاں آجاتی ہی، اور اس طرح فنا ہوتے ہیں کہ ان کا پتہ و نشان تک نہیں ملتا،

زمانہ ہی کو یہ خصوصیت حاصل ہی کہ وہ معتقداتِ جماعت کو سطح پہ رکھتا ہے، اور زمانہ

کی محتاج ہوتی ہے اسی طرح کسی نظامِ حکومت میں تغیر یا اصلاح کرنے کے لئے بھی ایک زمانہ درکار ہوتا ہے، غرض نظامِ حکومت اور نظامِ معاشرت کی خود اپنے اندر کوئی قدر و قیمت نہیں، وہ اپنی ذات سے نہ موزوں اور مناسب ہوتے ہیں اور نہ ناموزوں اور نامناسب، بلکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جو نظامِ حکومت کسی وقت کسی ایک قوم کے لئے موزوں ثابت ہوتا ہے، وہی نظامِ حکومت دوسری قوم کے لئے بالکل ناموزوں ہوتا ہے، اور چونکہ نظامِ حکومت اور نظامِ معاشرت کو خود قومیں اپنے لئے ترتیب نہیں دیتیں، اسلئے وہ خود ان میں کوئی تغیر بھی نہیں کرسکتی ہیں، اقوام کے مقدور میں اگر کچھ ہے، تو بس یہ ہے کہ وہ نظامِ حکومت اور نظامِ معاشرت میں اگر چاہیں تو سطحی تغیر کر دیں، لیکن اس سے اصلیت میں کوئی فرق نہیں آسکتا، اس تغیر کا اثر صرف یہ ہوگا کہ اس نظامِ حکومت کیلئے زبان نے جو لفظ مقرر کر دیا تھا، وہ متروک ہو جائیگا، اور اب اس کے بجائے کوئی دوسرا نام رائج ہو جائیگا مگر اصلیت اب بھی وہی رہے گی، جو پہلے تھی، دنیا بھر میں انگریزی قوم سے زیادہ کوئی قوم پرستار جمہوریت نہیں ہے لیکن دیکھو انگلستان میں جو نظامِ حکومت رائج ہے، وہ شخصی نظامِ حکومت ہے، پھر دنیا میں سب سے زیادہ استبداد پسند امریکہ کی اپنی نسل کی قومیں ہیں، لیکن باوجود اس کے جمہوری نظامِ حکومت کے ماتحت ہیں،

حاصل یہ کہ قومیں اپنے نظامِ حکومت اور نظامِ معاشرت کی محکوم نہیں ہوتیں، بلکہ اپنے موروثی نظامِ اخلاق کی محکوم ہوتی ہیں، پس یہ خیال کہ اگر قوموں کے نظامِ معاشرت یا نظامِ حکومت میں تغیر کر دیا جائے تو قوموں کی حالت میں انقلابِ عظیم ہو جائیگا حقیقت سے بہت دور ہے، اور جو لوگ اس کوشش میں اپنی جان کھپاتے ہیں، وہ یاد رکھیں کہ ان کو اپنے مقصد میں کبھی کامیابی نہیں ہوسکتی نظامِ حکومت میں تغیر کرنے کے لئے دھواں دھار خطبے دینے اور شورش برپا کرنے کی ضرورت نہیں ہے، جب تغیر کی ضرورت ہوگی، تو زمانہ خود ہی ان میں تغیر کریگا، قوموں کی ضرورتیں جب

پیدا ہوتی ہیں، تو از خود ان ضرورتوں کے مطابق ان کے نظامِ حکومت میں تغیر ہو ہی جاتا ہے ضرورت کے مطابق نظامِ حکومت اور نظامِ معاشرت میں تغیر کرنے کا یہی حکیمانہ اصول ہے، جو لاطینی قوموں کے خلاف انگریزوں نے ہمیشہ مرعی رکھا ہے، انگریزوں کے ملک میں کوئی جدید قانون اسوقت تک نافذ نہیں ہوتا تا وقتیکہ اس کے نافذ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی، مکالے نے (جو انگریزوں میں بہت بڑا مصنف گذرا ہے) اپنی ایک تحریر میں انگریزوں کے اس حکیمانہ اصول کی تشریح کی ہے، پہلے اُس نے ان اثرات و نتائج کا تذکرہ کیا ہے جو انگریزی قوانین سے پیدا ہوتے ہیں، پھر انگریزی قوانین کا ان قوانین سے مقابلہ کیا ہے، جو امریکہ اور یورپ کے ممالک میں لاطینی قوموں نے مختلف اوقات میں وضع کئے ہیں، پھر اس بات کی وضاحت کی ہے کہ لاطینی قوموں کے برعکس انگریزی قوم کبھی بلا ضرورت اپنے قوانین میں اضافہ یا تغیر نہیں کرتی، پھر آخر میں لکھتا ہے:

"انگلستان میں جتنے قوانین عہد جان سے لیکر عہد وکٹوریہ تک مختلف پارلیمنٹوں میں پاس ہوئے انکی خصوصیت یہ نہ تھی کہ ان میں حسن ترتیب کا خیال رکھا جاتا تھا، بلکہ ان قوانین میں جس بات کا زیادہ اہتمام کیا گیا، وہ یہ ہے کہ کوئی جدید قانون اس وقت تک کبھی نافذ نہیں ہوا تا وقتیکہ اس کے نافذ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں پیش آئی، اور ضرورت پیش آنے کے بعد بھی جب نافذ کیا گیا تو اس وقت بھی ضرورت سے زیادہ کسی قانون کو وسعت نہیں دی گئی"

لیکن چونکہ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ قوموں کے نظامِ حکومت و نظامِ معاشرت ان کے مزاجِ عقلی کا ثمرہ ہوتے ہیں، یہ ضروری ہے کہ ہم ایک ایک نظامِ حکومت کو الگ الگ لیکر اس مسئلہ کی وضاحت کریں، اور یہ موجبِ طوالت ہوگا، خصوصاً اس حالت میں کہ ہم اپنی دوسری کتاب انقلابُ الامم میں اس مسئلہ پر نہایت تفصیل کیساتھ بحث کر چکے ہیں، اس لئے ہم یہاں صرف ایک مثال سے اس مسئلہ کی وضاحت کر کے اس بحث کو تمام کئے دیتے ہیں،

سرزد ہوتے ہیں، اس کا زیادہ تر باعث اشاعت تعلیم ہے، اور ہیئت اجتماعی کے جو بدترین دشمن ہیں یعنی فوضویین (انارکسٹ) وہ عموماً ایسے لوگوں کو اپنے گروہ میں داخل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو کالجوں سے بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کرکے نکلے ہوں، موسیو ایڈولف گوئلاٹ نے جو ایک فاضل جج ہیں اعداد و شمار سے بتایا ہے کہ آج کل چار ہزار مجرموں میں سے تین ہزار مجرم گروہ طلبہ کے اور ایک ہزار ان پڑھ طبقہ کے ہوتے ہیں، اور پچاس برس کے عرصہ میں مجرموں کی تعداد ۲۲ سے ۵۵ تک پہنچ گئی ہے موسیو بند کور اور ان کے دیگر ہمعصروں نے یہ بتایا ہے کہ ارتکاب جرائم اُن جوانوں سے زیادہ ہوتا ہے جو مدارس میں جبریہ اور مفت تعلیم پاتے ہیں،

بلاشبہ طرز تعلیم اگر بہتر ہو، تو تعلیم سے عمدہ نتائج حاصل ہوتے ہیں، اور اس وقت تعلیم تہذیب کو ترقی دیتی ہے، اخلاق فاضلہ کی ترقی میں ممد ہوتی ہے، اور فنی قابلیتوں کو بڑھاتی ہے لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ لاطینی قوموں میں تعلیم کی بنا نامناسب اور غلط اصول پر قائم کی گئی ہے، خصوصاً پچیس سال کے عرصہ سے تو تعلیم میں اسقدر ابتری پیدا ہو گئی ہے کہ گو موسیو بریال، موسیو واسٹل ڈی کولنگ اور موسیو ٹائن ایسے یگانۂ روزگار علمائے اصلاح کی کوشش کی لیکن ابتک یہ تو میں اپنی اسی قدیم حالت پر بناہ رہی ہیں، میں نے بھی اپنی ایک تصنیف میں اس بات کو ثابت کیا ہے، کہ ہمارے طرز تعلیم کا ایک خراب نتیجہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے ہیئت اجتماعی کے دشمن پیدا کئے جارہے ہیں اور مذہب اشتراکیت کی جڑ مضبوط کی جارہی ہے،

یہ نتائج بد جو لاطینی تربیت سے پیدا ہوتے ہیں، اسکی اصلی وجہ یہ ہے کہ ہماری تربیت کی بنا ایسے اصول پر قائم کی گئی ہے جسکی غلطی علم النفس سے ظاہر ہو چکی ہے، ایک بڑی اصل جس پر ہماری تربیت کی بنیاد رکھی گئی ہے، یہ ہے کہ قوت حافظہ عقل کو ترقی دیتی ہے، اس سے ہماری تعلیم میں اس بات کا زیادہ خیال کیا جاتا ہے کہ حتی الامکان قوت حافظہ کو ترقی دینا چاہئے، اور اس اصول پر اس مضبوطی سے عمل کیا جاتا ہے

کہ پرائمری اسکولوں، کالجوں، بلکہ ٹریننگ کالجوں میں بھی قوتِ حافظہ ہی پر زیادہ زور دیا جاتا ہے
جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم از خود کسی عمل پر اقدام نہیں کرسکتے۔ کیونکہ تعلیم کا مدعا تو ان کی نگاہ میں
اب صرف یہ رہ گیا ہو کہ وہ واقعات کو حفظ کرلیں اور دوسروں کی آرار کے آگے سر جھکادیں،
موسیو جولیس سیمان نے جو کسی زمانہ میں وزیر تعلیم رہ چکے ہیں، ایک بار کیا خوب کہا تھا کہ

"صمیم قلب کے ساتھ اسباق کے حفظ کرلینے یا صرف ونحو کی کتابیں رٹ لینے سے زیادہ بدتر کوئی تربیت
نہیں ہوسکتی، کیونکہ اس صورت میں طالب علم کا تمام تر مقصد یہ ہوتا ہو کہ وہ استاد کو تمام غلطیوں سے محفوظ مان لے"

اگر اس تربیت کا ضرر اتنا ہی ہوتا کہ وہ کچھ مفید نہیں ہے، تو خیر ہم ان بچوں کیساتھ ہمدردی
کرکے بیٹھ رہتے جنھیں مدارس میں کلوٹر کا نسب حفظ کرایا جاتا ہو لیکن غضب تو یہ ہو کہ طالب علم جس
عالت میں زندگی بسر کررہا ہو، اس طبیعت سے اسکے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہو کہ کاش مجھکو اس سے
سے نجات ملجاتی، یہانتک کہ اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہو کہ آج کارخانہ دار کا دل اپنے کاروبار سے اُچاٹ ہوا
اور کل ایک کاشتکار بھی اپنے پیشہ سے اُکتھنے لگا، اور یونہی طبقۂ متوسط کے افراد اپنے اپنے کاموں کو
چھوڑ چھوڑ کر حکومت کی جبہ سائی کرنے لگتے ہیں، اور چونکہ اسکول سے ایسے طلبہ پڑھکر نہیں نکلتے جو
زندگی کے دشوار گذار مراحل کو طے کرسکیں، اسلئے قوم میں ایسے افراد کی کثرت ہوجاتی ہو، جو
ہیئتِ اجتماعی پر بار ہونے کے علاوہ خود بھی روز اپنے دانت کٹکٹاتے اور شورہ پشتی پر ہر دم آمادہ
رہتے ہیں، اس سے آگے بڑھو تو طبقہ متوسط کی حالت اور افسوسناک نظر آتی ہو، باوجودیکہ اسے حکومت
کی طاقت اور قوت پر بڑا گھمنڈ ہوتا ہو لیکن حکومت سے جو غلطیاں سرزد ہوتی ہیں ان پر جرح وقدح
بھی اسی طبقہ کے افراد کرتے ہیں، اور باوجود اس کے وہ از خود کسی کام کو انجام دینے کی
صلاحیت سے عاری ہوتے ہیں،

لیکن حکومت ان سند یافتہ لوگوں کو جو تیار کرتی ہو، ان میں سے کام کے لوگوں کو

چھانٹ لیتی ہے اور باقی افراد کو چھوڑ دیتی ہے، اب یہ سند یافتہ جماعت اپنے روزگار کی تلاش میں گورنمنٹ کے تمام عہدوں پر معمولی کلرک کے عہدے سے لیکر ماسٹری اور پروفیسری تک ایکدم ٹوٹ پڑتی ہے، اور حالت یہ ہو جاتی ہے کہ ایک تاجر نوآبادیوں میں اپنا کاروبار چلانے کے لئے ایک منیجر ڈھونڈھتا پھرتا ہے اور نہیں ملتا، حالانکہ ہزاروں آدمی گورنمنٹ کے ادنی سے ادنی عہدہ کے حاصل کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں، پھر جب ان بیکار لوگوں کی تعداد بیشمار ہو جاتی ہے، تو بداہتہً اسکا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ گورنمنٹ کے خلاف غضب وغصہ کا جوش پیدا ہو جاتا ہے، اور یہ بیکار لوگ فوراً کسی خاص آدمی کی قیادت میں ارتکابِ جرائم اور شورہ پشتی پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور امنِ عامہ میں خلل انداز ہوتے ہیں[1]،

لیکن سچی بات یہ ہے کہ ہنگامہ اور فتنہ کا وقت گذر چکا، اور اب صرف تجارب سے جو اقوام کے بہت بڑے مربّی ہیں، ہمارے اعمال کی اصلاح ہو سکتی ہے، اور اسی ذریعہ سے ہمیں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ ان ردی کتابوں کا پڑھنا پڑھانا اور یہ سخت ترین امتحانات بالکل بیکار ہیں، بلکہ ہمیں آپ اس عملی تعلیم میں مشغول ہونا چاہیئے، جو نئی نسل کو کاروباری دنیا اور استعماری تجاویز سے روشناس کرے، اور نسل کو ایسے کاموں میں پھنسا دے جن سے وہ بھاگتی ہے،

درحقیقت یہی فنی تعلیم جس کی آج روشن عقلیں بیتابی کیساتھ خواستگار ہیں، ہمارے محترم اسلاف کا طرز تعلیم تھا، اور اسی طرز کو ہمیشہ ان قوموں نے بھی اختیار کیا ہے، جو اپنی مضبوط قوتِ ارادی اور اقدام ذاتی کے بل پر دنیا پر قابض ہوئیں،

---

[1] یہ مصیبت صرف لاطینی قوموں کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ یہی حالت چین اور ہندوستان میں بھی ہے جب سے انگریزوں نے ہندوستان میں دیسیوں کی تربیت کی غرض سے نہیں بلکہ صرف ان کی تعلیم کے لئے اسکول جاری کئے ہیں، اس وقت سے وہاں ایک گروہ بابوؤں کا پیدا ہو گیا ہے، جسے اگر ملازمت نہیں ملتی تو حکومت کا سخت ترین دشمن بن جاتا ہے، اس بحث پر میں نے اپنی کتاب "تمدن ہند" میں تفصیل سے بحث کی ہے، اس حالت کا ان لوگوں نے بھی اندازہ کیا ہوگا جو اقلیم ہند کی وسیع سرزمین کی سیاحت کر چکے ہیں، (مولف)

اگر ان بیکار علوم اور بیکار کتابوں کے پڑھ جانے سے ہمارے قوائے عقلی میں کچھ ترقی ہوتی تو بیشک ہم اس تربیت کے مصائب کے جھیلنے کے لئے تیار ہو جاتے، لیکن کیا یہ کتابیں اور یہ علوم ہماری زندگی میں ہمارے کچھ کام آتے ہیں؟ فہم و ادراک تجارب اقدام و ارادہ یہ زندگی کے کارگر اسلحہ ہیں لیکن سخت افسوس اور رنج سے کہنا پڑتا ہے کہ کیا کتابوں سے ہمیں ان کے متعلق کوئی سبق حاصل ہوتا ہے؟ اور کیا یہ کتابیں ہم میں یہ اوصاف پیدا کر سکتی ہیں؟ یہ کتابیں گویا قبامیں اور مرقعے ہیں، کہ انسان ان کے مطالعہ سے فائدہ حاصل کر سکتا ہے لیکن کیا ان بڑے بڑے مضامین کا دماغ میں محفوظ کر لینا کچھ مفید ہے؟ بخلاف اس کے فنی تعلیم سے جو بیش بہا فوائد حاصل ہوتے ہیں، وہ تربیت مجریہ سے حاصل نہیں ہو سکتے،

ایک بہت بڑے روشنخیال مفکر موسیو ٹائن نے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے، جس کے بعض حصوں کو میں ناظرین کی ضیافت طبع کیلئے پیش کرتا ہوں، اُنھوں نے دلائل و براہین سے ثابت کر دیا ہے، کہ ہماری گذشتہ زمانہ کی تربیت اس تربیت کے بالکل مماثل تھی جو زمانہ حال میں انگریزوں اور باشندگانِ امریکہ میں رائج ہے، پھر اُنھوں نے نہایت خوش اسلوبی کیساتھ لاطینی اور انگریزی طرزِ تعلیم کا مقابلہ کیا ہے، اور دونوں کے نتائج دکھائے ہیں،

موسیو ٹائن لکھتے ہیں:۔

"افکار و خیالات تو عادۃً پیدا ہوتے رہتے ہیں، لیکن جن باتوں سے ان خیالات کا نشو و نما ہوتا ہے، وہ مختلف قسم کے مؤثرات ہوتے ہیں، جن سے ایک نوجوان کو کبھی تو کارخانوں اور کانوں میں سابقہ پڑتا ہے، کبھی بیرسٹر کے پرائیویٹ آفس اور شفاخانوں میں کبھی وہ مختلف اوزار و آلات کے مشاہدے سے متاثر ہوتا ہے، اور کبھی اُجرت پیشہ لوگوں کے مجمع سے، بلکہ اکثر اپنی ذاتی کارگذاریوں سے، یہ چند معمولی مؤثرات ہیں، جنھیں آنکھیں دیکھتی، اور کان سنتے ہیں؛ اور جب

نوجوان کے ذہن میں ان موثرات کا اجتماع ہوتا ہے، تو خواہ مخواہ اُسے حسنِ اختراع کی جانب مائل کر دیتے ہیں لیکن افسوس ایک فرنچ نوجوان اس ترکیبِ نفسی سے بالکل محروم ہی اس کے ذہن میں کبھی ان مؤثرات کا گذر تک نہیں ہوتا، جن سے استفادہ کرنے کی اُسے سخت حاجت ہی کیونکہ ایک طویل مدت تک تو وہ اسکول کی چار دیواری کے اندر ان شخصی تجارب سے بے خبر بند پڑا رہا، جن کے ذریعہ سے ایثار کی کوئی صحیح صورت اس کے ذہن میں آتی، اور جو زندگی کے کاروبار میں اس کو مدد دے سکتے، اب مدرسہ سے تعلیم حاصل کر چکنے کے بعد جو وہ نکلا، تو وہ اپنی عمر کا بیش بہا وقت ضائع کر چکا تھا، امتحان کی تیاری میں جس قدر وقت اُس نے صرف کیا تھا، وہ گویا افسوسناک ماضی اور منحوس مستقبل کے مابین حد فاصل رہا لیکن جب نتیجہ شائع ہوا، تو اُس نے دیکھا کہ کامیاب طلبہ کی تعداد تو صرف نصف یا ایک ثلث ہے، اس کے لئے یہ کس قدر گراں مصیبت کا سامنا تھا کہ وہ دن بھر ایک کرسی پر اپنے سامنے چھوٹی سی میز لیکر بیٹھا خاموشی کے ساتھ درس کو سُن رہا ہی، سچی بات یہ ہے، کہ اس طرح کی جانفشانی دو ماہ سے زیادہ اس سے نہیں ہو سکتی تھی اور اب امتحان کا وقت جو آیا، تو وہ اپنے میں محنت کرنے کی بھی قدرت نہیں پاتا، کیونکہ بے شمار علوم اس کے خزانۂ ذہن میں محفوظ کر دیئے گئے ہیں، قوتِ تعقل مفقود ہو چکی، تو اے ذہنیہ جواب دے چکے، اب نوجوان یہ سب مراحل طے کرنے کے بعد مستقل زندگی بسر کرنا چاہتا ہی، اور کاروبار کی کسی خاص لائن میں قدم رکھتا ہی، لیکن اسے کس قدر افسوس ہوگا، جب اسے یہ معلوم ہوگا کہ میری تو اوقات ضائع ہوئی، اور میں نے تعلیم پر جتنا خرچ کیا تھا، اتنی آمدنی نہیں ہوئی، یہ زبون حالت فرانس کی ہے، لیکن انگلستان اور امریکہ میں حالت اس کے برعکس ہے۔"

اس کے بعد اس جلیل القدر مورخ نے ہمارے اور انگریزی طرزِ تعلیم کے مابین جو فرق

ہیں، ان کو دکھایا ہے، اور یہ بات ثابت کی ہے کہ جتنے مخصوص اسکول ہمارے ملک میں ہیں، اپنے انگریزوں کے ملک میں نہیں ہیں، نیز یہ کہ ان کے ملک میں کتابوں کے ذریعہ سے تعلیم نہیں دی جاتی ہے، بلکہ انجنییر (مثلاً) کارخانہ میں پیدا کیا جاتا ہی، اور ہر شخص کو اس کا موقع ملتا ہی، کہ اس کی قوتِ عقلی جہانتک متحمل ہو اپنے پیشہ کو حاصل کرتا رہے، اور اگر اس کے قوائے ذہنیہ اعانت کریں تو وہ کاریگر ن کا افسر ہو جائے، یہ نہایت اعلیٰ درجہ کا جمہوری طرز ہی اور اس طرزِ تعلیم سے قوم کو حقیقی فائدہ حاصل ہوتا ہے، برخلاف اسکے ہمارا طرزِ تعلیم ایسا ہی کہ ہمیں نوجوان کی آیندہ قسمت ایک نتیجۂ امتحان پر مبنی ہوتی ہے، جو عموماً اسے اپنی عمر کے انیسویں یا بیسویں سال دینا پڑتا ہے، موسیو ٹائن لکھتے ہیں:-

"انگلستان میں کسی طالب علم کو شفاخانہ یا کسی بیرسٹر کے آفس میں داخل ہو کر تھوڑی مدت مشق اور تعلیم میں گذارنی پڑتی ہی، پہلے اُسے کچھ مختصر سے درس دئے جاتے ہیں، جن سے اس کی معلوماتِ عامہ میں اضافہ ہوتا ہی، علاوہ اس کے وقتاً فوقتاً کچھ اور بھی درس دیئے جاتے ہیں، جن پر اُسے فرصت کے وقت میں سوچنے کا موقع ملتا ہی، اس طرح وہ تھوڑی سی مدت میں اپنے تجارب کو ایک منتظم صورت میں مرتب کر لیتا ہی، دیکھو ایک یہ نظام تعلیم ہی کہ طالب علم کے قوائے عقلی کے ساتھ ساتھ اسکی قوتِ عملی بھی جلا پاجاتی ہی، آیندہ کی ترقی کا بھی راستہ صاف ہوتا جاتا ہی، اور بہت جلد طالب علم میں اختراع و ایجاد کی قوت پیدا ہو جاتی ہی، یہانتک کہ پچیس برس کے سن میں اسکی قوتِ عقلی اسقدر نمو پا جاتی ہی، کہ وہ از خود اقدام کرنے لگتا ہی اور ہر بات کا مقابلہ کرتا ہی گویا کہ وہ ایک مشین کا پہیہ ہی، جو خود ہی محرک اور خود ہی متحرک ہو" لیکن فرانس کی حالت اس سے بالکل جداگانہ ہے، وہاں تعلیم کا ایک دوسرا ہی طرز ہی جو قریب قریب چینیوں کے طرزِ تعلیم سے مشابہ ہے، اور جس سے بجز قوائے عقلی و ذہنی کی تضییع کے

اور کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔"

پھر مذکورۂ بالا بیان سے اس فلاسفر نے حسب ذیل نتیجہ اخذ کیا ہے، وہ لکھتا ہے:۔

"قوتِ حافظہ پر تعلیم کے ادوا ثلثہ طفولیت، بچپن، شباب میں زور دیا جاتا رہا اور پیمانۂ طاقت لبریز ہوگیا لیکن دیکھو طالب علم اب تک کرسی پر بیٹھا ہے، امتحان کے انتظار میں اُسکی آنکھیں کتاب پر گڑی ہوئی ہیں، اور وہ نہایت بے صبری کے ساتھ اس دن کا منتظر ہے جب اُسے ڈگری ملے گی، جب وہ سند پائے گا، اس کے سوا اُسے کسی چیز کا شوق نہیں، کیا غضب ہے کہ اس بدتر نظامِ تعلیم کی ترویج کے لئے کیسے کیسے وسائل ایجاد کئے گئے ہیں، اور کس طرح طالب علم اس نظام کا پابند بنایا جاتا ہے، عملی دنیا سے طالب علم کو نکال کر اسکولوں اور مدارس کے حجروں کے اندر بند کر دیا گیا ہے، جہاں اسے ایک مصنوعی جسمانی تربیت دیجاتی ہے، ذہن و فکر پر ایک دم بار ڈال دیا جاتا ہے، نہ مستقبل کے جانب نظر ہوتی ہے، اور نہ سن کا کچھ لحاظ کیا جاتا ہے، کسی کاروبار کا خیال تو کجا دنیا کی رزمگاہ سے جہاں آیندہ طالب علم کو مکمل اسلحہ لیکر نکلنا ہے، بالکل بحث نہیں ہوتی اور یہ بات تو بالکل پس پشت ڈال دیجاتی ہے، کہ طالب علم آیندہ خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو جائے، ہمارے مدارس میں رہ کر کوئی نوجوان ضروریاتِ زندگی نہیں حاصل کرسکتا، اس میں قوتِ تمیز پیدا ہوتی ہے، نہ قوتِ ارادہ اور نہ اعصاب ہی مضبوط ہوتے ہیں، بلکہ بجائے اسکے کہ آیندہ کے لئے آمادہ ہو، وہ کمزور و ناتواں ہو جاتا ہے، اور اس کی ذات اور اسکے قریبی مستقبل کے مابین کوئی مناسبت نہیں ہونے پاتی، اس لئے تم دیکھتے ہو کہ جہاں اُس نے پہلے پہل کسی کام میں ہاتھ ڈالا بس وہ مختلف مصائب میں گھر گیا، اور اب اس میں لنگڑے لولے کے مثل کھڑے ہونے کی قدرت نہیں باقی رہی، یہ کس قدر خوفناک تجربہ ہے جس میں اخلاق مضطرب ہوتے اور

توازنِ عقلی مختل ہوجاتا ہے، بس آگے حسرت و یاس ہے، اور ناکامی کی حائل دیوار ہے"

افسوس .. .. ناکامی .. . .حسرت موت[1]"

[1] دیکھو موسیو ٹائن کی کتاب "نظام حال" جلد دوم صفحہ ۱۸۹، یہ آخری صفحات ہیں، جو موسیو ٹائن نے تحریر کئے ہیں، اور گویا اس مشہور فلاسفر کے تمام تجربات زندگی کا خلاصہ ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ہمارے مدارس کے اساتذہ جنھوں نے فرانس کے باہر قدم نہیں نکالا ہے، ان حقائق و واقعات تک نہیں پہنچتے، حالانکہ تربیت ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے ہم قوم کے قلوب میں تحریک پیدا کر سکتے ہیں، سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ ہم میں ایسے لوگوں کا قحط ہے جو یہ سمجھتے ہوں کہ تربیت کا طریقہ مجریہ قوم میں کس قدر جلد انحطاط پیدا کر دیگا، اور ہماری نسل ترقی کے بجائے تنزل اور انحطاط کی جانب مائل ہوگی، ناظرین کیلئے مفید ہوگا، اگر وہ ٹائن کے تحریرات کو ان مشاہدات اور تجربات کے ساتھ مقابلہ کرکے پڑھیں جو امریکہ میں تربیت کے متعلق عمل میں لائے گئے ہیں، اور جنھیں موسیو پال بورگٹ نے اپنی کتاب "بحر زاخر" میں نقل کیا ہے۔

ان تمام تحریرات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری تربیت اس درجہ ناقص ہے کہ یا تو مدارس میں فوضویین (انارکسٹ) پیدا کئے جاتے ہیں یا ایسے لوگ جن میں اقدام کی قوت مفقود ہوتی ہے، اور جن کا کوئی خاص ارادہ نہیں ہوتا، بقول موسیو پال بورگٹ کے یہ دونوں صورتیں ایک متمدن انسان کے لئے بدقسمتی کا پیش خیمہ ہیں، اس کے بعد موسیو پال بورگٹ نے بدقت نظر ہمارے برباد کنندہ فرانسیسی مدارس اور ان مدارس کا جو طالب علم کو زندگی حیات کیلئے تیار کرتے ہیں، مقابلہ کرکے ثابت کیا ہے کہ صحیح دیمقراطیت اور جمہوریت وہی ہے جو ان زندہ قوموں میں پائی جاتی ہے،

فصل دوم

معتقداتِ جماعت کے عواملِ قریبہ

۱۔ ذہنی انشباح، الفاظ اور جملوں کا اثر معتقداتِ جماعت پر

الفاظ اور جملے ذہنِ جماعت پر جادو کا اثر کرتے ہیں، الفاظ کی اس مؤثرانہ قوت کا تعلق انکے لغوی یا اصطلاحی معنوں سے نہیں ہوتا بلکہ الفاظ میں یہ قوت ان ذہنی انشباح سے آتی ہے جو خیال میں پیدا ہوتے ہیں، ان ذہنی انشباح میں حسبِ اقتضائے زمانہ اختلاف ہوتا رہتا ہے بعض مستعمل الفاظ کے معانی میں جو تغیر ہوتا ہے، اسکی مختلف مثالیں، یہ بحث کہ جب مسمیات کے قدیم اسماء جماعت میں ناگواری کا احساس پیدا کرنے لگیں تو اس وقت سیاسی فوائد کے لحاظ سے جدید اسماء کا وضع کرنا ضروری ہو جاتا ہے، اختلافِ امزجہ کی بنا پر مختلف قوموں میں الفاظ کے معنی کس طرح متغیر ہو جاتے ہیں، یہ بحث کہ یورپ اور امریکہ میں "ڈیموکراسی" کے معنی کیوں مختلف ہیں،

۲۔ اوہام کا اثر معتقداتِ جماعت پر،

اوہام کی اہمیت کا بیان، یہ بحث کہ اوہام پر تمدن کی بنا ہوتی ہے، یہ بحث کہ اجتماعی نقطۂ نظر سے اوہام کی کیا ضرورت اور اہمیت ہے، جماعت ہمیشہ وہم کو واقعہ پر کیوں ترجیح دیتی ہے،

۳۔ تجارب کا اثر معتقداتِ جماعت پر،

تجارب قوموں کے ذہن میں واقعات کی اہمیت اور اوہام کی مضرت کا احساس پیدا کرتے ہیں، تجارب سے

تو یہں اس وقت اثر پذیر ہوتی ہیں، جب ان کی بار بار تکرار ہو،

۴۔ عقل کا اثر معتقداتِ جماعت پر، عقلی استدلال کا اثر جماعت پر بالکل نہیں ہوتا، جماعت بجز اپنے احساساتِ غیر شاعرہ کے اور کسی چیز سے اثر پذیر نہیں ہوتی، یہ بحث کہ تاریخی واقعات میں منطق کی کیا حیثیت اور کیا درجہ ہے، واقعاتِ تاریخی کے باعث ما فوق العقل مخفی اسباب ہوتے ہیں !!

اس باب کی فصلِ اوّل میں ہم نے اُن عواملِ بعیدہ کے اثرات کو بیان کیا تھا، جو جماعت میں یہ صلاحیت پیدا کر دیتے ہیں، کہ جماعت چند خیالات کو تسلیم کر لے، اور ان کے ماتحت عمل کے لئے مستعد ہو جائے، اب اس فصل میں ہم اُن عواملِ قریبہ کے اثرات کو بیان کریں گے، جو جماعت میں بعد کو اثر کرتے ہیں، اور جن کا اثر یہ ہوتا ہے، کہ جماعت سے بعض افعال کا صدور ہونے لگتا ہے، اس کے بعد آئندہ فصل میں ہم یہ بیان کریں گے کہ وہ عواملِ قریبہ جو جماعت سے صدورِ افعال کے باعث ہوتے ہیں، ان کے اثر کو مفید اور کارگر بنانے کے کیا کیا طریقے ہیں، اور کس قسم کے لوگ اُن کا استعمال کر سکتے ہیں،

اس کتاب کے ابوابِ سابقہ میں جماعت کے حسیات، افکار اور خیالات کے متعلق جو ایک طول طویل بحث گذر چکی ہے، اس سے بطور نتیجہ کے اُن عواملِ قریبہ کا اخذ کرنا اور ان کی حقیقت کا دریافت کرنا آسان ہو گیا ہے، جو جماعت کو آمادۂ عمل کر دیتے ہیں، نیز گذشتہ بیانات سے ہم یہ نتیجہ بھی اخذ کر سکتے ہیں، کہ کون سے عوامل جماعت پر زیادہ اثر کرتے ہیں؟ ان عوامل و مؤثرات کی قوتِ تاثیر کتنی ہوتی ہے؟ اور اس اثر کا تعدیہ تمام افراد میں کس طرح ہوتا ہے؟ خصوصاً ان اثرات کا تعدیہ جو مختلف ذہنی اشکال کی صورت میں آکر اس کے ذہن میں مرتسم ہوتے ہیں، پھر چونکہ ذہنِ جماعت میں ان اثرات کی

پیدایش مختلف وسائل اور ذرائع کی مدد سے ہوتی ہے، اور اس بنا پر اُن عوامل و مؤثرات کا بھی جو جماعت پر اثر کرتے ہیں مختلف اقسام کا ہونا ضروری ہے، اس لئے ذیل میں ایک ایک موثر سے علیحدہ علیحدہ بحث کریں گے، اور گو اس صورت میں ہم کو بعض بیاناتِ ماسبق کی تکرار کرنا پڑے گی، تاہم ہمارے نزدیک یہ بحث کچھ غیر سود مند نہیں ہے کیونکہ جماعت کی حالت قدماء کے طلسموں سے مشابہ ہوتی ہے، کہ یا تو طلسم کو حل کرو اور یا اپنے تئیں اُن کے سپرد کردو، کہ وہ تمھیں فنا کردیں،

(۱)

ذہنی اشباح، الفاظ اور جملوں کا اثر

اوپر جہاں ہم نے جماعت کے خاصۂ تخئیل آرائی کی وضاحت کی تھی، وہاں ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ جماعت ذہنی صور و اشکال سے زیادہ متاثر ہوتی ہے، اور گو ہر وقت اُن ذہنی صور و اشکال کا ذہنِ جماعت میں موجود ہونا ممکن نہیں، لیکن اگر الفاظ اور جملوں کو حزم و احتیاط کے ساتھ استعمال کیا جائے تو ذہنِ جماعت میں صور و اشکال کا پیدا کردینا بھی آسان ہوتا ہے، خاص کر جب الفاظ اور جملوں کا استعمال کرنے والا ازمنۂ سابقہ میں احتیاط و حزم کے ساتھ ان کا استعمال کرتا، تو اس کے معتقدوں کے دلوں میں اس کے الفاظ جادو کا اثر کرتے اور نفوسِ جماعت میں غیظ و غضب کی بجلی سی دوڑ جاتی، لیکن جب نفوس جوش اور غیظ و غضب سے پُر ہو جاتے تو اس وقت وہ پھر ان میں سکون کی حالت پیدا کر دیتا، غرض اپنے حزم و احتیاط اور ہوشیاری کی بدولت اس کو اس قدر طاقت حاصل ہو جاتی، کہ وہ جب چاہتا لوگوں کو رُلا دیتا، اور جب چاہتا اُن کو ہنسا دیتا،

لیکن وہ الفاظ جو اپنے اندر مقناطیسی قوت رکھتے ہیں، ان کے متعلق یہ خیال رکھنا چاہئے

کہ ان کی اس قوتِ تاثیر میں ان کے معنوں کو کبھی دخل نہیں ہوتا، بلکہ ان الفاظ کی ساحرانہ تاثیر درحقیقت مخفی ہوتی ہے اُن ذہنی اشکال اور صور کے اندر جو ان الفاظ سے ذہنِ جماعت میں پیدا ہوتے ہیں، یہاں تک کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ الفاظ جو ذہنِ جماعت پر زیادہ اثر کرتے ہیں، ان کے معنی اسی قدر زیادہ مبہم ہوتے ہیں، اور باوجود اس کے ان الفاظ کا اثر اس قدر قوی ہوتا ہے کہ گو ان الفاظ کی حقیقت اور معنی اصطلاحی سے عوام ناآشنا ہوتے ہیں، لیکن یہ الفاظ نفوس میں کچھ اس طرح گھر کرجاتے ہیں، کہ ان کے متعلق لوگوں کو یہ اعتقاد ہوجاتا ہے کہ تمام اجتماعی مشکلات کا حل ان ہی الفاظ کے ساتھ وابستہ ہے،

پھر بعض الفاظ اور جملوں کا اثر اس قدر قوی ہوتا ہے، کہ افراد کی عقلوں پر بھی یہ اثر غالب آجاتا ہے، اس اثر کے آگے دلائل و براہین بھی سپر انداز ہوجاتے ہیں، ان الفاظ اور جملوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ ادھر متکلم کے منہ سے یہ الفاظ اور جملے نکلنے بھی نہیں پائے اور ادھر سامعین پر ہیبت سی چھاگئی اور احترام و عظمت نے ان کو سرنگوں کردیا، اور یہ جادو بھی ایسا قوی ہوتا ہے کہ ان الفاظ کے متعلق بعض لوگوں کا یہ اعتقاد ہوجاتا ہے کہ ان الفاظ میں کوئی الٰہی طاقت مضمر ہے، لیکن بات یہ ہوتی ہے کہ یہ الفاظ اور جملے لوگوں کے ذہنوں میں ایسی ذہنی صور اور اشکال پیدا کردیتے ہیں جن کی کیفیت نامعلوم ہوتی ہے، بزرگی اور عظمت اُن کو ڈھانپے ہوتی ہے، اور ابہام اُن میں ایک مخفی قوت پیدا کردیتا ہے، گویا وہ معبود ہوتے ہیں جو آنکھوں سے نظر نہیں پڑتے اور ننگا ہوں سے اس طرح غائب رہتے ہیں، کہ اُن کی ہیبت و جلال سے زہاد کے بدن میں جھُرجھُری پیدا ہوجاتی ہے،

لیکن چونکہ یہ ذہنی صورتیں اور شکلیں جو الفاظ سے ذہن میں پیدا ہوتی ہیں، ان کا وجود ان الفاظ کے معنوں سے الگ اور بے تعلق ہوتا ہے، اس لئے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک لفظ

جس کا استعمال مختلف قوموں میں جاری ہی، اس سے جو خیالی شکل مختلف قوموں کے ذہنوں میں پیدا ہوتی ہے، اس میں مرورِ ایام سے اختلاف ہوجاتا ہے اور اس لفظ کا استعمال کرتے ہی اسکی یہ مختلف خیالی شکلیں ذہن کے اندر حاضر ہوجاتی ہیں،

لیکن سطور بالا میں یہ کلیہ جو بیان کیا گیا کہ نفوسِ جماعت پر صرف وہی الفاظ اثر کرتے ہیں جن کے اندر ذہنی صورتوں کے پیدا کرنے یا بالفاظِ دیگر نفرت و رغبت کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کی قوت مخفی ہوتی ہے، اور جن کے اشارہ پر قومیں آمادۂ عمل ہوجاتی ہیں، یہ کلیہ درصل تمام الفاظ کے لئے عام نہیں ہے، بلکہ بعض الفاظ ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں گو ان ذہنی صورتوں کے پیدا کرنے کی قوت پہلے مخفی تھی لیکن اب کثرتِ استعمال کے باعث اُن سے یہ قوت سلب ہوگئی، اور اب وہ خالی آواز ہوکر رہ گئے، جن کا اب سوا اس کے کچھ نہیں رہا کہ انکو استعمال کرتے وقت ہمیں غور کرنے یا سوچنے کی زحمت نہیں برداشت کرنا پڑتی، بلکہ اب ہم اُن کی ہدایتوں پر بلا تکلف عمل کرتے ہیں، یہی بات ہے کہ بچپنے میں جو الفاظ بچوں کو رٹا دیے جاتے ہیں اُن سے وہ گو اثر پذیر تو نہیں ہوتے لیکن وہ ان الفاظ کی ہدایتوں پر ہمیشہ کاربند ہوتے ہیں،

اسی طرح اگر کسی زبان کی ماہرانہ واقفیت پیدا کی جائے تو پتہ چلے گا کہ اس زبان کے مختلف ادوار میں گو الفاظ کا بالائی تغیر تو بہت آہستہ آہستہ وقوع میں آیا ہے، لیکن الفاظ کے معانی اور اور وہ ذہنی صورتیں جو الفاظ سے پیدا ہوتی ہیں، ایک دور سے دوسرے دور میں آکر ان کی بالکل قلبِ ماہیت ہوگئی ہے، یہاں تک کہ اب دوسرے دور میں آکر کسی لفظ کے جو جدید معنی پیدا ہوئے ہیں، وہ اس لفظ کے معنی متروک سے کوئی نسبت نہیں رکھتے یہی سبب ہے کہ میرا یہ خیال ہے کہ ایک زبان کا دوسری زبان میں پورا پورا ترجمہ کرنا بالکل محال ہے خاص کر کسی ایسی زبان کا ترجمہ جو اب مردہ ہوگئی ہو اب اس وقت اگر ہم یہ چاہیں کہ یونانی یا لاطینی

یا سنسکرت زبانوں کے کسی لفظ کا ترجمہ اپنی فرانسیسی زبان میں کر لیں تو گویا اس کا یہ مطلب ہوگا کہ ہم ان ذہنی اشکال اور صور کو جو ہماری اپنی روزانہ زندگی سے ماخوذ تھیں، مٹا کر ان کی جگہ ان ذہنی اشکال و صور کو دے رہے ہیں جنھیں ہماری روزانہ زندگی سے کوئی نسبت نہیں، انقلاب فرانس کے اہل حل و عقد نے اس بات کی کوشش کی تھی کہ اپنی زبان میں یونانی اور رومی زبان کے چند الفاظ مستعار لے کر اپنی روزانہ زندگی کے نظام میں یونانیوں اور رومیوں کی تقلید کریں لیکن ان کا یہ فعل اس سے زیادہ کچھ نہ تھا کہ وہ یونانی اور رومی زبانوں کے ان قدیم اجنبی الفاظ کو اجنبی اور غیر مستعمل معنوں میں استعمال کرنے لگے، گو الفاظ کی صورت یکساں سہی، لیکن بھلا کہیں ہمارے اور یونانیوں کے نظام زندگی میں کوئی مشابہت ہو سکتی ہے؟ ایک لفظ جمہوریت ہی کو لو، جمہوریت کا جو مفہوم ہمارے ذہن میں ہے اس کو اس مفہوم سے جو یونانیوں کے ذہن میں تھا کون سا لگاؤ ہے؟ یونانیوں میں اس لفظ کا جو مفہوم تھا وہ یہ تھا کہ چند استبداد پسند امرا جمع ہو جاتے اور اپنے زر خرید غلاموں پر حکومت جتاتے، گویا اس جمہوریت کی حالت دیہاتی پنچایت کی ایسی ہوئی جس کا انحصار صرف رسم غلامی پر تھا کہ اگر یہ رسم موقوف ہو جاتی تو اس جمہوریت کا بھی خاتمہ ہو جاتا، دیکھو آج کل کی ترقی یافتہ جمہوریت اور قدیم یونانی جمہوریت میں آسمان کا فرق ہے

یا اسی طرح ایک دوسرا لفظ حریت ہے، اس لفظ کے موجودہ معنی دیکھو اور اس کا مقابلہ اس معنی سے کرو جس معنی میں یہ لفظ قدیم زمانہ کی ناآشنائے حریت قوموں میں استعمال کیا جاتا تھا، قدیم زمانہ میں حریت کا دائرہ اس قدر محدود تھا کہ کسی کو ان عقائد میں جو عام طور پر اس زمانہ میں تسلیم کر لئے گئے تھے، چون و چرا کرنے کی بالکل جرأت نہیں ہوتی، اب اس کے مقابلہ میں موجودہ زمانہ میں حریت کو اس قدر وسعت دیدی گئی ہے کہ کوئی مسئلہ ایسا نہیں رہا ہے جو کبھی زیر بحث نہ لایا گیا ہو، یا اسی طرح ایک لفظ **مادر وطن** ہے، اس لفظ کے معنی بھی اب پہلے

سے بہت مختلف ہو گئے ہیں، یونان میں جب ایتھنز اور اسپارٹا کی جدا جدا حکومتیں قائم تھیں، اور ان شہروں کے باشندے آپس میں لڑا جھگڑا کرتے تھے، تو اُس وقت ان کے درمیان کوئی ایسا عام رشتہ نہ تھا، جو ان سب کو متحد کرتا، مختلف شہروں کے باشندے اپنے دیس کو اپنا وطن سمجھتے تھے، ایتھنز والوں کا دیس اور وطن ایتھنز تھا، اور باشندگانِ اسپارٹا کا وطن اسپارٹا، غرض ان مختلف شہروں کے باشندے باوجودیکہ جغرافیانہ حدود کے لحاظ سے ایک دوسرے کے ہمسایہ تھے لیکن ان کے درمیان کوئی ایسا وسیع رابطۂ وطن نہ تھا، جس میں وہ سب اپنے کو حصہ دار اور شریک سمجھتے، پھر یونانیوں سے قطع نظر کرکے خود ہمارے ملک کے قدیم باشندوں کے حالات پر نظر دوڑاؤ، تو یہاں بھی تمہیں یہی سماں نظر آئے گا، قدیم زمانہ میں ملک گال کا ایک ایک ضلع علیحدہ علیحدہ ایک وطن تھا جس میں مختلف المذاہب، مختلف العقیدہ اور مختلف اللسان قومیں بستی تھیں، جو باہم ایک دوسرے سے سخت متنفر تھیں، ان میں نہ کوئی رابطۂ قومی تھا نہ کوئی جامعۂ دینی، اور نہ کوئی جامعۂ سیاسی، لیکن جب سیزر کے زمانہ میں رومیوں نے ملک گال کو فتح کیا، اس وقت جامعۂ سیاسی اور جامعۂ وطنی کے برکات ان ممالک کو حاصل ہوئے،

غرض مختلف زبانوں میں اس قسم کے بہت سے الفاظ موجود ہیں جن کے معنوں میں زمانہ کے تغیرات کے ساتھ ساتھ بہت بڑا انقلاب ہو گیا ہے، اور اب ان کے قدیم معنوں کا دریافت کرنا بھی خالی از دقت نہیں ہے، بلکہ بہت سے وہ الفاظ جو اب تک اپنے قدیم معنی میں استعمال کئے جاتے ہیں، ان میں بھی اگر مرورِ ایام سے اختلاف و تغیر ہو گیا ہو تو کوئی تعجب نہیں مثلاً "بادشاہ" اور "شاہی خاندان" یہ الفاظ اگرچہ اپنے قدیم معنی میں استعمال کئے جاتے ہیں لیکن جس طرح اور دیگر الفاظ کے معنوں میں انقلاب ہوا ہے، اسی طرح ممکن ہے کہ ان الفاظ کے معنوں میں بھی کوئی تغیر ہو گیا ہو، اور یہ الفاظ پہلے اور کسی معنی میں استعمال کئے جاتے ہوں جو اب متروک ہو گئے ہوں،

پس ہمارے گذشتہ بیان سے جو اہم تفریع مستنبط ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ چونکہ الفاظ کے استعمالات اور معانی محض وقتی ہوتے ہیں، اور مرورِ ایام اور اختلافِ اقوام سے ان کے معنوں میں تغیر ہو جاتا ہے، اس لئے اگر ہم جماعت کو اثر پذیر کرنا چاہیں تو اُس وقت ہمارا پہلا فرض یہ ہونا چاہیئے کہ ہم ان الفاظ کو ان معنوں میں استعمال نہ کریں، جو قدیم زمانہ میں مستعمل تھے، اور نہ الفاظ کا استعمال ان معنوں میں کریں، جن کو جماعت سے زیادہ عقلمند لوگ استعمال کرتے ہیں، بلکہ صرف اُن معنوں میں الفاظ کا استعمال کریں جو اس قوم میں بروقتِ خطابت مروج و معروف ہوں،

اسی بنا پر جب کسی ملک میں سیاسی ہیجان دور ہو کر سکون کی کیفیت پیدا ہو گئی ہو اور جماعت بعض الفاظ سے اظہارِ نفرت کرنے لگی ہو تو اس وقت اُس قوم کے سیاست دانوں پر واجب ہو جاتا ہے کہ جلدی سے الفاظ کی ظاہری صورتوں کو تبدیل کر دیں اور ان کے معانی یا با لفاظ دیگر ذہنی اشکال سے تعرض نہ کریں، کیونکہ ان معانی اور ذہنی صورتوں کا تعلق زیادہ تر قوموں کے موروثی مزاج کیساتھ ہوتا ہے، جس میں تغیر کرنا کچھ کھیل نہیں ہے، ٹاکوئل نے جو ایک بہت بڑا نقاد گذرا ہے، آج سے پیشتر کہا تھا، کہ اس کے زمانہ میں فرانس میں قنصلوں اور حکومت کا بڑا فرض یہ تھا، کہ قدیم نظاماتِ حکومت و نظامِ معاشرت کیلئے ہر وقت جدید الفاظ فراہم کرتے رہیں یعنی قوم کے ذہن میں کسی لفظ سے جو ذہنی شکلیں پیدا ہوتی ہیں، وہ جب قوم کو ناپسند ہونے لگتیں، تو فرانس کے سیاستداں اس لفظ کے بجائے کسی جدید لفظ کا استعمال شروع کر دیتے اسی غرض سے انھوں نے شخصی ٹیکسوں کا نام "ٹیکس جائداد منقولہ" رکھا تھا اور چندوں کو وہ "غیر معین ٹیکس" کہا کرتے تھے،

پس قوموں کے اہلِ سیاست کا سب سے بڑا فرض یہ ہوتا ہے کہ جب جماعت کے کانوں کو کوئی لفظ ناگوار گذرنے لگے، تو اس لفظ کی جگہ پر کسی دوسرے لفظ کو لا کر رکھدیں، جو جماعت کے

نزدیک ناپسند نہ ہو، بات یہ ہے کہ نفوسِ جماعت پر الفاظ کا اتنا قوی اثر پڑتا ہے، کہ بعض اوقات
کسی ناپسندیدہ شئے کو کسی معروف لفظ سے ظاہر کر دینا جماعت کی ناپسندیدگی کو دور کر دیتا ہے، اسی
بنا پر موسیو ٹاکویل کا قول ہے کہ انقلابِ فرانس کے اہلِ حل و عقد نے الفاظ "حریت و مساوات"
کو جو اس زمانہ میں نہایت مقبول تھے، بار بار استعمال کر کے ایسی مستبدانہ حکومت قائم کر لی،
جو ڈاہومیا کے زیادہ مناسبِ حال تھی، اور احتساب کا ایک ایسا محکمہ ایجاد کیا جو مذہبی محکمہ
انکویزیشن سے مشابہت رکھتا تھا، اور ایک ایسا فتنہ برپا کیا جیسا کبھی بلاد میکسیکو میں برپا ہوا
تھا، پس اب اس بنا پر حکام سلطنت کی حالت وکلا اور بیرسٹروں سے ملتی جلتی ہے، جن کا وظیفہ
عمل الفاظ کا انتخاب اور ان کو مناسب مواقع پر استعمال کرنا ہوتا ہے، لیکن اس وظیفہ عمل کے
انجام دینے میں دقت جو واقع ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ گو ایک قوم کے تمام طبقے ایک ہی قسم کے
الفاظ کا استعمال ہمیشہ کرتے ہیں، لیکن باوجود اس کے ہر طبقہ کے افراد ان الفاظ سے جدا جدا
معنی مراد لیتے ہیں، اس لئے الفاظ کے انتخاب ور اظہار ناپسندیدگی کا کوئی خاص معیار نہیں مقرر کیا جا سکتا"

غرض امثلۂ بالا سے یہ بات خوب واضح ہو گئی کہ زمانہ کے اثر سے الفاظ کے معنوں میں کس قدر
عظیم الشان تغیر ہو جاتا ہے، لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی زمانہ میں مختلف الجنس اقوام
میں جو الفاظ روزمرہ مستعمل ہوتے ہیں، قومی اختلاف کی بنا پر مختلف قومیں ان الفاظ کے مختلف
معنی مراد لیتی ہیں، جن کو ایک دوسرے سے کوئی نسبت نہیں ہوتی ہے، البتہ چونکہ الفاظ کے ان
معنوی فرق کو وہ شخص بخوبی ادراک نہیں کر سکتا جس نے دنیا کی مختلف قوموں میں کبھی بود و
باش اختیار نہیں کی ہے، اس لئے میں یہاں اس مسئلہ کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتا، ہاں صرف
یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ معنوی فرق اُن الفاظ میں زیادہ نظر آتا ہے، جو نہایت کثرت سے لوگوں
میں شائع ہوتے ہیں، مثلاً موجودہ زمانہ میں الفاظ ڈیموکراٹی، اشتراکیت، جمہوریت، وغیرہ کو نہایت

کثیر الاستعمال ہیں لیکن محض قومی اختلاف کی بنا پر مختلف قوموں میں ان الفاظ کا استعمال مختلف معنوں میں ہوتا ہے،

ایک لفظ جمہوریت کو لو، جو یورپ کی مختلف قوموں میں مستعمل ہے کیا اس لفظ کی تصویر ذہنی ایک اٹالین اور ایک انگریز دونوں کے ذہنوں میں یکساں پیدا ہوتی ہے؟ اور کیا اس لفظ کا جو مفہوم ایک اٹالین اور ایک انگریز سمجھتا ہے، ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا؟ لاطینی قوموں کے نزدیک تو جمہوریت کا مطلب یہ ہے کہ افراد کا ارادہ ذاتی اور استقلال حکومت کے ارادہ اور استقلال کے اندر فنا ہو جائے، افراد سوسائٹی کے تمام فرائض ترک کر کے محض حکومت کے دست نگر ہو جائیں کہ حکومت سوسائٹی کے منافع کی حفاظت کے لئے جو تدابیر چاہے، اختیار کرے، بخلاف اس کے ایک سکین انگریز خصوصاً ایک امریکن لفظ جمہوریت سے جو مفہوم سمجھتا ہے، وہ یہ ہوتا ہے کہ بجائے حکومت کے افراد سوسائٹی کے فرائض و واجبات انجام دیں اور افراد کا استقلالِ ذاتی، حکومت کے استقلال پر غالب رہے، حکومت افراد کی مرضی کے تابع ہو، نہ یہ کہ افراد حکومت کی مرضی کے تابع ہوں، حاصل یہ کہ ایک لفظ جمہوریت جو مختلف قوموں میں کثیر الاستعمال ہے، کہیں تو یہ لفظ افراد کے استقلالِ ذاتی کو مٹا کر حکومت کا پایہ بلند کر دیتا ہے، اور کہیں حکومت کے ارادہ کو افراد کے ارادہ میں جذب کر کے افراد کے استقلالِ ذاتی کو اور قوی کر دیتا ہے،

(۲)

اوہام کا اثر

دنیا پر جب سے آفتابِ تمدن نور افگن ہوا ہے، اُس وقت سے اب تک جماعت ہمیشہ اوہام ہی کے آگے سرنگوں رہی ہے، اور موجدینِ اوہام ہی کے لئے اس نے مختلف ناموں

یں طرح طرح کے بُت، ہیاکل اور معابد تعمیر کئے ہیں، دنیا کا ہر وہ تمدن جو کبھی روئے زمین پر آب وتاب سے جلوہ گر ہوا۔ اس کے آگے آگے ہمیشہ اوہام کی خیالی مشعلیں رہنمائی کرتی جاتی تھیں، اوہام وتخیلات ہی کی بنیاد پر کالڈیا اور قدیم مصر کے تمدنوں کی عمارت تعمیر کی گئی انہی کی بنیاد پر قرونِ وسطیٰ میں مساجد اور گرجے تعمیر کئے گئے، اور انہی اوہام کی بدولت سو برس پیشتر براعظم یورپ زیروزبر کر دیا گیا، صرف یہی نہیں بلکہ اوہام کا طوقِ محکومیت ہر فنی، سیاسی اور اجتماعی تحقیق اور انکشافت کی گردن میں بھی نظر آتا ہے، اور گو بعض اوقات انسان اس بات کا ارادہ کرتا ہے، کہ ان اوہام کی بنیادوں کو متزلزل کردے، جو اس پر غلبہ کئے ہوئے ہیں، لیکن جس وقت وہ اس ارادہ کو عملی جامہ پہناتا ہے تو اس کو انقلاب اور شورش کے مصائب بھی جھیلنا پڑتے ہیں، اور گو وہ کبھی اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے، لیکن ان اوہام کی بنیاد کو متزلزل کرتے ہی وہ پھر دوسری مصیبت میں گھر جاتا ہے، یعنی اس پر اب دوسرے اوہام مستولی ہو جاتے ہیں، غرض اوہام کے قیود سے انسان کو کبھی رہائی نہیں مل سکتی، حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان اوہام کا پابند نہ ہوتا، تو شاید اپنے قدیم توحش سے وہ کبھی نجات نہ پا سکتا، اور ہمیشہ وہ وحشت اور بربریت کی بیشمار وادیوں میں بھٹکتا پھرتا، اوہام خیالاتِ باطلہ ہی سہی لیکن انہی کا صدقہ ہے کہ قومیں علوم وفنون میں ہر جدید سے جدید تحقیق کے دریافت کرنے کی کوشش کرتی ہیں، اور تہذیب و تمدن میں ہر نفیس سے نفیس شئے اختراع کرتی ہیں،

واینال لوزیار کہتا ہے کہ

عجائب خانوں اور لائبریریوں میں جو کچھ انسان کا فراہم کردہ سرمایہ جمع ہے

اس کو جلادو اور تمام بڑے بڑے آثار جو فنون اور ادیان کے نمونہائے صنعت ہیں

انکو ایک ایک کرکے توڑ ڈالو، تو انسان کے تخیل کی بنائی ہوئی کون سی چیز باقی رہ گئی؟
لیکن قوموں کے نامور رہنما اور جادو بیان شعرا نفوس کے اندر آتش امید پھر نئے سر
سے مشتعل کر دیں گے، انسان اُمید کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، لیکن علم بھی امید کے اس
مصالح کو فراہم نہیں کر سکتا، علم نے پچاس برس تک اس امانت کو اپنے پاس محفوظ
رکھنا چاہا، لیکن علم انسان کو آئندہ کے متعلق خیالی امیدیں دلانے میں ناکام رہا، کیونکہ اس کو
فریب دینا اور جھوٹ بولنا نہیں آتا تھا۔"

دیکھو گذشتہ صدی میں فلاسفہ نے اپنے زمانہ کے تمام دینی، سیاسی اور اجتماعی اوہام و
تخیلات کو جو صدیوں سے ہمارے اجداد کے دستور العمل رہتے چلے آرہے تھے، مٹا دینا چاہا، لیکن
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے، تو انھوں نے امید و رجا کے دروازوں
کو بند کر دیا، اور خیال کے مٹ جانے کے بعد اب مردہ فطری قوتوں کی حکومت تمام دنیا پر قائم
ہوگئی، جو نہ ضعیفوں پر شفقت کرتی ہیں اور نہ بیکسوں پر ترس کھاتی ہیں، اور گو ان قدیم اوہام کو
مٹانے کے بعد فلسفہ بہت تیزی سے ترقی کرنے لگا، لیکن اپنی ترقی کے باوجود جماعت کے لئے
ایسے خیالات فراہم نہ کر سکا، جو اس کی کلفتوں کو دور کرتے اور ناامیدی اور بے کسی کے عالم
میں خوش نما اُمیدوں کا سبز باغ دکھلاتے، جماعت کی مثال تو رینگنے والے کیڑے کی ایسی ہے
کہ جہاں اس کو روشنی دکھائی دی وہیں دوڑ گیا، اس کے لئے تو اُمید کی مشعل ہونا چاہئے جو
اس کی رہبری کرے، پس اب جماعت نے جب یہ دیکھا کہ فلسفہ اس کے خیالی آرام و سکون کے
اسباب فراہم نہیں کرتا تو وہ فلسفہ سے نا اُمید ہو کر تاجرانِ بلاغت کی دوکانوں پر جو اپنے
خطیبانہ انداز میں اس نادر اور کمیاب گوہر بیش بہا کو فروخت کرتے پھرتے تھے عاجزی کے ساتھ
بھیک مانگنے دوڑی گئی، اور چونکہ قومیں حقیقت کو چھوڑ کر ملمع کے پیچھے ہمیشہ سرگرداں رہتی

رہتی ہیں، اس لئے ان جادو بیان خطیبوں کا منتر جماعت پر چل گیا، اور اب وہ ان کی زر خرید کنیز بن گئی، زمانۂ حال میں اشتراکیت کا جو اثر ترقی کر رہا ہے، اگر اس کے اسباب دریافت کرو تو پہلی نگاہ اس تخیل پر پڑے گی، جو مذہب اشتراکیت کا روح رواں ہے، اور جس کی حقیقت کو اگرچہ علم نے کھول کر رکھ دیا ہے، لیکن باوجود اس کے اس مذہب کا جادو لوگوں کو مسحور ضرور کر لیتا ہے، بات یہ ہے کہ یہ مذہب اس وجہ سے اور زیادہ ترقی کر رہا ہے کہ اس مذہب کے داعی حقائق اشیاء سے ناواقف ہیں، اور اپنی ناواقفیت کی بدولت لوگوں کو یہ امید دلاتے ہیں، کہ اپنی زندگی میں وہ ابدی سعادت سے بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں، حالانکہ یہ فریب ہے، اور انسان کو کبھی اس حیات فانی میں ابدی سعادت نصیب ہی نہیں ہو سکتی، لیکن اس واہمے نے لوگوں کے ذہنوں میں کچھ اس قدر رسوخ پیدا کر لیا ہے، کہ اب اُس نے ان قدیم اوہام کی جگہ حاصل کر لی ہے، جو زمانۂ قدیم میں ہمارے اجداد کے دستور العمل تھے،

حاصل یہ ہے کہ جماعتیں اپنے دور حیات میں کبھی تشنۂ حقیقت نہیں ہوتیں، بلکہ ان پر ہمیشہ ان اوہام کا غلبہ ہوتا ہے، جو ان کے مضطرب قلبوں کے لئے سامانِ امید فراہم کرتے ہیں،

(۳)

تجارب کا اثر

صفحات بالا میں ہم وضاحت کر چکے ہیں کہ قومیں اپنے آبائی اور موروثی اوہام و خیالات کی کس درجہ پابند ہوتی ہیں، اور یہ اوہام و خیالات اس قدر مستحکم ہوتے ہیں، کہ ان کو اپنی جگہ سے ہلانے میں اکثر ناکامیابی ہوتی ہے، لیکن اوہام کا یہ اثر و غلبہ صرف اسی وقت تک ہتا ہے، جب تک واقعات و تجارب کی بدولت ان کی بنیادیں متزلزل نہ ہو جائیں، اوہام کی یہ مضبوط

چٹانیں جو عملِ توارث کی بدولت صدیوں میں استحکام حاصل کرتی ہیں. واقعات و تجارب کا سیلان ہی صدیوں میں ان کو کاٹ سکتا ہے، اور انسان کے ذہنوں کے اندر آباد اجداد کا متروکہ سرمایہ قدیم اوہام کی صورت میں جو بند محفوظ رہتا ہے، اس کو چشم زدن میں اگر کوئی چیز جلا کر خاک سیاہ کر سکتی ہے، تو وہ واقعات و تجارب کی آتشِ عالم سوز ہے، غرض وہ عظیم الشان اوہام جو ذہنِ انسانی میں مستحکم ہو گئے ہیں، رفتارِ واقعات کی بدولت ان کا استحکام خاک میں مل جاتا ہے، ان کی مضرتیں کھل جاتی ہیں، اور صدیوں کا بنا بنایا کھیل دم کے دم میں بگڑ جاتا ہے

لیکن یہ تجارب جو اوہام کے استحکام کو نقصان پہنچاتے ہیں، اُن کے اثر و فعل کرنے کے لئے بھی دو باتوں کی ضرورت ہوتی ہے،

۱۔ تجارب جس قدر زیادہ عمومیت لئے ہوئے ہوں گے، اسی قدر زیادہ وہ اوہام کے اثر کو مٹا سکیں گے،

۲۔ تجارب بار بار وقوع پذیر ہوں، تا کہ خوب اچھی طرح وہ اوہام کے اثر کو مٹا سکیں،

ان دو شرطوں میں سے دوسری شرط نہایت اہم ہے، اور اوہام کے مٹنے کے لئے واقعات کے مکرر وقوع پذیر ہونے کی اس قدر ضرورت ہوتی ہے کہ بسا اوقات ایک صدی کے واقعات دوسری صدی کے لوگوں کے لئے بالکل سرمایۂ عبرت نہیں ہوتے، اور یہی وجہ ہے کہ تاریخی واقعات سے کسی بات پر استدلال کرنا بالکل بے کار ہوتا ہے، گذشتہ زمانہ کے تاریخی واقعات کی اگر کوئی قدر و قیمت ہماری نگاہ میں ہو سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ ان سے صرف یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ تجارب کے موثر اور کارگر ہونے اور نفوسِ جماعت میں جو اوہام راسخ ہو گئے ہیں ان کے مٹانے کیلئے تجارب کے بار بار وقوع پذیر ہونے کی کس قدر ضرورت ہوتی ہے،

موجودہ صدی اور اُس کے پیشتر کی صدی میں ایسے ایسے ہولناک واقعات کا ظہور ہوا ہے

جن کی کوئی دوسری نظیر صفحاتِ تاریخ میں نہیں مل سکتی، اور شاید کسی زمانہ میں ایسے ہولناک واقعات کا ظہور نہ ہوا ہوگا، اس لئے مورخین ضرور ان ہولناک واقعات کا بار بار تذکرہ کریں گے، اور یہ دو صدیاں ہمیشہ انسان کی تاریخ میں اس بات کے لئے یادگار رہیں گی، کہ انسان کے سیاسی اور اجتماعی حالات میں جن واقعات نے انقلاب کر دیا، ان کا ظہور ان ہی دو صدیوں میں ہوا ہے،

ان عجیب تر واقعات میں سے جو گذشتہ صدی میں گذر چکے ہیں، ایک واقعہ انقلاب فرانس کا ہے، اس واقعہ میں محض اس بات کا تجربہ حاصل کرنے کی غرض سے کہ کوئی قوم صرف عقلی اصول کی پابندی کرکے نئے سرے سے زندہ کی جا سکتی ہے یا نہیں ہم کو مسلسل بیس سال تک تمام ممالکِ یورپ میں انقلاب اور شورش کی آتشِ سوزاں کو مشتعل کئے رہنا پڑا، جس میں سیکڑوں بے گناہوں کا خون ہو گیا، پھر اس کے بعد پچاس برس کی مدت میں دو کمزور تجربوں کے ذریعہ سے ہم کو یہ بات معلوم ہوئی کہ شاہانِ وقت جن قوموں کو بلندی پر لے جانا چاہتے ہیں، ان پر وہ سخت مشقتوں کا بار ڈال دیتے ہیں، اور باوجودیکہ یہ دونوں تجربے اپنے مقاصد میں کامیاب رہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شاید طمانیت اور سکون پیدا کرنے کے لئے ناکافی ثابت ہوئے، ان میں سے پہلا تجربہ تو وہ تھا کہ جس میں سیکڑوں جانوں کے نقصان کیسا اجنبی حملہ کے مصائب بھی ہم کو برداشت کرنا پڑے، اور دوسرے تجربہ میں ہمارے ملک کا ایک حصہ بھی ہم سے جدا ہو گیا، اور ایک باقاعدہ اور دوامی لشکرِ جرار کے رکھنے کی ضرورت محسوس کی گئی، اور تیسرے تجربہ کا عنقریب ظہور ہونے والا ہے، حاصل یہ کہ جس آخری جنگ نے ہماری فراہم کردہ دولت کو برباد کر ڈالا، اس کی اہمیت اس وجہ سے اور زیادہ بڑھ گئی ہے کہ فرانسیسیوں کا یہ اعتقاد جو جرمن افواج کی بابت مدتوں سے قائم تھا کہ اس کی

حیثیت جیش ملی (نیشنل گارڈ) سے زیادہ نہیں، اس کی اچھی طرح قلعی کھول دی گئی۔[1]

اسی طرح جو قومیں وطنی تجارت کی اس غرض سے حامی ہیں کہ اپنی تجارت کا دروازہ مسدود کر دیا جائے، ان کے سامنے ہم اگر دلائل و براہین پیش کرنا چاہیں تو ان تمام ناخوشگوار واقعات کو دہرانا پڑیگا، جو بیس سال کی مدت میں ہماری تجارت کے خلاف وقوع میں آئے ہیں۔

(۴)

عقلی استدلال کا اثر

اگر ہمیں یہاں یہ بتانا نہ ہوتا کہ نفوس جماعت عقلی استدلال سے بالکل اثر پذیر نہیں ہوتے تو شاید جماعت کے موثرات قریبہ کے ضمن میں اس بحث کا لانا ہی بیکار ہوتا،

تاہم اس سے قبل بھی متعدد مقامات پر بیان کر چکے ہیں، کہ براہین و ادلہ سے جماعت مطلقاً

---

[1] اس مسئلہ کے متعلق ہمارے ملک کی رائے عام جن واقعات پر مبنی تھی ان کی حقیقت سے لوگ عام طور پر نا واقف تھے، بات یہ تھی کہ ان دنوں ہمارا جیش ملی (نیشنل گارڈ) معمولی حرفت پیشہ اصحاب سے مرکب تھا، جو فوجی نظام اور ڈسپلن سے نا آشنائے محض تھے، اس بنا پر لوگوں کے ذہن میں یہ خیال راسخ تھا کہ جرمنی کا جیش ملی بھی اسی قسم کا ہوگا اور چونکہ اس قسم کی فوج کے خیال سے ان کو خوف بھی کچھ نہ تھا، اس لئے جماعت کو اپنے اس خیال پر اصرار تھا، موسیو ٹیرس ۳۱ دسمبر ۱۸۶۷ء کو پارلیمنٹ میں جو اسپیچ دی اس کا ایک جملہ موسیو اولیفیہ نے اپنی ایک جدید الطبع کتاب میں نقل کیا ہے، موسیو ٹیرس گو اپنے زمانہ کا بہت بڑا سیاست داں تھا، تاہم رائے عام کا اس قدر پابند تھا کہ کہتا تھا کہ "جرمنی کے پاس باقاعدہ فوج کے علاوہ جس کی تعداد ہماری افواج کی تعداد کے مساوی ہے، صرف ایک قومی گارڈ ہے، جیسا کبھی ہمارے پاس بھی تھا، اور جس کو کوئی اہمیت حاصل نہیں"، موسیو ٹیرس کے اس خیال کی وہی وقعت ہو سکتی ہے، جو اس کے اس خیال کی ہوئی، یعنی جو اس نے ریلوے کی بابت ظاہر کیا تھا۔

(مؤلف)

اثر پذیر نہیں ہوتی، بلکہ جماعت پر اگر کسی عقلی استدلال کا اثر ہوتا بھی ہے تو صرف اس استدلال
کا جو اشیا کی سطحی مماثلت پر مبنی ہوتا ہے، اور جس کی منطقی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں ہوتی، اور
اسی بنا پر جو خطیب جماعت کو متاثر اور مسحور کرنا جانتا ہے، وہ کبھی کسی امر کے متعلق جماعت کی
عقل سے فتویٰ نہیں مانگتا، بلکہ ہمیشہ وہ جماعت کے شعور سے فیصلہ طلب کرتا ہے[1]،

جماعت کو کسی حقیقت کے سمجھانے اور کسی امر کے متعلق مطمئن کرنے کے لئے خطیب کو اپنے
خطبہ میں جن باتوں کے لحوظ رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ حسب ذیل ہیں:-

۱- خطیب کو اُن خاص خاص احساسات، جذبات اور اعتقادات کا علم حاصل کرنا چاہئے
جن میں جماعت کے شعور کو بیدار کرنے کی قوت موجود ہو،

۲- پھر ترتیب بیان میں خطیب کو اس بات کا لحاظ بھی ضروری ہے کہ حتی الامکان وہ
اپنے مافی الضمیر کو ایسی سادہ مثالوں اور تشبیہات کے ذریعہ سے ادا کرے جو کسی واقعہ یا کسی شے

---

[1] جماعت پر اثر ڈالنے کے بارہ میں قواعد منطقی اور اصول عقلی کو جو ضعف حاصل ہے، اس کی ایک بین دلیل
محاصرۂ پیرس کے زمانہ میں خود میرے مشاہدہ سے گذری، میں نے ایک روز کچھ لوگوں کو دیکھا کہ وہ ایک فوجی کمانڈر
کو سرائے لوفر کی جانب جو ان دنوں مرکز حکومت تھا کھینچے لئے جا رہے تھے، لوگ جو اس کے گرد تھے غصہ میں بھرے
ہوئے تھے اور اس کمانڈر کا جرم یہ بتاتے تھے کہ یہ غنیم یعنی جرمنوں کو مدد پہنچانے کی غرض سے ایک قلعہ کا
فوٹو لے رہا تھا، یہ لوگ محل کے دروازہ پر پہنچے ہونگے کہ اتنے میں دروازہ کے اندر سے حکومت کا ایک ممبر نکلا
جو بلند آواز خطیب بھی تھا، اور اس نے لوگوں کو شور و غل مچاتے دیکھکر اصل واقعہ دریافت کیا، میں اس خیال میں
تھا کہ شاید یہ اس فوجی افسر پر سے الزام دفع کرنے کے لئے اس مجمع کو یہ تشفی بخش جواب دیگا کہ یہ جرم درحقیقت
اس شخص کا نہیں ہے، بلکہ یہ جرم فوٹوگرافروں کی ایک جماعت کا ہے جنھوں نے اس قلعہ کے فوٹو لئے، جو شہر کے دوکانداروں
کے پاس موجود ہیں لیکن مجھ کو سخت حیرت ہوئی جب میں نے اسکو یہ کہتے سنا کہ "اچھا اس شخص سے بازپرس کیجائیگی
اور حکومت اس معاملہ کی تحقیقات کر کے اس شخص کو سزا دیگی" اسکا یہ کہنا تھا کہ شورش دفع ہو گئی اور مجمع متفرق ہو گیا
لیکن اس کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک پاؤ گھنٹے کے بعد وہ مجرم بھی محل سے اپنے گھر صحیح و سالم واپس گیا، اس واقعہ میں اگر خطیب
مجمع کے سامنے دلائل منطقیہ پیش کرتا تو شاید وہ خود بھی اس مجمع کے سامنے سے جانبر نہ ہو سکتا۔ (مولف)

کا ایک موثر نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچ دیں،

۳- پھر خطیب کے لئے یہ بھی ضروری ہو کہ وہ خطبہ دیتے وقت ہر لمحہ یہ اندازہ کرتا رہے کہ اس کے کلام کا سامعین پر کیا اثر پڑا تاکہ ضرورت کے وقت وہ برمحل فوراً اپنے کلام میں تغیر کر سکے خطبہ دیتے وقت نفوسِ سامعین میں جو اثر پیدا ہوتا ہے، اور جس کی بنا پر اکثر خطیب کو اپنے کلام میں تغیر کرنا پڑتا ہے، اس سے ہمیں اس بات کی وجہ بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ قبل سے تیار کیا ہوا خطبہ سامعین پر کیوں اثر نہیں کرتا؟ کیونکہ اس صورت میں خطیب کو سامعین کی حالت نظر انداز کر کے اپنے فراہم کردہ افکار و خیالات کا پابند ہو جانا پڑتا ہے، اور اسی لئے سامعین ان افکار و خیالات سے بالکل اثر پذیر نہیں ہوتے، لیکن منطقیین جو پر زور دلائل منطقیہ سے کسی امر کے ثابت کرنے کے عادی ہو گئے ہیں، ان سے جماعت کو مخاطب کرتے نہیں بنتا، کیونکہ وہ ہمیشہ خطابت کے مذکورہ بالا اصول کو نظر انداز کر کے اپنے دعوؤں کو منطقی دلائل سے ثابت کرنا چاہتے ہیں، جو جماعت کے لئے بالکل بیکار ہوتے ہیں، اور جن سے جماعت ذرہ برابر اثر پذیر نہیں ہوتی، اور اسی بنا پر منطقیین کو تعجب ہوتا ہے، جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان کے پر زور دلائل جماعت کے اثر پذیر کرنے میں بالکل قاصر ہیں، منطقیین کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں جس قسم کے دلائل پیش کرتے ہیں، اُن کا فیصلہ اس قدر ناطق اور بدیہی ہوتا ہے، کہ اگر بیجان مادہ کو بولنے اور بات چیت کرنے کی قدرت ہوتی تو وہ بھی ان دلائل کی قوت کو تسلیم کر لیتا، ان کا یہ قول بیشک صحیح ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ مادہ اور جماعت دونوں اس بات میں یکساں ہیں کہ منطقی دلائل کا تسلیم کرنا تو کجا وہ ان دلائل کو سننا بھی گوارا نہیں کرتے، جسے ہماری بات کا یقین نہ آتا ہو، وہ کسی وحشی انسان یا کسی بچہ کے سامنے منطقی استدلال پیش کر کے دیکھ لے، معلوم ہو جائیگا کہ وہ اپنے اس طرز سے جماعت کے

ساکت کرنے میں کس قدر قاصر ہے،

اچھا اس کو جانے دو، ایک وحشی کے سامنے شعور و احساس کے مقابلہ میں عقلی دلائل کو پیش کرکے تجربہ کرنے کی ضرورت نہیں، ہمارے دعوے کے ثابت کرنے کے لئے یہی بات کیا کچھ کم ہے، کہ ایک عرصہ تک وہ مذہبی اوہام و خیالات جو عقلی اصول کے خلاف تھے، دنیا کی عقلوں پر مسلط رہے، اور تقریباً دو ہزار سال کی مدت تک دنیا کی روشن عقلیں ان ہی خیالات کے زیر فرمان رہیں، یہاں تک کہ کہیں اس صدی میں آکر ان کی صحت و عدم صحت کے متعلق بحث و تحقیق کا دروازہ کھولا گیا، قرون وسطیٰ اور نہضت جدیدہ کے ابتدائی دور میں گو روشنخیال لوگ بکثرت موجود تھے، لیکن باوجود اس کے کسی عقلی دلیل کی بنا پر ان کے ذہن میں کبھی یہ خیال نہیں گذرا کہ ان کے زمانہ کے مذہبی اوہام و خیالات بالکل غلط ہیں، اور جادوگرنی کے جلائے جانے اور شیطان کے بہکانے وغیرہ کے متعلق ان لوگوں نے زبان تک نہ ہلائی، اس کی وجہ یہی تھی کہ جماعت اپنی بے عقلی کی بدولت جن اوہام و خیالات کے زیر فرمان تھی، ان کے غلبہ کی بنا پر خود ان روشن خیال لوگوں کو ان کی بابت کوئی شک و شبہہ پیدا ہی نہیں ہوتا تھا،

لیکن اب سوال یہ ہے کہ جماعت عقلی اصول کی پیروی جو نہیں کرتی تو کیا اس سے قوموں کی عام ترقی میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے، ؟

اس سوال کے جواب میں مجھے صرف یہ کہدینا کافی معلوم ہوتا ہے، کہ قوموں نے آج تک جن احساسات و مشاعر کے ماتحت رہ کر عظیم الشان ترقیاں حاصل کی ہیں، وہ جادۂ عقل سے کتنے ہٹے ہوئے ہیں، لیکن باوجود اس کے قوموں کے عظیم الشان انقلابات اور تغیرات میں ان ہی احساسات و مشاعر کو ہمیشہ دخل رہا ہے، بلکہ میرا خیال

یہ ہے کہ اگر انسانی تمدن کی بنا ان احساسات و مشاعر پر نہ ہوتی تو شاید انسان کو عظیم الشان ترقیاں بھی نصیب نہ ہوتیں،

حقیقت یہ ہے کہ ہر قوم اپنی عقلی سطح کی تہ میں چند قوانین مضمر رکھتی ہے، جو اس کے انجام اور مآلِ کار کا فیصلہ کرتے ہیں، اور قوم ایک بے شعوری کی حالت میں ان ہی نوامیس اور قوانین کے زیر فرمان ہوتی ہے، البتہ ان مخفی قوانین اور پوشیدہ قوتوں کے متعلق ہمارا علم بہت کمزور ہوتا ہے، اور ان مخفی رازوں کے انکشاف کا یہ طریقہ نہیں کہ ہم کسی قوم کے تاریخی ادوار میں ایک ایک جزئی واقعہ کے اسباب و علل کی جستجو کریں، بلکہ جب تک اس قوم کے تاریخی دور پر ایک عام نظر دوڑا کر بڑے بڑے انقلابات اور عظیم الشان تاریخی حوادث کے اسباب و علل کو دریافت نہ کیا جائے، اُس وقت تک ان مخفی قوتوں کا پتہ نہیں لگتا، جو قوموں کی تاریخ میں جدید باب کا اضافہ کرتی ہیں،

کیا یہ عقل میں آنے کی بات ہے کہ ایک جاہل زرگر گیلو نامی تاریخ میں اتنی عظیم الشان شہرت حاصل کرتا ہے، کہ اس کے نام پر دنیا میں تمدن کا سنگِ بنیاد رکھا جاتا ہے، پھر کیا یہ کسی کے اندیشہ میں گذر سکتا تھا کہ عرب کے خانہ بدوش وحشی اپنے بے برگ و گیاہ صحراؤں سے ایک بارگی امنڈ امنڈ کر نکلیں گے، اور یونانیوں اور رومیوں کی دریافت کردہ دنیائے قدیم کے ایک وسیع حصہ میں ایسی زبردست حکومت قائم کریں گے جو ہیبت و شوکت میں سکندر کی حکومت سے بھی بڑھ کر ہوگی، پھر بالآخر یہ کس کو گمان تھا کہ ایک حقیر سپاہی یورپ میں پیدا ہوگا، اور ایک باقاعدہ چھوٹی سی فوج لے کر دنیا کی زبردست قوتوں پر فتوحات حاصل کر کے تاریخ میں ایک زرین یادگار چھوڑ جائیگا،

ہاں بس عقل کو حکما اور فلاسفہ کے لئے چھوڑ دو، وہ اپنے حجروں کے اندر بیٹھے بیٹھے

خاموشی کے ساتھ خیالی تک بندیاں کیا کریں، اور ان سے قوموں کے معاملات میں مداخلت کی درخواست مت کرو، کیونکہ اکثر اوقات علی رغم عقل، انسان کی ذہنی دنیا میں ان احساسات و مشاعر کا ظہور ہوتا ہے، جو باوجودیکہ اصولِ عقلی کے سخت خلاف ہوتے ہیں، مگر تمام تمدنوں اور تہذیبوں کا سنگِ بنیاد ہمیشہ ان ہی مشاعر و احساسات پر رکھا جاتا ہے، مثلاً انکارِ لذات، ایمان بالدین، حبِ مجد، حبِ وطن وغیرہ وغیرہ،

فصل سوم

قائدینِ جماعت (یعنی لیڈروں) کے خصائص

۱۔ قائدینِ جماعت، جماعت کو فطری طور پر ایک لیڈر کی احتیاج ہوتی ہے، لیڈروں کے نفسانی خصائص، لیڈر جماعت کے لئے ایک دستور العمل تجویز کرتے اور جماعت میں باقاعدگی پیدا کرتے ہیں، یہ بحث کہ لیڈروں کو مطلق العنان ہونا ضروری ہے، لیڈروں کے اقسام، یہ بحث کہ لیڈروں کے لئے پختہ عزم اور مستقل ارادہ کی کیوں ضرورت ہوتی ہے۔

۲۔ لیڈروں کے وسائلِ عمل، تاکید، تکرار اور تعدیۂ اثر کے ذریعہ سے لیڈر کس طرح جماعت کو متاثر کرتے ہیں، جماعت پر ان مؤثرات کا درجہ بدرجہ کیا اثر ہوتا ہے، یہ بحث کہ قوم کے ادنیٰ طبقہ سے اعلیٰ طبقہ کی جانب، تعدیۂ اثر کس طرح وقوع پذیر ہوتا ہے، یہ بحث کہ قوم کے تمام طبقوں میں کسی جدید خیال کی اشاعت کس طرح ہوتی ہے۔

۳۔ نفوذ۔ نفوذ کی تعریف اور اس کے مختلف اقسام کی تشریح، نفوذ مکتسب اور نفوذ فطری کی تشریح، ان دونوں کی مختلف مثالیں، یہ بحث کہ قائم شدہ نفوذ کا زوال کس طرح ہوتا ہے،

گذشتہ ابواب میں نہایت تفصیل کے ساتھ معلوم ہو چکا کہ جماعتوں کی نفسانی ترکیب کن عناصر سے ہوتی ہے، نیز وہ کون سے عوامل و مؤثرات ہیں جو نفوسِ جماعت پر اثر کرتے ہیں اور جن کے اثر سے جماعت کے قوائے عقلی میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے، اب صفحاتِ ذیل میں

ہم یہ بیان کریں گے کہ ان عوامل و موثرات سے کام لینے کے کیا کیا طریقے ہیں، اور کون لوگ ان وسائل کو استعمال کر سکتے ہیں،

(۱)

قائدینِ جماعت کے خصائص

یہ ایک قانونِ فطرت ہے کہ جب حیوانات کے بعض افراد ایک جگہ جمع ہوتے ہیں تو حالتِ اجتماع میں ان کو ایک رئیس کی اطاعت اور فرماں برداری کرنا پڑتی ہی، لیکن (جیسا کہ صفحاتِ بالا میں گذر چکا ہی) انسانی جماعتیں محض چند افرادِ انسانی کے اجتماع ہی سے عبارت نہیں ہیں، بلکہ انسانی جماعتیں حیوانی جماعتوں کے خلاف اپنے بعض نفسانی خصوصیات بھی رکھتی ہیں، جن کا ظہور انسانوں کے خیالات و افعال میں صرف اُسی وقت ہوتا ہی، جب وہ حالتِ اجتماع میں آجاتے ہیں، اس وقت افرادِ انسانی ہمہ تن تقلید ہوتے ہیں، اور بہت جلد متاثر ہو جاتے ہیں، اب ان میں قوتِ فاعلی کی جگہ پر قوتِ انفعالی کا غلبہ ہوتا ہے، اور اب وہ اپنے اعمال و افعال سے یہ ظاہر کرنے لگتے ہیں کہ گویا ان پر مسمریزم کا عمل کر دیا گیا ہے، اور جو حکم ان کو دیا جاتا ہے، اس کی تعمیل کے لئے ہمہ تن تیار ہو جاتے ہیں، غرض حالتِ اجتماع میں آکر افراد میں تمام وہ خصائص پیدا ہو جاتے ہیں جو انکو ہمہ تن کسی ارفع ذات کی محکومیت قبول کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں، یہی ارفع ذات جو جماعت پر حکومت کرتی ہے، اس جماعت کی قائد، رئیس، ہادی اور لیڈر کہلاتی ہے، یہ قائد اور لیڈر جماعت میں انتظام پیدا کرتا ہے، جماعت کے افعال کی مطلق العنانی کے ساتھ نگرانی کرتا ہے، اور جماعت کے قوائے عمل سے حسبِ موقع و محل اپنی مرضی کے مطابق جو چاہتا ہے

کام لیتا ہے، گویا جماعت اس کے ہاتھ میں ایک آلۂ ہیجان کی طرح ہوتی ہے، کہ یہ قائد اسے جدھر چاہتا ہے پھیرتا ہے،

لیکن لیڈر کے لئے جو بات سب سے ضروری ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ قبل اس کے کہ قیادت کی مسند پر وہ اپنے لئے جگہ حاصل کرے، کچھ دنوں وہ جماعت کے دیگر افراد کی طرح مقتدیوں اور مقلدوں کی صف میں رہ کر دوسرے لیڈروں کی فرماں برداری کر چکا ہو، یا جس خیال کی جانب اب وہ لوگوں کو بلا رہا ہے، وہ خود اس خیال کو اپنے ذہن و دماغ پر اس طرح مسلط کر چکا ہو کہ اب اس کے دماغ میں بجز اس ایک خیال کے جس کی وہ اشاعت کر رہا ہے کوئی اور خیال باقی نہ رہا ہو، اور اس خیال کے خلاف جتنے خیالات ہیں، وہ سب اسکو باطل اور وہم نظر آنے لگے ہوں، جب تک قائد اس رتبہ کو حاصل نہیں کر لیتا ہے اس وقت تک اس میں قیادت کی صلاحیت اور اہلیت نہیں پیدا ہوتی ہو، روبسپیر نے جو انقلاب فرانس کا بانی تھا، اپنے خیالات کی اشاعت جب شروع کی ہے تو اس سے پہلے وہ خود اپنے تئیں روسو کے خیالات میں بالکل محو کر چکا تھا،

لیکن اپنے تئیں کسی خیال میں محو کر دینے کا یہ مطلب نہیں ہوتا، کہ قائد غور و فکر کے ذریعہ سے اپنے خیالات میں پختگی پیدا کرے، کیونکہ قائد کے لئے جس بات کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے، وہ غور و فکر کی عادت نہیں، بلکہ عمل کی عادت ہے، اور اگر قائد بجائے عمل کے غور و فکر کی عادت ڈالے تو اس کے ذہن میں شکوک پیدا ہونے لگیں، اس کے ارادہ میں تزلزل و رخنہ پیدا ہو جائے، اور اس کا جوش سرد پڑ جائے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قائد اپنے اس خیال میں جس کی وہ اشاعت کر رہا ہے، اس قدر پختہ ہو گیا ہو کہ باوجود موانع اور مصائب کے حائل ہونے کے وہ ہر وقت اپنے خیال کی اشاعت اور اپنے مقصد کی عزت

میں سرگرم رہے، دنیا کا خوف، حکومت کا ڈر، جان و مال کی محبت اعزہ و اقربا کی ملامت، غرض دنیا کی کسی مصیبت کا خیال اس کو اپنے مقصد کی دعوت سے کسی وقت باز نہ رکھ سکے، حاصل یہ ہے کہ قائد کے لئے کچھ یہ ضروری نہیں، کہ ذہن و ذکاوت میں کوئی اس کا ہمسر نہ ہو، بلکہ قائد کے لئے جس بات کی ضرورت ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ اس کا عزم اس قدر پختہ ہو کہ کوئی طاقت اس کے ارادہ کو اپنی جگہ سے ہلا نہ سکے، اور یہی وجہ ہوتی ہے کہ قائدینِ جماعت عموماً ایسے افراد سے نکلتے ہیں، جن کے اعصاب مریض اور جن کے قوائے عقلی مختل اور قریب بہ جنون ہوتے ہیں، اعصاب کی بے حسی ان کے جذبات کو مردہ کر دیتی ہے اور قوائے عقلی کا اختلال ان کو غور و فکر کی اجازت نہیں دیتا، اور اسی وجہ سے ان کا اعتقاد اس قدر پختہ ہوتا ہے کہ کوئی دلیل نہ ان کے خیال کو باطل کر سکتی ہے، اور نہ کوئی حجت ان کے خیال کو پلٹ سکتی ہے، تحقیر و تذلیل سے اثر پذیر ہونا تو درکنار، یہ باتیں اپنے خیال میں اور ان کو پختہ اور مضبوط کر دیتی ہیں، اپنے خیال کے دھن میں ان کو نہ اپنی جان کی پروا رہتی ہے، نہ خاندان اور مال کی، اور نہ وہ اپنی ان خدمتوں کے صلہ میں قوم سے کوئی اجر طلب کرتے ہیں، بلکہ اُلٹے وہ اپنے تئیں قوم پر سے نثار کر دیتے ہیں، اور انکی قوتِ اعتقادی ان کے الفاظ میں حیرت انگیز اثر اور رُعب پیدا کر دیتی ہے،

لیڈروں کے یہ اوصاف جن کا اوپر تذکرہ کیا گیا، اسقدر کامیاب اور نادر ہوتے ہیں کہ گو تاریخ دعویٰ کرتی ہے، کہ عموماً ہر قوم میں کسی نہ کسی وقت کوئی نہ کوئی قائد ضرور پیدا ہوا ہے، لیکن نظرِ انصاف سے دیکھو تو بہت کم قائد ایسے نکلیں گے جو واقع میں قیادت کی اہلیت رکھتے ہوں، بلکہ اس کے خلاف قائدین کی فہرست میں تمھیں ایسے لوگ بھی نظر پڑیں گے جو اپنے موثرانہ خطبوں اور اسپیچوں کے ذریعہ سے لوگوں کو مسحور کرتے تھے، اور

اس کے بعد اپنے ذاتی اغراض لوگوں کو دھوکہ دے دے کر حاصل کرنا چاہتے تھے، اور گو ان کا نفوذ ان تدبیروں سے بڑھ جایا کرتا تھا، مگر آخر ملمع کہاں تک اصلی حقیقت کو چھپا سکتا ہے، کسی نہ کسی وقت ان کو ناکامی ہوتی تھی، ہاں البتہ وہ لوگ جو نفوس جماعت پر قابو پاکر جماعت کی تحریک کے باعث ہوئے ہیں، مثلاً سینٹ بطرس، لوتھر، سافونارولا اور قائدینِ انقلابِ فرانس، یہ لوگ بھی نفوسِ جماعت کو اپنی جانب مائل کرنے میں اس وقت تک کامیاب نہ ہوئے تاوقتیکہ انھوں نے اپنے اپنے خیالات میں پختگی اور اپنے ارادہ میں استحکام نہ پیدا کر لیا، لیکن جب ایک مرتبہ ان کو کامیابی حاصل ہوگئی، تو پھر انھوں نے نفوسِ جماعت میں وہ زبردست اعتقاد پیدا کر دیا، جس کے باعث انسان اپنے خیال کا غلام بن جاتا ہے،

پس قائدینِ جماعت کا وظیفۂ عمل صرف یہ ہوتا ہے، کہ وہ نفوسِ انسانی میں اعتقاد اور قوتِ ایمان پیدا کر دیتے ہیں، اور یہی بات ہے کہ قائدین کا اثر اپنی جماعتوں پر نہایت قوی ہوتا ہے، کیونکہ قوتِ ایمان ایک ایسی قوت ہے کہ جس شخص میں پیدا ہو جاتی ہے، اسکی قوت میں دس گنا اضافہ ہو جاتا ہے، انجیل میں بہت صحیح آیا ہے، کہ قوتِ ایمانی پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہلا سکتی ہے، جو لوگ انقلاباتِ تاریخی کے باعث ہوئے ہیں، وہ چند مسکین اور ایمان دار لوگ تھے، جن کی قوتِ ایمانی نہایت مضبوط و مستحکم تھی، یہ ضعفا کے بس کی بات نہیں کہ کسی ایسے مذہب کی ایجاد کریں جو لوگوں کے قلوب پر غلبہ حاصل کرنے یا ایسی بڑی بڑی حکومتوں کی بنیاد ڈالیں، جو دنیا کے اس کنارہ سے اُس کنارہ تک پھیلی ہوئی ہیں، لیکن یہ اوصاف جن کا اوپر تذکرہ کیا گیا، صرف قوموں کے ان بڑے بڑے لیڈروں اور رہنماؤں میں پائے جاتے ہیں، جو شاذ و نادر کبھی کبھی پردۂ وجود پر ظاہر ہوتے ہیں لیکن

ان کے بعد پھر ایسے لوگوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، جو کسی قہوہ خانے میں کھڑے ہو کر چند ایسے جملوں کی تکرار شروع کر دیتے ہیں، جن کے معنوں سے وہ خود اگرچہ واقف نہیں ہوتے لیکن اتنا جانتے ہیں، کہ اگر ان الفاظ اور جملوں کے مطابق عمل کیا گیا، تو ان کی تمام امیدیں پوری ہو جائیں گی،

انسان کی حالت یہ ہے کہ جب وہ جماعت میں شامل ہوتا ہے تو اُسے کسی نہ کسی لیڈر کی اطاعت کرنا پڑتی ہے. کیونکہ جماعت میں اکثر افراد اس قابل نہیں رہتے کہ اپنے پیشہ یا کاروبار کے علاوہ کسی اور مسئلہ میں اپنی مستقل رائے قائم کریں، بلکہ طبقۂ عوام کے افراد کی حالت تو یہ ہوتی ہے، کہ جہاں اُنھوں نے اپنے پیشہ یا کاروبار سے فرصت پائی بس تمام افکار و خیالات اُن کے دماغ سے نکل گئے اور اب وہ اپنے لیڈر کے قبضہ میں ہیں، وہ ان کو جدھر چاہتا ہے، گھماتا ہے، اور یہ اُس کی اطاعت کرتے ہیں، لیکن کبھی لیڈروں کے قائم مقام روزانہ اخبارات اور رسائل ہوا کرتے ہیں، جو روز مفید خیالات اور پُراثر جملوں سے اپنے ناظرین کی ضیافتِ طبع کرتے اور راے عام کی قیادت کا فرض انجام دیتے ہیں،

لیکن قائد کے اثر و نفوذ کے لئے ایک شرط یہ بھی لازمی ہے، کہ قائد مطلق العنان اور مجسمۂ استبداد ہو اور اس کی قوت و غلبہ کے سامنے جماعت سپر انداز ہو جائے اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ کاروباری اور مزدوری پیشہ طبقہ بعض ایسے لیڈروں کے زیر فرمان ہوتا ہے، جن میں گو کوئی خاص بات نہیں ہوتی، لیکن ان کا استبداد اور ان کا غلبہ لوگوں کو اس طرح مقہور کر لیتا ہے کہ یہ لیڈر اپنے ہم پیشہ طبقہ کے اوقاتِ عمل کی تحدید کرتے ہیں، مناسب شرحِ اجرت مقرر کرتے ہیں، اسٹرائیک اور شورشیں برپا کراتے ہیں، اور پھر ان شورشوں کو خود ہی فرو بھی کرا دیتے ہیں،

زمانۂ حال میں جب سے لوگوں کو حکومتوں کی کارروائیوں میں نکتہ چینی کرنے کی اجازت دیدی گئی ہے، اُس وقت سے اس قسم کی شورش برپا کرنے والے لیڈر جو اپنی اپنی جماعتوں میں ممتاز اور صاحب اثر ہوتے ہیں، اس قدر فرعون بے ساماں ہوگئے ہیں کہ جماعتیں اب حکومت سے زیادہ ان لیڈروں سے ڈرتی اور حکومت سے زیادہ ان کی اطاعت اور فرماں برداری کرتی ہیں یہاں تک کہ اگر کسی اتفاقی حادثہ کے باعث کسی اسٹرائیک کرنے والی جماعت کا رئیس و قائد جماعت کی نظروں سے غائب ہوجاتا ہے، تو جماعت فوراً پراگندہ اور منتشر ہوجاتی ہے، کیونکہ اب اس جماعت کا وہ قائد ہی نہیں رہا جو تمام تحریکات کا بانی تھا، پیرس میں ابھی کچھ عرصہ ہوا، ایک کمپنی کے مزدوروں نے اسٹرائیک برپا کی، اس تحریک کے سرغنہ دو شخص تھے، جب وہ دونوں گرفتار کرلئے گئے تو اسٹرائیک کا بھی خاتمہ ہوگیا، اس سے معلوم ہوا کہ نفوس جماعت میں جس قسم کے شعور کے پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، وہ حریت اور آزادی کا حس نہیں، بلکہ اطاعت اور فرماں برداری کا شعور ہے، اور جماعت فطری طور پر ہر اُس شخص کی فرماں برداری کے لئے تیار رہتی ہے، جو اپنا اثر جماعت پر قائم کرلیتا ہے،

لیکن قائدین جماعت کی ہمیشہ دو ممتاز قسمیں ہوتی ہیں:۔

۱۔ ایک قسم کے قائد وہ ہوتے ہیں، جن کا ارادہ تو مضبوط اور مستحکم ہوتا ہے لیکن جن کے ارادہ کی پختگی عارضی اور وقتی ہوتی ہے، یہ درجۂ دوم کے قائد ہیں، جو اکثر قوموں میں ظاہر ہوتے ہیں، یہ قائد خود بھی شجاع اور بہادر ہوتے ہیں، اور بزدلوں کو بھی شجاع اور بہادر بنا دیتے ہیں، فرانس میں نائی اور موراٹ ایسے ہی لوگ گذرے ہیں، اور ہمارے زمانہ میں گریبالڈی کس پایہ کا شجاع اور صاحب عزم ہوا ہے، کہ ایک تھوڑی سی جماعت

کو ساتھ لے کر اس نے نیپلز کے صوبہ کو فتح کر لیا۔ حالانکہ اس کے مقابلہ پر جو فوج تھی وہ تعداد اور خوش ترتیبی میں گریبالڈی کی فوج سے بدرجہا فائق تھی۔

لیکن باوجودیکہ اس قسم کے قائدین کا عزم نہایت پختہ اور مضبوط ہوتا ہے، تاہم ان کے مضبوط ارادوں میں اکثر اس وقت تزلزل واقع ہو جاتا ہے، جب اُن کا وہ مقصد جس کی خاطر اُنھوں نے اپنی زندگی کو وقف کر دیا تھا، حاصل ہو گیا ہو، بلکہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ جب ان لیڈروں نے اپنی اصلی حالت کی جانب عود کیا ہے، تو وہ بالکل کمزور اور ضعیف الارادہ پائے گئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے قائدین اس وقت تک اپنے فرائضِ منصبی نہیں ادا کر سکتے تاوقتیکہ ان کے اوپر بھی خود کوئی خاص خیال یا کوئی خاص طاقت مسلط نہ کر دی گئی ہو،

۲- ان قائدین کے مقابل میں ایک دوسرا گروہ اور ہے، جن کا ارادہ درجۂ دوم کے قائدین کی طرح وقتی اور تغیر پذیر نہیں ہوتا، بلکہ یہ قائدین اپنی مضبوط قوتِ ارادی کے بل پر عظیم الشان سلطنتوں اور قوی الاثر مذاہب کی بنا ڈالتے ہیں، جن کا اثر و غلبہ ان قواد کے مرنے کے بعد بھی مدتوں قائم رہتا ہے، سینٹ پال[۱]، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کریٹاف، کولمبس، ڈولیسپس اپنے اپنے زمانہ میں اسی طرح کے لوگ ہوئے ہیں، اس قسم کے قواد کی حالت یہ ہوتی ہے کہ خواہ ذہن و ذکاوت میں اپنے زمانہ کے لوگوں سے وہ کتنے ہی گرے ہوئے ہوں، لیکن دنیا ہمیشہ ان کے قبضہ میں رہتی ہے، کیونکہ مضبوط عزم ایک ایسا ملکہ ہے، جو اگرچہ نادر الوجود ہے، تاہم جس شخص میں پیدا ہو جاتا

[۱] سینٹ پال، کولمبس، ڈولیسپس گو اپنے زمانہ میں کتنے ہی نامور ہوئے ہوں لیکن ہم مسلمانوں کے عقیدہ میں کبھی ان ناموروں کو وہ رتبہ حاصل نہیں ہو سکتا جو پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) اور دیگر پیغمبران مذاہب کو حاصل ہے (مترجم)

ہے، تمام دنیا اس کے قدموں پر گر پڑتی ہے، البتہ چونکہ لوگ اس بات سے واقف نہیں ہوتے کہ اس مضبوط عزم کے پردے میں کون سی طاقت پوشیدہ ہوتی ہے، اس لئے وہ ان قائدین کے کارنامے دیکھ دیکھ کر حیرت میں پڑ جاتے ہیں،

مضبوط ارادہ اور پختہ عزم کی اگر کوئی تازہ ترین مثال تلاش کرنا چاہو تو اس نامور شخص کے حالات زندگی کا مطالعہ کرو، جس نے اپنی ہمت اور ارادہ سے ایسا کام کر دکھایا جس کے آگے بڑے بڑے بادشاہوں کی ہمتیں پست ہو گئی تھیں، مضبوط عزم اور پختہ ارادہ کی بدولت بعض اوقات جن خوارقِ عادت کا ظہور ہوتا ہے، ان کی ایک تازہ ترین مثال براعظم ایشیا اور براعظم افریقہ کے درمیان نہر سویز کے جاری کرنے کا واقعہ ہے، اس واقعہ کی تفصیل میں ڈاکٹر کنرالیس کی زبانی ناظرین کو سناتا ہوں۔ ڈاکٹر کنرالیس شروع سے آخر تک اس واقعہ میں شریک رہا ہے، اس کی زبان سے واقعات کی اصلی حقیقت کا خوب انکشاف ہو سکے گا، وہ لکھتا ہے:۔

"ڈولسیپس کبھی کبھی مجھ سے افتتاح نہر سویز کے واقعات تفصیل کے ساتھ بیان کیا کرتا تھا، اُس نے مجھ سے یہ تمام واقعات بیان کئے، کہ اُس نے اپنی تجویز کو عملی جامہ پہنانے میں کتنی مصیبتیں برداشت کیں، کیونکہ اُس نے محال کو ممکن کر دکھایا، اور کیونکر اُس نے اس ناامیدی کا مقابلہ کیا، جو کبھی کبھی اس پر مستولی ہو جاتی تھی، وہ بیان کرتا تھا کہ اس تجویز کے خلاف انگلستان سے اکثر صدائیں بلند ہوا کرتی تھیں، فرانس اور مصر بالکل الگ اور خاموش تھے، مگر مصر کا فرانسیسی مشیر مال سب سے زیادہ اس تحریک کا مخالف تھا، یہاں تک کہ جب اُس نے دیکھا کہ مزدور اس کا کہنا نہیں مانتے، تو اُس نے پانی بند کر دیا، اور اس طرح اُس نے مزدوروں کو اس بات پر مجبور کیا

کہ وہ کام کرنے سے انکار کر دیں، ان تمام مخالفانہ صداؤں اور شور وغل کے علاوہ فرانسیسی وزیر جنگ اور تمام انجینیروں اور تمام باخبر اور اہلِ علم لوگوں کو یقین تھا، کہ ناکامی لازمی اور حتمی ہے، یہاں تک کہ ناکامی کے متعلق اکثر پیشین گوئیاں بھی کی گئیں، لیکن آخرکار دنیا نے دیکھ لیا، کہ جس تجویز کے متعلق تمام دنیا نے ناممکن ہونے کا فیصلہ کر دیا تھا، اسکو عملی جامہ کس طرح پہنایا گیا"

غرض مختصر یہ کہ صفحاتِ تاریخ میں درجۂ اوّل کے قائدین کی فہرست اگر تلاش کیجائے اور اُن قائدین کے اسمار ڈھونڈھے جائیں، جن کا عزم وارادہ غیر متزلزل ومحکم ہوا ہو تو شاید قائدین کی فہرست میں اس قسم کے اسمار تو کم نکلیں گے، لیکن ان کمیاب ونادر الظہور افراد کا وصفِ امتیازی جو صفحاتِ تاریخ میں نمایاں رہا ہے، یہ ہے کہ ان قوادنے ہمیشہ ادوارِ تاریخ میں ایک نیا انقلاب پیدا کر دیا ہے،

(۲)

لیڈروں کے وسائلِ تاثیر وعمل

قائدینِ جماعت جن کے خصائص کا اوپر تذکرہ گذر چکا نفوسِ جماعت میں جن تدابیر اور ذرائع سے تحریک واثر پیدا کرتے ہیں، ان میں سے ایک ذریعہ تمثیل بیانی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ قائدین ہمیشہ اپنے اُس خیال یا اُس مقصد کو جس کی وہ اشاعت کر رہے ہیں، یا جس کے حاصل کرنے کے لئے وہ قوم کو آمادہ کر رہے ہیں، کچھ اس طرح مبالغہ کا رنگ چڑھا کر خطیبانہ اور موثرانہ انداز میں جماعت کے سامنے پیش کرتے ہیں، کہ جماعت صرف ان کے بیان کو سنکر فوراً آمادۂ عمل ہو جاتی ہے، لیکن عموماً یہ سب تدبیریں

صرف اسی وقت کارگر ہوتی ہیں، جب پہلے سے موثراتِ بعیدہ نے نفوسِ جماعت میں اثر پذیری کی صلاحیت پیدا کر دی ہو، نیز قائد جو جماعت کو مخاطب کر رہا ہے، صاحبِ نفوذ بھی ہو،

لیکن بعض اوقات قائدین کی غرض یہ نہیں معلوم ہوتی کہ نفوسِ جماعت میں کوئی تحریک پیدا کیجائے، یا جماعت کو کسی کام کے لئے آمادہ کیا جائے، بلکہ بعض اوقات لیڈروں کی صرف یہ غرض ہوتی ہے کہ کسی خاص عقیدہ یا خاص خیال کی (جو لیڈر کے ذہن میں پیدا ہوا ہو) جماعت میں بھی اشاعت کی جائے، اس وقت عموماً قائدین ذریعہ بالا کے علاوہ بعض دوسرے ذرائع بھی استعمال کرتے ہیں اور وہ ذرائع حسبِ ذیل ہیں :-

۱- تاکید یعنی کسی بات کو ادعاد تحکم کے ساتھ ادا کرنا،

۲- تکرار یعنی ایک ہی خیال کی بار بار تکرار کرنا،

۳- تعدیۂ اثر یعنی اس بات کی کوشش کرنا، کہ جو اثر کسی ایک فردِ جماعت پر ہوا ہے اس سے سارا مجمع متاثر ہو جائے،

مدعیانہ و متحکمانہ اندازِ بیان جو شک و تذبذب کے الفاظ اور عقلی دلائل و براہین سے بالکل پاک و صاف ہو، جماعت پر بہت جلد اس کا گہرا اثر ہوتا ہے، اور متکلم جن خیالات کا اظہار اس انداز میں کرتا ہے، سامعین اثر پذیر ہو کر فوراً ان خیالات کو تسلیم کر لیتے ہیں، متکلم اپنے خیالات کے اظہار میں شک و تذبذب اور عقلی دلائل و براہین سے جس قدر زیادہ گریز کریگا، اسی قدر اس کے کلام کا سامعین پر زیادہ اثر پڑیگا، مدعیانہ اندازِ بیان کی یہی شدتِ تاثیر ہے، جس سے دنیا کے بڑے بڑے بانیانِ مذاہب اور بڑے بڑے سیاست داں ہمیشہ واقف ہوتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ مذہبی کتابوں اور قانونی تعزیرات میں اسی طرز کا، ہمیشہ

خیال رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح اہلِ سیاست جب قوم کو کسی بات کیلئے برانگیختہ کرنا چاہتے ہیں یا صنعت پیشہ لوگ جب اپنی صنعت کو رواج دینا چاہتے ہیں تو اسی مدعیانہ انداز بیان کے ذریعہ سے اپنی غرض حاصل کرتے ہیں،

لیکن ادعاو تحکم کی قوت بھی ناتکمل اور ادھوری رہتی ہے، تاوقتیکہ اسے ایک دوسری طاقت سے تقویت نہ پہنچائی جائے، جس کا نام تکرار ہی، میرا خیال ہو کہ شاید نپولین کا یہ مقولہ ہے کہ "خطابیات کے اسلحہ خانہ میں سب سے زیادہ کارگر حربہ تکرار ہے"، تکرار کی قوت اس قدر زبردست ہے کہ کوئی شے تنہا اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی، لیکن تکرار کیلئے صرف یہی بات کافی نہیں ہوتی، کہ مختلف الفاظ اور مختلف اسالیب سے متکلم ایک ہی دعوی کی باربار تکرار کرتا ہی، بلکہ تکرار معنوی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جہانتک ممکن ہو ایک مفہوم کو ایک ہی عبارت سے باربار دہراتے رہنا چاہیئے، تجربہ بتاتا ہے کہ معمولی سے معمولی بیانات جو اپنے اندر ادعاو تحکم کی کوئی خاص قوت نہیں رکھتے، اگر ایک ہی عبارت سے ان کی باربار تکرار کی جاتی ہے، تو بالآخر دل میں وہ گھر پیدا ہی کرلیتے ہیں،

تکرار کا جماعتوں پر جس قدر گہرا اثر ہوتا ہے، اس کا اندازہ صرف اسی ایک بات سے ہوسکتا ہی، کہ بڑے بڑے ذی عقل و فہم افراد بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں، پھر یہ ظاہر ہے کہ جماعت جو عقلی اور ذہنی خصوصیات میں افراد سے گری ہوئی ہوتی ہی، اس تک کہاں تک تکرار کا اثر نہ ہوگا، تکرار کی اس عظیم الشان طاقت کا راز یہ ہے کہ مکرر بیانات رفتہ رفتہ ہمارے نفوس کے اُن غیر شعوری حصوں کے اندر پیوست ہوجاتے ہیں، جو ہمارے محرکاتِ افعال کا اصل منبع ہوتے ہیں، پھر کچھ عرصہ کے بعد ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ ان بیانات اور اطلاعات کا اول ماخذ کیا تھا، لیکن ان سے ہمارے نفس میں یقین کی کیفیت جو

پیدا ہو گئی ہے، وہ قائم رہ جاتی ہے، اشتہارات کی زبردست تاثیر کا باعث بھی یہی ہے
فرض کرو کہ ہماری نظر سے سینکڑوں ہزاروں مرتبہ یہ اشتہار گذرا کہ زید کی دوکان
کی مٹھائیاں نہایت خوش ذائقہ ہوتی ہیں، یہ اشتہار دیکھ کر ہمارے ذہن کو رفتہ رفتہ اس
دعویٰ کا یقین تو ہو جائے گا، مگر ہم یہ بھول جائیں گے کہ یہ یقین پیدا کس ذریعہ سے ہوا؟
یا فرض کرو کہ ہم نے صدہا مرتبہ یہ اعلان پڑھا ہے، کہ عمرو کی دوائیں تیر بہدف اور
نہایت مجرب اور زود اثر ہوتی ہیں، تو اب جب ہم خود کسی مرض میں مبتلا ہوں گے تو
ہم کو طبعاً یہ خواہش پیدا ہو گی کہ کم از کم ان کی آزمائش ہی کریں، یا اگر ہم کسی اخبار میں
ہر روز پڑھتے رہیں کہ الف ایک دیانت دار اور پڑھا لکھا شخص ہے، اور ب ایک بدمعاش
اور جاہل ہے۔ تو ہمیں اس بیان پر پورا اعتماد و وثوق ہو جاتا ہے، اور یہ خیال اس وقت
تک ہمارے دل سے نہیں نکلتا، تاوقتیکہ ہماری نظر سے اس بیان کی تردید کہیں نہیں
گذرتی، غرض مختصر یہ کہ ادعا و تکرار ایسی زبردست طاقتیں ہیں، جو خود ہی اپنا جواب
ہو سکتی ہیں،

پھر جب تحکمانہ انداز بیان کے ساتھ کسی مفہوم کی لفظی و معنوی تکرار کرنے سے کوئی
خیال نفوس جماعت میں پیوست ہو جاتا ہے، تو یہاں سے اب ایک دوسرے موثر معنی
سریان تاثیر کا عمل شروع ہوتا ہے، سریانِ تاثیر کے اثرات اس قدر واضح ہیں کہ کسی
تصریح کی حاجت نہیں، اصل میں سریانِ تاثیر دوسرے لفظوں میں نام ہے محاکات
و اثر پذیری کا، اور محاکات و اثر پذیری کی قابلیت حیوانات کی ہر صنف کے خمیر میں داخل
ہے، اور انسان سے اتر کر حیوانات میں بھی یہ قابلیت و استعداد موجود ہے، دیکھو اگر
گلہ کی ایک بکری گلہ سے نکلنے کی کوشش کرتی ہے تو پورے گلہ کی بکریاں اسکی تقلید کرتی

ہیں، اسی طرح انسان کی زندگی کا بھی ایک ایک لمحہ اثر پذیری و محاکات کے نذر ہوتا ہے
اور حیوانات کی طرح انسان کی زندگی کا بھی دار و مدار محاکات و تقلید ہی پر ہے، ہم اگر
کسی وقت انگڑائی لیتے ہیں، تو ہمیں دیکھکر ہمارے سامنے بیٹھا ہوا شخص بھی انگڑائی لینے
لگتا ہے، ہم اگر روتے ہیں تو ہمیں دیکھ کر ہمارے ہم نشین احباب کی آنکھوں سے بھی
آنسو نکل پڑتے ہیں، پھر جس طرح ہماری زندگی کے جسمانی شعبوں پر محاکات و تقلید کا اثر
غالب ہے، اسی طرح ہماری حیاتِ نفسی کی بھی تکوین محاکات و تقلید ہی کے مظاہر سے
ہوتی ہے، خصوصاً ہمارے نفسِ اجتماعی کی تو یہ ایک خصوصیت ہے کہ خیالات، جذبات،
اعتقادات اور احساسات و مشاعر میں سے ہر ایک اگر کسی جماعت کے بعض افراد کی تہییج
و تحریک کا باعث ہوتا ہے، تو اس اثر سے جماعت کے کل افراد ایک دم متاثر ہو جاتے
ہیں، اگر جماعت میں سے کسی ایک شخص کو کسی بات سے خوف پیدا ہوتا ہے، تو یہ خوف جماعت
کے تمام افراد کے دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ چند مجانین
جن اطبا کے زیرِ علاج تھے، وہ اطبا ان مریضوں کے اثر سے خود مرضِ جنون میں مبتلا ہو گئے
اسی طرح بعض اطبار نے ایک قسم کے جنون کی تحقیق کی ہے، جس کا اثر انسان سے حیوانات
کے جانب متعدی ہوتا ہے،

لیکن سریان کے لئے یہ کچھ ضروری نہیں ہے کہ بہت سے افراد ایک جگہ اکٹھا ہوں، بلکہ
اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک ایسا واقعہ جس کا تعلق مختلف ممالک کے باشندوں سے ہوتا ہے،
اس کے اثر سے ان مختلف ممالک کے باشندے ایک ہی وقت میں یکساں متاثر ہوتے
ہیں، اور خصوصاً یہ اثر اس وقت ان مختلف ممالک کے باشندوں پر زیادہ ہوتا ہے، جب
تمام باشندے اُن مختلف عواملِ بعیدہ کی تاثیرات کے تحت میں (جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے)

اس واقعہ سے اثر پذیر ہونے کے لئے پہلے سے مستعد ہوتے ہیں ۱۸۴۸ء میں جو شورش برپا ہوئی تھی اس کی ابتدا تو اگرچہ پیرس سے ہوئی لیکن تھوڑے عرصہ کے اندر تمام یورپ میں اس کے شعلے بھڑک اُٹھے،

سریانِ تاثیر، تقلید و محاکات کا ایک شعبہ ہے، اور تقلید و محاکات ہی کے مظاہر سے ہماری معاشرتی اور اجتماعی زندگی کی تکوین ہوتی ہے، بلکہ ہماری معاشرتی زندگی تمام تر موقوف ہوتی ہے محاکات و تقلید پر، اس لئے نفس اجتماعی کی یہ خصوصیت اس کے تمام خصوصیات پر حاوی رہتی ہے، اور نظامِ اجتماعی کی کوئی کل بغیر محاکات و تقلید کے کبھی درست نہیں رہ سکتی، میں نے انسان کی اس فطری خصوصیت پر تفصیل کے ساتھ اپنی دوسری کتاب میں بحث کی ہے، اس موقع پر اس کے چند اقتباسات امید ہے کہ ناظرین کے لئے مفید ہوں گے،

" حیوانات کی طرح انسان بھی بالطبع تقلید پسند واقع ہوا ہے، تقلید ضروریات انسانی میں داخل ہے، اور یہی ضرورت ہے جس کی بنا پر لوگ نہ صرف خیالات میں نہ صرف ادنیٰ قابلیتوں کی نمایش کے موقع پر، اور نہ صرف اپنی اپنی ذاتی رایوں میں بلکہ اپنے لباس، اپنے ضروریاتِ زندگی، اور اپنے طرز بود و باش میں بھی ایک دوسرے کی تقلید کرتے ہیں، کوئی مدلل دعویٰ، کوئی قیاسی یا استقرائی نتیجہ انسان کو کسی فعل کے کرنے یا نہ کرنے کی رغبت دلانے میں اتنا کامیاب نہیں ہو سکتا، جتنا ایک زندہ نمونہ کامیاب ہوتا ہے، اور اگرچہ ہر زمانہ میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو نئی نئی باتیں ایجاد کرتے ہیں، اور کسی کی تقلید نہیں کرتے، لیکن اگر اُن کی یہ ایجاد عام طبائع کے موافق نہیں ہوتی تو ان کی ایجاد کسی کو اپنی جانب مائل نہیں کر سکتی ہے، یہی سبب ہے

کہ جو لوگ اپنے ابنائے حصر سے عقلی اور ذہنی خصوصیتوں میں برتر اور فائق ہوتے ہیں، گو وہ کسی کی تقلید نہیں کرتے، لیکن ان کا اثر بھی کسی پر نہیں پڑتا، اور پھر یہی وجہ ہے کہ یورپ کے باشندے تہذیب و تمدن میں گو مشرقی باشندوں سے فائق ہوتے ہیں لیکن مشرقی باشندہ ایک مغربی باشندے سے بہت کم اثر پذیر ہوتا ہے،

غرض ماضی کی تاثیرات اور زمانۂ حال کی نقالی، ان دونوں کا دوہرا اثر ایک ملک بلکہ ایک زمانہ کے تمام آدمیوں پر اتنا گہرا ہوتا ہے، کہ گو دنیا کے فلسفی اور عقلمند لوگ ہمیشہ اس بلائے عام، محاکات و تقلید کے اثر سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن باوجود اس کے ان کے طرز انشا اور رفتار خیالات سے ان کی تصنیفات کے ہر دیکھنے والے کو اول نظر میں یہ پتہ چل جاتا ہے کہ یہ مصنف کس زمانہ کا ہے؟ اس کا پیشہ کیا تھا؟ اس کے کیا خیالات تھے؟ غرض یہ اثر اتنا قوی ہوتا ہے، کہ فلاسفہ کی تصنیفات میں بھی اس کا اثر بہت نمایاں اور کھلا ہوا ہوتا ہے[۱]"

پھر انسان کی اس جبلت محاکات اور تقلید کا اثر صرف اسی حد تک محدود نہیں ہوتا کہ لوگ محض خیالات و عقائد میں ایک دوسرے کی نقل کرتے اور ایک دوسرے سے اثر پذیر ہوتے ہوں، بلکہ خیالات اور عقائد کے حدود سے گذر کر اس کا اثر لوگوں کے جذبات پر بھی پڑتا ہے، لوگ اپنے جذبات میں بھی ایک دوسرے کی اسی قدر نقل اتارتے ہیں جتنی خیالات و عقائد میں، اور یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات اگر کسی شے سے کسی ایک فرد کو نفرت پیدا ہوتی ہے تو اس کے دیکھا دیکھی ایک زمانہ اس سے نفرت کا اظہار کرنے لگتا ہے، یا اسی طرح جب کسی شے کی جانب کسی ایک شخص کو رغبت پیدا ہوتی ہے، تو اس کے دیکھا دیکھی اور لوگ بھی اس کی تقلید میں اس شے کو عزیز رکھنے لگتے ہیں،

[۱] انسان اور حیوانات (ص ۱۱۱ جلد دوم) اجتماعی کان انصف ... [handwritten margin note, partly illegible]

سریانِ تاثیر محاکات و تقلید کے اثرات انسان کی معاشرتی حیات پر اس قدر حاوی ہیں کہ کسی خیال اور کسی راے کی اشاعت بجز اس کے کسی اور طرح ہو بھی نہیں سکتی، کہ اس خیال کی بار بار تکرار کر کے ہر ہر فرد جماعت کے ذہن میں اس کو خوب پیوست کر دیا جائے، ہر زمانہ میں جب کسی خیال کی اشاعت ہوئی ہے تو اسی طرح کہ قہوہ خانوں اور گپ خانوں میں جہاں ہر طبقہ کے لوگوں کا مجمع ہوتا ہے، وہ خیال پھیلنا شروع ہوا، اور اس کے بعد رفتہ رفتہ اس کا دائرۂ اشاعت وسیع ہوتا گیا، ریناں نے جو انیسویں صدی کا ایک مشہور فرنچ مصنف گذرا ہے، کیا خوب کہا ہے کہ" مذہبِ عیسائیت کی اشاعت کی ابتدا گنجانوں اور شراب خانوں سے ہوئی ہے" والٹر کہتا ہے کہ تقریبًا ایک صدی تک مسیحت کی اشاعت صرف طبقۂ ادنیٰ تک محدود تھی،

پس گذشتہ بیانات سے معلوم ہوا کہ سریانِ تاثیر اور محاکات و تقلید کا اثر سب سے پہلے قوموں کے طبقۂ ادنیٰ میں ظاہر ہوتا ہے، اور جب ان تاثیرات کی بدولت طبقۂ ادنیٰ کے ذہن میں اس خیال کی اچھی طرح اشاعت ہو جاتی ہے، تو اس وقت یہ اثر ترقی کر کے طبقۂ ادنیٰ سے قوم کے طبقۂ اعلیٰ تک جا پہنچتا ہے، زمانۂ حال میں مذہبِ اشتراکیت کی اشاعت بھی اسی طرح ہو رہی ہے، کہ سب سے پہلے ان خیالات نے ان لوگوں کو اپنے اثر سے متاثر کیا جو مزدوری پیشہ تھے، اور جن کا شمار قوموں کے ادنیٰ طبقہ میں ہوتا تھا، اس کے بعد پھر جب ان لوگوں میں اس مذہب کی اچھی طرح اشاعت ہو چکی، تو اس وقت اس کا اثر متعدی ہو کر قوموں کے دوسرے طبقوں تک بھی پہنچ گیا،

یہی بات ہے کہ جب کوئی خیال طبقۂ ادنیٰ میں اشاعت پذیر ہوتا ہے، تو اس کا اثر قوم کے اعلیٰ طبقہ تک بھی ضرور پہنچتا ہے، پس یہ ایک تعجب انگیز اور حیرتناک واقعہ ہے کہ عمومًا

جن خیالات کی قوموں میں اشاعت ہوتی ہے، ان کی تخم ریزی فلسفیانہ رنگ میں سب سے پہلے قوم کے اعلیٰ طبقہ کے دماغوں میں ہوتی ہے، اور ایک مدت تک یہ تخم ان دماغوں کے اندر پختگی اور قوت حاصل کرتا رہتا ہے، پھر ایک مدت کے بعد کوئی انقلاب انگیز دماغ والا شخص جس میں قیادت کی اہلیت پائی جاتی ہو، اس خیال کو منتخب کرتا ہے، اور اپنے دماغ میں اس کو خوب پکاتا ہے، اور جب یہ خیال اس کے دماغ میں پختگی حاصل کر لیتا ہے تو ایک دم کسی تحریک کی صورت میں اسکی شاخیں پھوٹ نکلتی ہیں، کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ابتدائی منازل میں اس تحریک کو تسلیم کر لیتے ہیں، یہاں تک کہ اب رفتہ رفتہ ترقی کرتے کرتے اس خیال کی اشاعت قوم کے اس اعلیٰ طبقہ تک بھی ہو جاتی ہے، جہاں پہلے پہ اس کی تخم ریزی کی گئی تھی، غرض دنیا پر گو ہمیشہ عقل اور فلاسفہ ہی کی حکومت رہی ہے لیکن کبھی فلاسفہ عملی رزمگاہ میں بے نقاب ہو کر سامنے نہیں آئے ہیں، علماء اور فلاسفہ خیالات کی تخم ریزی کر کے پیوند زمین ہو جاتے ہیں، لیکن ایک مدت کے بعد یہ فنا شدہ آوازیں ان مردوں کی قبروں سے نکل نکل کر عملی رنگ میں حیاتِ جاودانی حاصل کرتی ہیں،

(۳)

نفوذ

لیکن جس خیال کو ادعا و تحکم اور تکرار لفظی و معنوی کے ساتھ جماعت کے سامنے ظاہر کیا جاتا ہے، اس کا اثر جماعت پر اس وقت اور زیادہ بڑھ جاتا ہے، جب اس طرز بیان کو متکلم کی ذاتی سطوت و نفوذ سے تقویت پہنچ جاتی ہے،

دنیا میں جب کبھی کسی شخص یا کسی عقیدہ کے اثر کو غلبہ ہوا ہے، تو عموماً قوتِ نفوذ ہی

کی بدولت یہ غلبہ ظہور میں آیا ہے، سطوت و نفوذ کے لفظی معنی گو عام طور پر معروف ہیں لیکن جن صورتوں میں نفوذ کا ظہور ہوتا ہے، وہ باہم اس قدر مختلف ہیں کہ ان سب کی کوئی منطقی تحدید نہیں کی جا سکتی، قلوبِ انسانی پر جو نفوذ کسی ذات کا مستولی ہوتا ہے، اسکی بنا، عام طور پر حیرت و استعجاب اور خوف کے جذبات ہوا کرتے ہیں، یعنی یہ کہ اُس ذات میں کوئی قوتِ تسخیر ایسی پائی جاتی ہے، جس سے لوگوں کے دلوں پر دہشت طاری ہوتی ہے، یا جس کے سبب سے لوگ اُس ذات کو اپنے سے مافوق تصور کرنے لگتے ہیں، اور اسی دہشت و استعجاب کی بنا، پر اس کا نفوذ قائم ہو جاتا ہے، لیکن سب میں کامل اور دیرپا وہ نفوذ ہوتا ہے، جو بلا ان جذبات کے پیدا ہوتا ہے، جو لوگ فنا ہو گئے ہیں اب مرنے کے بعد اُن سے خوف و دہشت کرنے کی کیا بات ہے، لیکن باوجود اس کے جن لوگوں کا نفوذ اب تک ہم پر مسلط ہے، وہ یہی لوگ ہیں، جو پیوندِ زمین ہو گئے ہیں، اور اپنی قبروں کے اندر سے ہمارے اوپر حکومت کر رہے ہیں، سکندر، قیصر، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور بدھ وغیرہ ایسے عظمائے رجال ہیں جن کی دیرپا سطوت کی شہادت ان کے پیرووں کی کثرت دے رہی ہے، اسی طرح بعض اوقات بعض اُن ہستیوں کا بھی نفوذ قائم ہو جاتا ہے، جو گو اپنے اندر کوئی حیرت انگیز بات نہیں رکھتیں، لیکن قوموں پر اُن کا گہرا اثر مدتوں قائم رہتا ہے، مثلاً مختلف بت پرست اقوام کے دیوتا وغیرہ،

البتہ سطوت و نفوذ کی اگر کوئی تعریف کی جا سکتی ہے، تو وہ یہ ہے کہ سطوت و نفوذ کسی خیال یا کسی انسان کے اُس غلبہ اور اثر سے عبارت ہے، جو کبھی قلوبِ انسانی پر مستولی ہو جاتا ہے، اور جس کے استیلا کے باعث نفس میں ایک دہشت و مرعوبیت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اور جو ہماری ناقدانہ قوت کے استیصال کا باعث ہوتا ہے

سطوت و نفوذ کے باعث یہ کیفیت قلوبِ انسانی میں جو پیدا ہوتی ہے، اس کی تعریف بھی گو ناممکن ہے، لیکن اتنا ضرور ہے کہ یہ کیفیت بھی اسی قسم کی کیفیت ہوتی ہے، جو مسمریزم کے معمول پر طاری ہوتی ہے،

سطوت و نفوذ کی دو قسمیں ہیں :-

۱۔ "نفوذ مکتسب" وہ نفوذ ہے جو کسی شخص کی ثروت یا شہرت کے باعث پیدا ہوتا ہے،

۲۔ "نفوذ شخصی" وہ نفوذ ہے جو خود اس شخص کی ذات کے ساتھ قائم ہوتا ہے اس کے لئے شہرت و ثروت وغیرہ کی حاجت نہیں ہوتی، پہلی قسم کا نفوذ اکتسابی ہوتا ہے جو سعی و جد و جہد کے ذریعہ سے اکثر لوگوں کو حاصل ہو جاتا ہے، لیکن دوسری قسم کا نفوذ وہبی اور فطری ہوتا ہے جس میں اکتساب و سعی کو دخل نہیں ہوتا،

لیکن ان دونوں میں جو نفوذ سب سے زیادہ شائع ہے، وہ پہلی قسم کا نفوذ مکتسب ہے، یہ نفوذ اکثر اُن لوگوں کو حاصل ہوتا ہے، جو کسی خاص عہدہ پر متمکن ہوتے ہیں، یا جو صاحب ثروت یا خطاب یافتہ ہوتے ہیں، علماے شریعت عبا و عمامہ کیساتھ وکلا و حکام اپنے گون (جبہ) کے ساتھ، پولیس کے سپاہی اپنی وردیوں کے ساتھ، یونیورسٹی کے سند یافتہ اپنی مخصوص پوشاکوں کے ساتھ، بہ نسبت اپنے معمولی و سادہ لباس کے زیادہ رعب و سطوت رکھتے ہیں، تاج و کلغی، تمغہ و نشان، یونیورسٹی کی ڈگریاں، خطابات و اعزازات، دولت و حکومت، شہرت، علم و فضل، غرض ہر ایسی شے جو عام شاہراہ سے ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہو، کم و بیش افزایش نفوذ کا آلہ بن سکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ زمانۂ حال میں قاضیوں اور وکیلوں کے لئے جبّوں کی

اہمیت پر زیادہ زور دیا گیا ہے، کیونکہ بغیر جتبوں کے ان کا نفوذ آدھا رہ جاتا ہے[۵]،
اس قسم کا نفوذ کو صرف انسان کے ساتھ خاص ہوتا ہے، لیکن انسان کے علاوہ افکار
و خیالات اور آراء و نظریات کا بھی ایک نفوذ ہوتا ہے، جو اکثر حالتوں میں تکرار سے پیدا ہوتا ہے
تاریخی کتابوں بالخصوص علوم و فنون کی تاریخوں کی قدر و قیمت بجز اس کے اور کیا ہے کہ وہ چند
آراء و خیالات کا مجموعہ ہیں، جن کو مکرر سہ کرر مختلف مصنفین بلا حذف و تغیر مختلف اوقات میں
دہراتے رہے ہیں، اور اب تکرار کرتے کرتے حالت یہ ہو گئی ہے کہ ہر شخص وہی کہنے لگا جس کی
تعلیم اس نے اسکول یا مدرسہ میں پائی ہے، ہومر کے مطالعہ سے گو رنج و غم کے جذبات پیدا

---

[۱] خطابات اور تمغوں کی جو تاثیر نفوسِ جماعت میں ہوتی ہے، وہ ہر ملک میں مسلّم ہے، حتیٰ کہ ان ممالک میں
بھی جہاں افراد کو حریت و استقلال حاصل ہے، ایک سیاح نے انگلینڈ کے بعض مقتدر اصحاب کی چشم دید
حالت اپنے سفرنامہ میں تحریر کی ہے، میں یہاں اس کے چند اقتباسات درج کرتا ہوں، وہ لکھتا ہے:۔

"میں نے اکثر انگلستان میں دیکھا ہے، کہ جو لوگ بیرونٹ یا سر کے خطابوں سے
اعزاز یافتہ ہوتے ہیں، وہ اگر کسی کے پاس بیٹھ جاتے ہیں، تو یہ اس شخص کیلئے فخر
کی بات سمجھی جاتی ہے، اور اگر یہ خطاب یافتہ لوگ خطاب کے ساتھ دولتمند بھی
بھی ہوتے ہیں، تو لوگ ان سے ملاقات کرنے کے قبل ہی سے انکی عزت کرنے لگتے
ہیں اور جب اُن سے ملاقات ہوتی ہے، تو لوگ ان سے بہت خوشی خوشی ملتے ہیں
اور اگر کہیں انھوں نے کسی سے بات چیت کر لی، تب تو وہ شخص پھولا نہیں سماتا
جس طرح اسپین کے باشندے رقص و سرود کے اور جرمنی کے باشندے موسیقی کے
اور فرانس کے لوگ انقلاب و شورش کے شوقین ہوتے ہیں، اسی طرح انگریز بڑے
بڑے خطاب یافتہ امراء کے شیدائی ہوتے ہیں"۔

ہوتے ہیں، اگر کوئی شخص ان واقعات کی تکذیب نہیں کرتا، بات یہ ہے کہ سطوت و نفوذ کی ممتاز خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ انسان کی قوتِ فیصلہ و قوتِ تنقید کو فنا کر دے، اور چونکہ جماعت اور افراد دونوں کو تمام مباحث میں مختتم اور فیصلہ کن رایوں کی ہمیشہ حاجت رہتی ہے، اس لئے جب کسی رائے یا کسی خیال کی اشاعت ہوتی ہے، تو اس وقت کسی شخص کے ذہن میں یہ شبہہ نہیں گذرتا، کہ یہ رائے اور خیال واقع میں صحیح ہے یا غلط، بلکہ لوگ ہمیشہ اسی رائے اور خیال کو تسلیم کر لیتے ہیں، جس کا سب سے زیادہ نفوذ ہوتا ہے،

اب ہم نفوذِ مکتسب سے بحث کرنے کے بعد نفوذ کی دوسری قسم نفوذ شخصی یا نفوذ وہبی سے بحث شروع کرتے ہیں، نفوذ شخصی یا نفوذ وہبی کو نہ عہدوں کی حاجت ہوتی ہے نہ خطابات کی، اور نہ دولت و ثروت کی، بلکہ یہ نفوذ جن لوگوں کو حاصل ہوتا ہے، اُن کی قدر و منزلت بھی ان کے ہمچشموں سے کچھ ایسی زیادہ نہیں ہوتی، لیکن باوجود اس کے ان کے پاس کچھ ایسے وسائل ہوتے ہیں، اور کچھ ایسی قوتِ مقناطیسی ان میں پائی جاتی ہے کہ یہ لوگ اپنے ذاتی غلبہ کے بل پر اپنے خیالات کو ذہنوں میں راسخ کر دیتے ہیں، اور لوگ ان کی اسی طرح اطاعت و فرماں برداری کرتے ہیں، جس طرح حیوانات اپنے مالک کے مطیع ہوتے ہیں، اس قسم کا فطری اور وہبی نفوذ قوموں کے اُن تمام اعاظم رجال کو حاصل ہوتا ہے، جنھوں نے اپنے کارناموں سے دنیا پر اپنی دھاک بٹھا دی ہے، اور ہمیشہ اسی قسم کے نفوذ کی بدولت دنیا پر یہ لوگ قہر و غلبہ حاصل کرتے ہیں، بدھ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، جان آف آرک اور نپولین دنیا میں اسی قسم کے لوگ ہوئے ہیں،

دنیا میں جو صاحبِ نفوذ ہستیاں گذری ہیں، ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ گو ان کے کارناموں سے ان کا نفوذ بڑھ جایا کرتا ہے لیکن ان کی ذاتی سطوت اور ان کا شخصی نفوذ

کبھی ان خارجی مؤیدات کا زیر بارِ احسان نہیں ہوتا، بلکہ ان کی شہرت کے پیشتر ہی سے ان میں ایک ایسی طاقت پائی جاتی ہے، جو لوگوں کو اپنی جانب کھینچ لیا کرتی ہے، نپولین کو دیکھو کہ جب اس نے فوجی ترقیاں حاصل کی ہیں تو اس کے پیشتر ہی سے اسکا نفوذ لوگوں پر قائم ہو چکا تھا، جس وقت وہ نہ شہنشاہ نپولین تھا، اور نہ کوئی فاتح اعظم، بلکہ محض ایک معمولی رتبہ کا فوجی افسر تھا، اسی وقت سے اس کی دھاک ایسی بیٹھی ہوئی تھی کہ بڑے بڑے شوریدہ پشت افسر ایک لمحہ میں اس کے حلقہ بگوش بن جاتے تھے، بطور نمونہ کے ہم یہاں پر ایک خاص موقع کا ایک واقعہ درج کرتے ہیں، جس سے نپولین کے نفوذ کا حال معلوم ہوگا، یہ واقعہ موسیو ٹائن نے اپنی کتاب "تاریخِ انقلابِ فرانس" میں درج کیا ہے، موسیو ٹائن لکھتا ہے:

"جب پیرس سے اس نوخیز افسر کا فوج کی کمان کے لئے تقرر ہوا، تو دیگر افسران فوج کو یہ تقرر سخت شاق گذرا، خصوصاً او جیرو کو نہایت ہی ناگوار ہوا، جو سخت درشت مزاج تھا، اور اپنی شجاعت و بسالت پر ناز کیا کرتا تھا، اس نے لوگوں سے اس نئے افسر کے سن و سال اور قد و قامت کا حال سن کر تہیہ کر لیا تھا، کہ جب وہ اسکی ملاقات کرنے جائیگا، تو اس سے سخت تمرد سے پیش آئیگا، جنرل او جیرو بارا س کا خاص شاگرد تھا، اور اس رتبہ پر محض اپنی شجاعت اور جنگ آزمائیوں ہی کی بدولت پہنچا تھا، اور اسی لئے اس کو اس نوجوان کمانڈر سے ایک طرح کی کد پیدا ہو گئی تھی، بہر حال نپولین سے ملاقات کرنے کے لئے جب سب افسر گئے تو نپولین نے پہلے تو ان سے بہت طویل انتظار کرایا، اس کے بعد کمرہ سے اس قطع سے باہر نکلا کہ کمر سے تلوار لٹک رہی تھی، اور سر برہنہ تھا، کمرے سے باہر آکر اس نے سر پر ٹوپی رکھی، اس کے بعد مختلف احکام صادر کئے، تجاویزِ جنگ کے متعلق افسروں سے

باتیں کرتا رہا، اور پھر ان کو رخصت کر دیا، اس تمام عرصہ میں اوجیرو کی حالت یہ تھی کہ جب تک نپولین سامنے رہا، وہ بت بنا ہوا دم بخود کھڑا رہا، اور وہاں سے نکل کر جب اس کے ہوش بجا ہوئے، تو اس نے اپنے دوست مینا سے بیان کیا، کہ مجھ کو تو نپولین کے دیکھتے ہی رعب طاری ہو گیا، میری سمجھ میں نہیں آتا، کہ اس میں کون سی طاقت ہے جس سے میں ایسا مرعوب ہو گیا۔"

نپولین عظمت و رتبہ میں اپنے کارناموں کی بدولت جتنا جتنا ترقی کرتا جاتا تھا، اسی نسبت سے اس کے نفوذ اور سطوت میں بھی ترقی ہوتی جاتی تھی، یہاں تک کہ آخر میں اس کا نفوذ اتنا بڑھ گیا کہ وہ اُن لوگوں کی نگاہوں میں جو اس کی عزت کرتے تھے ایک معبود کے درجہ پر پہنچ گیا، ایک بار کا واقعہ ہے، کہ کمانڈر وانڈم جو انتہا سے زیادہ شورہ پشت فوجی افسر تھا، ۱۸۱۵ء میں قصر ٹویلری میں نپولین کے پاس ملاقات کی غرض سے گیا، اس کے ساتھ اس وقت جنرل ارنانو بھی تھا، وانڈم نے ارنانو سے سلسلۂ سخن میں پوچھا، کہ یہ کیا بات ہے کہ میں باوجودیکہ کسی چیز سے خوف نہیں کرتا، نپولین کے پاس جا کر کیوں اس قدر خائف ہو جاتا ہوں اور اسکی صورت دیکھتے ہی میرے بدن میں تھرتھری پیدا ہو جاتی ہے،

نپولین کے نفوذ کی حالت یہ تھی، کہ جب وہ جزیرۂ ایلبا سے بھاگ کر آیا ہے، تو باوجودیکہ اس کے مددگار لوگ کم تھے، اور اس کے مقابلہ کے لئے پورا فرانسیسی لشکر تیار تھا، لیکن نہایت تپاک سے اس کا خیر مقدم اور استقبال کیا گیا، اور فرانسیسی قوم کے قلوب کو دوبارہ اُس نے فتح کر لیا، فوج کے جو افسر اس کو قید کرنے کے لئے بھیجے گئے تھے اُنھوں نے اس کے قید کر لانے کا حلف اٹھایا تھا، لیکن نپولین کی صورت دیکھتے ہی

وہ سب خاموش ہوکر اس کے حلقہ بگوش بن گئے، اور ان پر اس کا رعب چھا گیا، اس واقعہ کی کیفیت جنرل ولسلی حسب ذیل لکھتا ہے:۔

"نپولین جزیرۂ البا سے بھاگ کر جب فرانس کی سرزمین پر اترا ہے، تو اس وقت اس کی حالت یہ تھی کہ اس کے ساتھ بجز اس کے چند مخلص دوستوں کے اور کوئی نہ تھا، لیکن باوجود اس کے نپولین نے سرزمین فرانس پر قدم رکھتے ہی ایک ہفتہ کے اندر ہی اندر نہایت آسانی کے ساتھ محض اپنے نفوذ کے بل پر فرانسیسی طرز حکومت میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا، اس کے علاوہ اس سلسلہ میں جو حیرت انگیز واقعہ ہے، وہ یہ ہے کہ اس نے اپنے آخری حملوں میں اپنے حلیفوں پر ایسا دباؤ ڈالا کہ وہ اس کا ساتھ دینے پر مجبور ہو گئے"

نپولین کا یہ نفوذ اس قدر قوی تھا کہ اس کے مرنے کے بعد بھی اس کا نفوذ اور غلبہ اپنی حالت پر برقرار رہا، اور اسی نفوذ کے اثر سے متاثر ہو کر اس کے مرنے کے بعد لوگوں نے اس کے بھانجے کو فرانس کے تخت شاہی پر بٹھایا، صرف یہی نہیں، بلکہ آج بھی جب کہ نپولین کو مرے ہوئے ایک مدت گذر گئی ہے اس کے قصوں اور افسانوں کو لوگوں کی زبانوں پر جو ہم چڑھا ہوا پاتے ہیں تو ہمکو خیال ہوتا ہے، کہ نپولین کا اثر و نفوذ ابتک برابر ترقی کر رہا ہے، مختصر یہ کہ وہبی نفوذ واثر کی حالت یہ ہوتی ہے، کہ اگر تم کو نفوذ حاصل ہو گیا ہو تو تم جتنا چاہو لوگوں کو قتل کرو جتنی شورشیں چاہو برپا کرو، سب تمھارے لئے جائز ہے، تمھارے افعال کی کوئی پرسش نہ کریگا بشرطیکہ تم اپنے نفوذ کو برابر ترقی دیتے رہو،

لیکن نفوذ کے پیدا ہونے کی صرف یہی چند صورتیں نہیں ہوتیں، کہ محض فوجی دبدبہ یا شخصی قابلیت یا مذہبی خوف و رعب کی بنا پر کسی شخص کا نفوذ قائم ہو جاتا ہو، بلکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے، کہ چند معمولی امتیازی حیثیتیں کسی شخص کا ایک پائدار نفوذ قائم کر دیا کرتی ہیں،

ان صورتوں سے جو نفوذ پیدا ہوتا ہے، اُس کی سب سے بڑی مثال فرانسیسی انجینیر ڈیلیسپس کی ہے، جس نے بین الاقوامی تجارت کا راستہ کھول کر روئے زمین پر عظیم الشان تغیر پیدا کر دیا، اور محض اپنے اسی کارنامہ کی بنا پر عظمائے رجال کی صفِ اول میں جگہ حاصل کی، باوجودیکہ اس کا ارادہ مستقل اور اس کا نفوذ قوی تھا، مگر اسکی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ تھا کہ جو لوگ اس کے مخالف تھے، ان کو وہ رام بنا لیا کرتا تھا، وہ جب ان سے بات چیت کرتا تھا اپنی شیریں کلامی سے اُن کو مسحور کر لیتا تھا، یہانتک کہ وہ اُس کے دوست بن جاتے، انگریزوں نے اسکی تجویز کا کتنا مضحکہ اُڑایا تھا، لیکن اس کا جواب اُس نے اس طرح دیا کہ انکے ملک میں خود سیر و سیاحت کرنے گیا، لوگوں سے مل جل کر اپنی تجویز پر مباحثہ کیا، اس واقعہ کا انگریزوں پر بہت اثر پڑا، اور وہ اس کے معین و مددگار بن گئے، یہاں تک کہ جب وہ شہر سوتھمپٹن سے ہو کر گذر رہا تھا تو اس کے استقبال میں گھنٹے بجائے گئے، اور نہایت جوش و خروش کا اظہار کیا گیا،

ڈلیسپس کے راستہ میں گو بہت سی مشکلات حائل تھیں، لیکن اس نے لوگوں کے مخالفانہ مجمعوں کو چیر کر، پہاڑوں کو کاٹ کر اور ریگستان کی ریتیلی زمین کو سبزہ زار بنا کر آخر کار اپنی تجویز کو پورا کر ہی دکھایا، اور اس کے بعد نہر سویز سے اس کو فرصت ملی تو اس نے یہ ایک نئی تجویز اور سوچ کر نکالی، کہ اسی طرح سے نہر پناما کا راستہ بھی کھولنا چاہیئے، لیکن اب چونکہ بڈھا ہو گیا تھا، اس لئے مجبوراً اسے اپنی اس آخری تجویز کو چھوڑ دینا پڑا، مگر اس عرصہ میں قضاء قدر کے کارخانے کچھ ایسے تھے، کہ اسکو چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا، اور کچھ ایسے اتفاقات پیش آئے، کہ اسکی ساری زندگی کی محنت اکارت گئی، اور اس کے تمام کارناموں پر پانی پھر گیا، اسکی زندگی اہلِ بصیرت کے لئے گویا مرقعِ عبرت تھی، اپنی زندگی کے بعض ادوار میں اُس نے اس قدر ترقی حاصل کر لی، کہ لوگ اس کی پرستش کرنے لگے، لیکن ایک معمولی بات

کے پیش آجانے پر اسی کے ہم قوم مجسٹریٹوں نے اس کو مجرموں کی صف میں شامل کرکے اس کے اثر ونفوذ کو ایسا دھچکا لگایا کہ اس کے صدمہ سے وہ جانبر نہ ہوسکا[1]

غرض یہ مثالیں جو ہم نے اوپر ذکر کی ہیں، ان سے نفوذ کے ان تمام حدود کا کہ کس طرح وہ پیدا ہوتا ہے، پھر کس طرح ترقی کرتا ہے اور اس کے بعد کس طرح اس کا خاتمہ ہوجاتا ہے

[1] ڈی لیسیپس کے انتقال کے بعد دائنا کے اخبار نوی فرائی پریس میں ایک دلچسپ مضمون شائع ہوا تھا جس میں بعض قابلِ غور باتیں بھی درج تھیں، اس بنا پر یہاں اس کے ایک دلچسپ حصہ کو ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لئے پیش کرتا ہوں مضمون نگار لکھتا ہے:-

"فرڈنینڈ ڈی لیسیپس کے ساتھ جو کچھ برتاؤ کیا گیا، اس کے دیکھنے کے بعد کولمبس کے انجام پر بھی ہمیں کچھ تعجب نہیں ہوتا، ڈی لیسپس اگر قدیم زمانہ میں ہوتا تو لوگ اسکی بے انتہا قدر کرتے اور مرنے کے بعد وہ یقیناً معبودوں کی صف میں جگہ پاتا، ڈی لیسپس کے ساتھ جو برتاؤ کیا گیا ہے اسکی بنا پر عدالتِ استیناف (ہائی کورٹ) کے ججوں کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا، کیونکہ لوگ آپس میں سوال کریں گے، کہ اتنی بڑی حرکتِ ناشایستہ کا ارتکاب کس شخص نے کیا تھا اور ڈی لیسپس پر فرد قرار دادِ جرم کس نے لگائی؟ ہاں بس آج سے معلوم ہوگیا کہ جس ملک میں یہ حالت ہو کہ چھوٹے چھوٹے سرکاری ملازم قوم کے فدائیوں اور اعاظمِ رجال سے انکے کارناموں کی بنا پر بغض وحسد رکھتے ہوں، اس ملک میں ہمیشہ انصاف کا خون ہوگا، اور اس ملک کے لوگوں سے انصاف کی توقع رکھنا حماقت ونادانی ہے،

ہاں لیکن قوموں کو ہمیشہ ان لوگوں کی احتیاج رہے گی، جو اپنے غیر متزلزل عزم و ارادہ کے بل پر مشکلات کو اپنے اوپر برداشت کرتے ہیں، ان لوگوں کو ڈرنے اور خوف کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، فرڈینینڈ ڈی لیسپس اپنے کارناموں کی بدولت اوجِ رفعت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۰ پر)

ناظرین کو پورا اندازہ ہو گیا ہو گا، لیکن اگر نفوذ کی نفسانی کیفیات کا مفصل اندازہ کرنا چاہو تو
بتدریج بانیانِ مذاہب دول سے لیکر اس عامی تک کے حالات کو خوب غور سے دیکھ جاؤ، جو
کبھی نیا لباس پہن کر یا اپنے سینہ کو تمغوں سے آراستہ کر کے لوگوں میں اپنی نمود و نمائش کرتا ہے۔

پس اگر نفوذ کے تمام مدارج کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ تمدن کے
تمام عناصر کی بنا ر اسی نفوذ پر ہوتی ہے، بانیانِ مذاہب و دول سے لے کر افکار و خیالات
علوم و فنون سب نفوذ ہی کے مظاہر ہوتے ہیں، اور کوئی خیال اور کوئی فن اور کوئی رائے
لوگوں میں اُس وقت تک اشاعت پذیر نہیں ہوتی تا وقتیکہ اس رائے یا اس خیال
یا اس فن کے نفوذ کا سکہ لوگوں کے دلوں پر نہیں بیٹھ جاتا ہے، اور پھر نفوذ حاصل
ہونے کے بعد چونکہ اس کی اشاعت محض سریانِ تاثیر کی بدولت ہوتی ہے، اور سریانِ تاثیر بھی
اپنا عمل لوگوں میں غیر شعوری کے ساتھ کرتا ہے، اس لئے لوگوں میں جس
خیال کی اشاعت ہو جاتی ہے، اس کی صحت و عدمِ صحت کا سوال پھر کسی وقت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۹) پر پہنچا، اور اُس نے دینا کے لئے تجارت کی ایک راہ کھول دی اور جب وہ کامیاب ہو گیا تو
امرا اور بادشاہ اس کے پاس ہدایا اور تحائف لے کر آئے، اور آج جب اسکو کورڈیلیس کی مہاڑی
پر ناکامی ہوئی، تو وہ نظروں سے گر گیا، یہ کچھ نہیں، یہ سب سرکاری ملازموں کی کارستانیاں
ہیں، جو بغض و حسد کی وجہ سے قوم کو ہر اُس شخص کے خلاف برانگیختہ کر دیتے ہیں، جو اوج
رفعت پر پہنچ جاتا ہے، بات یہ ہے کہ اعاظم رجال جو نئی نئی باتیں ایجاد کرتے ہیں، ان کے
سامنے اُن کے زمانہ کے بڑے بڑے مقننین حیران رہ جاتے ہیں، کیا کوئی ایڈووکیٹ
یہ ثابت کر سکتا ہے کہ اسٹانلی قاتل اور ڈی لیسپس خائن اور دغا باز تھا؟"

(مؤلف)

نہیں پیدا ہوتا، یہی بات ہے کہ اس زمانہ کے مصورین جو مختلف بد نما تصویریں قدیم زمانہ کے انسانوں کی بناتے ہیں، ان کے متعلق انکو خود علم نہیں ہوتا، کہ یہ خاکہ ان کے ذہن میں کہاں سے آیا، بلکہ وہ بجاے اس کے خود اپنے ہی کو ان کا موجد سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ اصل میں ہوتا یہ ہے کہ پہلے کوئی بڑا مصوّر اس خاکہ کو تیار کرتا ہے اور اس کے بعد جب وہ تصویر رائج ہو جاتی ہے، تو ہر شخص اس کی نقل اُتارنے لگتا ہے لیکن یہ کسی کو خیال نہیں رہتا، کہ اس کا ماخذ اصلی کون تھا، اسی طرح بعض مصوّرین یہ کرتے ہیں، کہ اپنی تصویروں میں بنفشئی رنگ کا سایہ دکھلاتے ہیں، حالانکہ اُنھوں نے بنفشئی رنگ کا سایہ کبھی دیکھا بھی نہ ہوگا لیکن ہوتا یہی ہے کہ کوئی بڑا مصور جو اپنے زمانہ میں بے مثل مصوّر ہوتا ہے، اپنے فن میں یہ نئی نئی باتیں ایجاد کرتا ہے، اور پھر اس کے بعد دوسرے مصوّر بھی اس کی نقلیں اُتارنے لگتے ہیں،

پس بیاناتِ گذشتہ سے معلوم ہوا کہ نفوذ کی پیدایش کے باعث گو مختلف اسباب ہوتے ہیں، لیکن ان تمام ذرائع میں سب سے بڑا درجہ کامیابی کا ہے، جب کوئی حاکم اپنے احکام میں کامیاب ہو جاتا ہے، تو لوگ خواہ مخواہ اس کی اطاعت کرنے لگتے ہیں اسی طرح جب کوئی خیال عقلوں پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے، تو لوگ اس کی تصدیق کرنے لگتے ہیں، کامیابی کی بنا پر نفوذ کے قائم ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ جب کسی ایسے شخص کو جس کا نفوذ پہلے قائم تھا، ناکامی کا سامنا ہوتا ہے، تو اسی وقت اس کا نفوذ بھی تشریف لے جاتا ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات حالت یہ ہوتی ہی کہ کل جس شخص کے سامنے جماعت سرنگوں تھی، اگر زمانہ اس سے پھر گیا، تو آج اسی کو جماعت گالیاں دینے لگتی ہے، روبسپیر کو دیکھو کہ ایک وقت میں لوگوں پر اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، کہ اس نے

اپنے بہت سے مخلص دوستوں کو بلا وجہ قتل کر ڈالا، لیکن جب انتخاب کے وقت اس کو چند ووٹوں کی کمی کی بدولت اپنے عہدے کو چھوڑنا پڑا، تو اسی وقت اس کا نفوذ بھی زائل ہو گیا اور جماعت کو اس پر اس قدر غصہ آیا، کہ آخر کار وہ پھانسی پر لٹکا دیا گیا،

لیکن اگر کسی انسان کے بجائے کسی خیال کا نفوذ جماعت پر قائم ہو گیا ہو تو اس نفوذ کا ازالہ اکثر اس وقت ہوتا ہے، جب اس خیال اور اس عقیدہ میں تشکوک وشبہات پیدا کئے جاتے ہیں، خیال جب تک شک وشبہہ سے پاک رہتا ہے، اسی وقت تک اس کا نفوذ بھی قائم رہتا ہے، اور جہاں اس میں شک پیدا کیا گیا، بس اس کے نفوذ کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے،

فصل چہارم

نفس اجتماعی کے معتقداتِ اساسی کے حدود

۱۔ جماعت کے معتقداتِ اساسی، جماعت کے بعض معتقدات غیر تغیر پذیر ہوتے ہیں، اسی قسم کے غیر تغیر پذیر معتقداتِ جماعت پر کسی تمدن کی بنیاد ہوتی ہے، ان معتقدات کو اپنی جگہ سے ہلانا دشوار ہوتا ہے، یہ بحث کہ کسی قوم میں تعصب کا کس حد تک پایا جانا مفید ہے، اگر کوئی عقیدہ عقلی پہلو سے مہمل ہو تو اس سے اس کی اشاعت اور اس کے رسوخ پر کوئی اثر نہیں پڑتا،

۲۔ جماعت کے معتقداتِ غیر اساسی، یہ بحث کہ معتقداتِ اساسی کے علاوہ جماعت کے بعض ایسے معتقدات ہوتے ہیں، جن میں تغیر ہوتا رہتا ہے، اکثر ان معتقداتِ غیر اساسی میں ایک صدی سے بھی کم مدت کے اندر تغیر ہوجاتا ہے، ان تغیرات کے کیا کیا حدود ہیں، وہ کون سے معتقدات ہیں جن میں تغیر ہوجاتا ہے، زمانۂ حال میں معتقداتِ اساسی کی بنیادیں متزلزل ہوگئی ہیں، اور اخبارات اور اشاعتِ مطبوعات اس تغیر و انقلاب کے اصلی سبب ہیں، یہ بحث کہ اس انقلاب اور تغیر کی وجہ یہ ہے کہ زمانۂ سابق میں خیالات پر حکومتوں کا جو قابو تھا، وہ اب

باقی نہیں رہا ہے، زمانۂ حال میں خیالات کے اندر انتشار کی کیفیت جو پیدا ہو گئی ہے وہ حکومتوں کے تسلط کی سدِ راہ ہے،

(۱)

جماعت کے معتقداتِ اساسی

نظرِ غور سے دیکھو تو انسان کے تشریحی یعنی جسمانی اور اس کے نفسانی خصائص کے مابین ایک عجیب تشابہ پاؤ گے، انسان کے خصائصِ جسمانی میں بعض خصائص ایسے ہیں جن میں کبھی تغیر نہیں ہوتا، اور اگر ہوتا بھی ہے تو رفتہ رفتہ ایک مدت دراز میں، اور بعض ایسے خصائص ہیں جن میں ماحول یا دوسرے مؤثرات کی وجہ سے بہت آسانی کے ساتھ تغیرِ عظیم ہو جاتا ہے، اور یہ تغیر بعض اوقات کچھ اس طرح کا ہوتا ہے، کہ بادی النظر میں اس کے سبب سے خصائصِ اصلی پر بھی پردہ پڑ جاتا ہے،

بعینہٖ یہی حال انسان کے خصائصِ نفسانی کا بھی ہے، قوموں کے خصائصِ جسمانی کی طرح ان کے خصائصِ نفسانی بھی دو طرح کے ہوتے ہیں، بعض وہ ہیں جن میں کبھی تغیر نہیں ہوتا، اور بعض خصائص ایسے ہیں جو ہمیشہ تغیر پذیر رہتے ہیں، لیکن اقوام کے معتقدات و افکار پر عمیق نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے، کہ ان کے نفسانی خصائص میں جو خصوصیتیں اصلی اور غیر تغیر پذیر ہوتی ہیں، ان پر ہمیشہ وقتی اور تغیر پذیر خصائص پردہ ڈالے رہتے ہیں،

اس بنا پر معتقداتِ جماعت کی دو ممتاز قسمیں ہیں، ایک قسم کے معتقدات وہ ہوتے ہیں جو مدتوں ایک ہی حالت پر برقرار رہتے ہیں، اور جو گویا قومی تہذیب کے لئے مرکز کی طرح ہوتے ہیں، کہ اس قوم کے تمام عناصرِ تمدن اسی ایک مرکز سے باہم پیوست ہوتے ہیں،

اس قسم کے معتقدات اساسی کی مثال ہمارے زمانہ کے جمہوریت پسندی کے خیالات ہیں، بخلاف اس کے دوسری قسم کے معتقدات وافکار وہ ہوتے ہیں، جن میں ہر وقت تغیر ہوتا رہتا ہے، کہ آج اُن کا ظہور ہوا، اور کل مٹ گئے، لیکن اس قسم کے خیالات کی پیدائش ہمیشہ پہلی قسم کے مستحکم خیالات سے ہوتی ہے، اس طرح کے خیالات کی مثالیں جیسے موجودہ زمانہ میں طبعیین اور روحانیین کے مذاہب جو بیسیوں پیدا ہوئے، اور مٹ مٹ گئے، ان معتقدات کی حالت سطحِ بحر کی موجوں کی سی ہوتی ہے، کہ وہ سطحِ بحر پر برابر تلے اوپر پیدا ہوتی رہتی ہیں،

لیکن پہلی قسم کے مستحکم معتقدات وافکار میں تغیر پذیر معتقدات وافکار سے بہت تھوڑے مگر بہت مستحکم ہوتے ہیں، اور دراصل انہی افکار کے عروج وزوال سے قوموں کی تاریخ میں نیا دور شروع ہوتا ہے، اور حقیقت میں انہی مستحکم عقائد پر قوموں کے تہذیب و تمدن کا بھی دار مدار ہوتا ہے،

بلا شبہہ نفوسِ جماعت میں کسی ایسے عقیدہ یا خیال کو وقتی طور پر پیوست کر دینا تو بہت آسان کام ہے جو تغیر پذیر ہو، لیکن کسی ایسے عقیدہ کا دلوں میں راسخ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے، جو مدتوں ایک حال پر قائم رہے، اور بالکل ناقابلِ تغیر ہو، اور پھر اگر کسی طرح نفوسِ جماعت میں کبھی ایسے غیر تغیر پذیر عقیدہ کا نقش قائم بھی ہو گیا، تو اس کے بعد پھر دلوں سے اس نقش کے اثر کو مٹانا بھی کچھ آسان کام نہیں ہے، کسی غیر تغیر پذیر عقیدہ اور خیال کی حالت یہ ہوتی ہے، کہ اوّل تو کبھی نفوس میں اس کا رسوخ ہی نہیں ہوتا، اور اگر ہو گیا تو اب اس کو اپنی جگہ سے ہلانا دشوار ہو جاتا ہے، ہاں البتہ اس قسم کے عقیدے جو دلوں میں راسخ ہو گئے ہیں، ان کو مٹانے اور اپنی جگہ سے ہلانے کی صرف

ایک صورت ہوتی ہے، وہ یہ کہ سخت شورشیں ان عقیدوں کے خلاف برپا کی جائیں، اور مستحکم عقیدوں کے اثر کا شورشوں کے آہنی ہتھیاروں سے مقابلہ کیا جائے لیکن مشکل یہ ہوتی ہے کہ یہ شورشیں بھی اس وقت تک کارگر نہیں ہوتیں، تاوقتیکہ پہلے سے ان عقیدوں کا اثر مضمحل نہ ہوگیا ہو، اور پھر بھی شورشوں سے صرف اتنا فائدہ ہوتا ہے کہ عقیدوں کا بچا کھچا اثر مٹ جاتا ہے، بشرطیکہ عوائد مستمرہ اس اثر کو زائل ہونے دیں، باقی ان کے اختیار میں یہ نہیں ہے کہ وہ ان عقیدوں کے اثر کو دلوں سے بالکلیہ زائل و فنا کردیں،

پس حاصل یہ کہ جو خیالات عملِ توارث سے قوم کے دلوں میں جگہ پکڑ لیتے ہیں، ان کا ازالہ شورشوں سے بھی ممکن نہیں ہوتا، لیکن ان معتقدات کے فنا کرنے کی ایک تدبیر اور ہے جو عموماً بہت کارگر ہوتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ جو معتقدات عام طور پر مسلّم مان لئے گئے ہوں، ان میں بحث و مباحثہ شروع کردیا جائے، اصل میں عقیدہ اسی وقت تک عقیدہ رہتا ہے، جب تک وہ مناظرہ اور مباحثہ کی زد سے محفوظ رہتا ہے لیکن جہاں اس کے متعلق بحث و مباحثہ کا دروازہ کھولا گیا، بس اسکی قوت میں اسی وقت سے فرق آنے لگتا ہے، تمام عقیدوں کی قوت کا راز یہی ہے، کہ وہ عام نگاہوں سے کچھ اس طرح اوجھل رکھے جاتے ہیں، کہ ان کے سقم کی جانب کسی کا خیال تک نہیں جاتا،

لیکن اس کے بعد بھی مشکل یہ پیش آتی ہے، کہ وہ رسوم و رواج یا نظامِ حکومت و نظامِ تعلیم و تربیت وغیرہ، جو ان معتقداتِ اساسی پر مبنی ہوتے ہیں، ان معتقدات کی حفاظت کرتے ہیں، اور ان رسوم و رواج میں ذرا دیر میں تغیر ہوتا ہے، مگر جہاں ان رسوم میں تغیر ہوا، بس پھر اس عقیدہ کے مٹنے میں کوئی کسر نہیں رہتی، لیکن جب قوم کے معتقداتِ اساسی میں تغیر ہوجاتا ہے، تو اس کے بعد یہ بھی ضروری ہوتا ہے، کہ وہ اپنے تمام ارکانِ تمدن

اور عناصرِ تہذیب میں بھی ایک دم تغیر کر دے، اور تا وقتیکہ کوئی جدید عقیدہ اس فنا شدہ قدیم عقیدہ کی جگہ نہیں لے لیتا ہے، اُس وقت تک قوم پر ایک انتشار کی کیفیت طاری رہتی ہے،

غرض کسی قوم کے عقائد اساسی اس قوم کے لئے نعمت ہوتے ہیں، اور اُن کی قدر کرنا، اور ان کو شورشوں کے حملوں سے محفوظ رکھنا، اس قوم کا فرض ہوا کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ قومیں ہمیشہ اپنے ان معتقدات کی قدر وقیمت پہچانتی ہیں جو آبا و اجداد سے ان کو ورثہ میں ملتے ہیں، اور قوموں کو یہ معلوم رہتا ہے کہ اصل میں ان کے زوال کا دن وہی ہے جب ان کے عقائد اساسی نشانۂ ہدف بن جائیں، رومی قومیں جب تک شہر روم کی نہایت تعصب کے ساتھ پرستش کرتی رہیں، اُس وقت تک ان کا ستارۂ اقبال عروج پر رہا، لیکن جس دن سے اس عقیدہ کی بنیاد کھوکھلی ہوگئی، اسی روز سے رومیوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، اور یہی بات ہے کہ قومیں نہایت تعصب اور تنگ نظری کے ساتھ اپنے عقائد کی جانب سے جان توڑ مدافعت کرتی ہیں، تعصب گو عقلی پہلو سے کسی قدر مذموم کیوں نہ خیال کیا جائے، لیکن عملی حیثیت سے قوموں کی حیات و ممات میں ہمیشہ تعصب کو بہت بڑا دخل رہا ہے، قرونِ متوسطہ میں جو لوگ زندہ جلا دیئے جاتے تھے، تو کس غرض سے؟ صرف اس لئے کہ مسیحیت کے عقائد کی الحاد و دہریت کے جھونکوں سے حفاظت کیجائے، اسی طرح قرونِ متوسطہ میں بعض بڑے بڑے لوگوں کو مرتے دم کس بات کی حسرت رہ جاتی تھی، صرف اس بات کی کہ کاش وہ اپنے مذہب کی حفاظت کی راہ میں شہید ہوئے ہوتے، پھر بالآخر میدانِ جنگ میں ہمیشہ لوگ اپنی گردنیں کیوں کٹوایا کئے ہیں اس کی غرض بھی صرف یہی ہے کہ اجنبی حملوں کی زد سے قومی عقیدہ کے مستحکم قلعوں کی

حفاظت کی جائے، غرض دنیا میں ہمیشہ قوموں نے اپنے قدیم عقائد کی اجنبی حملوں سے اسی طرح مستعدی کے ساتھ حفاظت کی ہے، اور شاید کہ دنیا میں قیامت تک یہی ہوتا رہے گا،

اور گو جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں کسی جدید اعتقاد کا نفوس میں راسخ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جب کسی عقیدہ کو رسوخ حاصل ہو جاتا ہے تو اس کے غلبہ اور رسوخ میں ترقی ہوتی رہتی ہے، اور ایک مدت تک نفوسِ جماعت پر اسی عقیدہ کا قبضہ اور تسلط رہتا ہے، دیکھو یورپین قوموں پر ایک مدت تک اُن جھوٹے قصوں کا کیسا اثر قائم رہا، جو قدیم زمانہ میں مشہور و مسلّم تھے، حالانکہ واقع میں وہ کہانیاں اس قابل نہ تھیں کہ روشن عقلیں ان کو اس طرح بلا چون و چرا تسلیم کر لیتیں، باوجودیکہ اس زمانہ میں گلیلیو، نیوٹن، لبنٹز وغیرہ بڑے بڑے روشن خیال فلسفی موجود تھے، لیکن کسی کو بھی ان قصوں اور خرافات کے باطل کرنے یا ان کی حقیقت دریافت کرنے کا کبھی خیال نہیں آیا، اور صرف اسی ایک بات سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ معتقداتِ جماعت نفوس پر کیا ساحرانہ تسلط حاصل کر لیتے ہیں نیز اس بات کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے، کہ عقلِ انسانی کا دائرہ کس قدر محدود ہے،

لیکن جب یہ نیا عقیدہ ذہنوں میں خوب پختہ ہو جاتا ہے، تو اُس وقت اس قوم کا نظامِ حکومت، اس کا نظامِ معاشرت، اس کے علوم و فنون اور اس کے تمام اعمال و افعال کی بنا بھی یہی عقیدہ قرار پاتا ہے اب واضعانِ قوانین اسی عقیدہ کی بنیاد پر قوانین وضع کرتے ہیں، اور فلاسفہ اور اہلِ فن اسی عقیدہ کو پیشِ نظر رکھ کر اپنے اپنے فلسفہ اور اپنے اپنے فن کا سنگِ بنیاد رکھتے ہیں، اور گو کبھی اس عقیدہ سے بعض وقتی افکار اور

تغیر پذیر خیالات کا بھی نشو و نما ہوتا ہے، تاہم یہ وقتی افکار اور تغیر پذیر خیالات بھی اسی عقیدہ کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں، زمانۂ قدیم میں مصریوں کے تمدن کی بنا چند مذہبی خیالات تھے جن کا رنگ ان کے ہر شعبۂ زندگی پر چڑھا ہوا تھا، اسی طرح ازمنۂ متوسطہ میں اہلِ یورپ اور مسلمانوں کے تمدنوں پر بھی یہی دینی رنگ غالب تھا،

پس بیاناتِ بالا سے معلوم ہوا کہ ایک زمانہ کے تمام لوگ اپنے خیالات، افکار و عادات میں ایک دوسرے کے مشابہ جو ہوتے ہیں، تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کے موروثی عقائد میں کسی طرح کا اختلاف نہیں ہوتا، اور چونکہ انسان کی سیرت اور عادات کی ترکیب جس خمیر سے ہوتی ہے، وہ اس کے موروثی عقائد ہوا کرتے ہیں، اس لئے ہمارے ہر چھوٹے سے چھوٹے عمل کی بنا بھی ان ہی عقائد پر ہوتی ہے، اور ایک قوم اور ایک زمانہ کے لوگوں کے اعمال و افعال میں بھی ہمرنگی پائی جاتی ہے، اور گو ہماری عقلی حالت کسی قدر کیوں نہ برتر ہو جائے مگر ہم کو ان عقائد سے کسی وقت رہائی نہیں مل سکتی، پس حقیقی استبداد وہ ہے جو ہم پر غیر شعوری حالت میں مسلط ہوتا ہے اور جس سے مقابلہ کرنے کی کسی میں قدرت نہیں ہوتی، دیکھو قیصر، تیمر، چنگیز خاں، نپولین کس قدر صاحب نفوذ بادشاہ گذرے ہیں لیکن حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ و حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرح ان لوگوں کو کبھی نفوذ حاصل نہیں ہوا، البتہ اگرچہ بعض اوقات ان موروثی عقائد کا اثر تھوڑی دیر کے لئے کسی دغابازی کی وجہ سے زائل ہو جایا کرتا ہے، لیکن جو عقیدہ نفوس میں راسخ ہو گیا ہو اسکو دغابازی بھلا کیا فنا کر سکتی ہے، اس وقت بھی آخر میں جا کر اسی موروثی عقیدہ ہی کو فتح ہوتی ہے، انقلاب فرانس کے موقع پر جب عیسائیت اور شورشِ الحاد کے مابین جنگ جاری تھی تو اس وقت گو بانیانِ شورش کے نظام کے باوجود عام طور پر جماعت کا میلانِ طبع ظاہر میں فرانسیسی شورش ہی

کی جانب تھا، مگر آخر میں شورش ہی کا ستیاناس ہوا،

حقیقت یہ ہے کہ انسان جن چیزوں کا محکوم ہوتا ہے، وہ وہ انسانی اموات ہوتے ہیں جو قبروں کے اندر سے لوگوں پر حکومت کرتے ہیں،

پھر یہ عقائد اور خیالات ذہنوں میں جو رسوخ حاصل کرتے ہیں، اُن کے لئے یہ بھی کچھ ضروری نہیں ہے کہ عقلی پہلو سے بھی یہ خیالات اور عقائد اپنے اندر واقعیت رکھتے ہوں بلکہ اس کے خلاف جن عقائد کو غلبہ ہوتا ہے وہ عموماً وہی خیالات ہوتے ہیں جو عقلی پہلو سے گرے ہوئے ہوتے ہیں، مذہبِ اشتراکیت جو اس وقت ہم کو انحطاط پذیر نظر آرہا ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ عقلی پہلو سے وہ کچھ کم رتبہ ہے، اور اس لئے اس کا اثر لوگوں پر نہیں ہوتا، بلکہ اصلی وجہ یہ ہے کہ مذہبِ اشتراکیت کے علاوہ اور جو مذاہب ہیں، وہ انسان سے یہ وعدہ کرتے ہیں کہ ان کو اس جہان کے علاوہ ایک دوسرے جہان میں راحتِ ابدی حاصل ہوگی، بخلاف اس کے مذہبِ اشتراکیت لوگوں کو یہ طمع دلاتا ہے، کہ اگر اس کے اصول پر عمل درآمد کیا گیا تو لوگوں کو اسی جہان میں حیاتِ جاودانی حاصل ہو سکتی ہے، لیکن جب اس کے اصول پر عمل کیا جاتا ہے، تو اس وقت اس کے جھوٹے وعدوں کی قلعی کھل جاتی ہے، یہی بے اعتباری ہے، جو مذہبِ اشتراکیت کو فروغ نہیں حاصل ہونے دیتی،

(۲)

جماعت کے معتقداتِ غیر اساسی

جماعت کے عقائدِ غیر متغیرہ جن کی میں نے صفحاتِ بالا میں تشریح کی ہے ان کے علاوہ جماعت کے بعض افکار اور عقائد ایسے بھی ہوتے ہیں، جو ہمیشہ تغیر پذیر اور حالتِ زوال

میں رہتے ہیں،

لیکن ان تغیر پذیر افکار میں سے بعض وہ ہوتے ہیں جو بالکل نقش برآب ہوتے ہیں، اور بعض عقائد جو زیادہ اہم ہوتے ہیں، وہ بھی زیادہ سے زیادہ ایک صدی تک اپنی حالت پر قائم رہتے ہیں، اور جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، کسی قوم کے یہ تمام تر تغیر پذیر افکار و عقائد مبنی ہوتے ہیں ان اصولی افکار پر، جو اس قوم میں بذریعۂ وراثت رسوخ پیدا کر لیتے ہیں، اس کی مثال میں ہم نے اپنے ملک کے نظام سیاسی کو پیش کیا تھا، کہ گو ہمارے ملک کے تمام فرقوں کے اصول ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں، مگر ان سب کا ایک مشترک مقصد ہے جو ہمارے مخصوص مزاجِ عقلی سے پیدا ہوا ہے، نیز ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ خیالات و افکار میں صوری اور اسمی تغیر کر دینے سے ان خیالات کی اصلی حقیقت نہیں بدلتی، اور اس کی مثال میں ہم نے بانیانِ انقلابِ فرانس کو پیش کیا تھا، کہ گو یہ لوگ اپنے عادات و اطوار اور خیالات میں رومیوں کی تقلید کرنا چاہتے تھے، لیکن اس سے وہ کچھ رومی نہیں بن گئے، کیونکہ ان کے قومی روایات رومیوں کے قومی روایات سے بالکل مختلف تھے، بس دانایانِ قوم کا جو اصلی فرض ہوتا ہے، وہ صرف یہ ہے کہ وہ تغیر پذیر قومی عقائد میں سے غیر تغیر پذیر قومی عقائد کو ڈھونڈھ نکالیں، اور حقیقی عقائد کو غیر حقیقی عقائد سے اور ملمع کو اصل سے متمیز کر دیں، باقی رہا ان عقائد میں تغیر کرنا تو یہ ان کے بس کی بات نہیں،

لیکن جب ہم کسی قوم کے عقائد و خیالات کی تجرید و تفرید کر کے معتقداتِ اساسی کو معتقداتِ غیر اساسی سے متمیز کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ قوموں کے مزاجِ عقلی کو چھوڑ کر قوموں کے باقی اور دیگر حالات میں ایک مدت کے بعد عظیم الشان تغیر ہو جاتا ہے، شواہد و امثلہ تلاش کرنے کے لئے زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں، ایک اپنے ہی ملک کی تاریخ

کو لو ۱۷۹۰ئہ اور ۱۸۲۰ئہ کے مابین جو واقعات ملک فرانس میں ظہور پذیر ہوئے ہیں، ان میں ہم نے دیکھا ہے کہ کس سرعت کے ساتھ قوم کے مذہبی اور سیاسی خیالات میں تغیر ہوتا رہا جو لوگ پہلے نہایت جمہوریت پسند تھے وہ کس طرح ایک بارگی بادشاہ پرست بن گئے، جن کا تعلق پہلے کیتھولک فرقہ سے تھا، وہ کس طرح بعد کو ملحد و بے دین ہو گئے، پھر سب سے زیادہ تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو پہلے تسلط و استبداد کے جانی دشمن تھے خدا جانے ان میں کیا تغیر ہو گیا کہ وہ یک بارگی نپولین کے سامنے بالکل بے دست و پا ہو کر اس کے حلقہ بگوش بن گئے،

اسی طرح ہمارے ملک کے علاوہ اگر یورپ کے دیگر ممالک کی سیاسی تاریخ کا مطالعہ کرو تو معلوم ہوگا، کہ ادھر کچھ عرصہ کے اندر یورپ کی سیاست میں کتنے عظیم الشان تغیرات واقع ہوئے ہیں، پہلے انگریز ہمارے حلیف تھے، پھر روس کے مقابلہ میں انگریزوں نے دوبارہ ہم کو دھوکا دیا، اور ہمارے دشمن بن گئے، اور اس کے بعد اب پھر وہ ہمارے حلیف ہیں،

علاوہ بریں ان مذہبی اور سیاسی تغیرات کے علاوہ مختلف علوم و فنون میں بھی ایک مدت کے بعد عظیم الشان تغیر ہو جاتا ہے، آج کل فلسفہ کے جو مختلف اصول ہمیں نظر آتے ہیں، وہ سب اسی کلیہ کے شواہد ہیں، اسی طرح اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آج ایک آئیڈیا مصور قوم کو مسخر کئے ہوئے ہے، تو کل وہی قوم کی نگاہ میں ذلیل ہو جاتا ہے،

لیکن یہ تغیرات اور انقلابات زمانہ جن کو ظاہر بین نگاہیں حقیقی اور اصلی تغیرات سمجھتی ہیں، ان میں جب ذرا زیادہ غور کیا جاتا ہے، تو نظر آتا ہے کہ جو خیالات و افکار موروثی عقائد کے خلاف اور ان کے برعکس ہوتے ہیں، وہی سریع الزوال بھی ہوتے ہیں، جو عقیدہ اور خیال قوم کے موروثی عقائد کے خلاف ہو، اس کے متعلق یاد رکھو کہ اس کو ایک لمحہ

فروغ نہیں ہو سکتا، لیکن جو خیالات موروثی عقائد کے خلاف نہیں ہوتے وہ حسبِ حیثیت ورتبہ ایک مدت تک باقی رہتے ہیں، اور اس کے بعد جب ان کا وقت آجاتا ہے، تو وہ بھی مٹ جاتے ہیں،

زمانہ حال میں اس قسم کے تغیر پذیر خیالات کی بڑی کثرت ہے، اور اس کے تین سبب ہیں۔

۱۔ چونکہ قدیم افکار و عقائد بہت بوسیدہ اور ازکار رفتہ ہو گئے ہیں، اس لئے اب وقتی اور عارضی افکار و خیالات کے لئے میدان بہت وسیع ہو گیا ہے،

۲۔ جماعت کے اثر میں ترقی ہو گئی ہے، اور جو قوتیں جماعت کے اثر کو روکنے والی تھیں، وہ اس کے غلبہ کے آگے سپر انداز ہو گئی ہیں، اور چونکہ جماعت کے افکار بے حد تغیر پذیر ہوتے ہیں، اس لئے اب وہ بالکل خودسر ہو گئی ہے،

۳۔ اس زمانہ میں مطبوعات گھر گھر پھیلے ہوئے ہیں، جن کی وجہ سے ادباش لوگوں کے سامنے عجیب عجیب متناقض اور غیر مربوط خیالات پیش ہوتے ہیں، آج ایک خیال اچھی طرح ذہنوں میں راسخ نہیں ہونے پایا کہ کل دوسرا خیال کتابوں کے ذریعہ سے پھیلا دیا جاتا ہے،

یہ تین سبب ہیں جن کی وجہ سے ہمارے زمانہ میں طبیعتوں میں عجیب قسم کا انتشار پیدا ہو گیا ہے اور تاریخِ انسانی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے، جو دوسرے ادوار سے اس بات میں ممتاز ہے، کہ موجودہ دور میں راے عام حکومت سے بالکل آزاد ہو گئی ہے اور حکومتوں کو مجبوراً راے عام کی اتباع کرنا پڑتی ہے،

زمانہ سابق میں چونکہ قاعدہ یہ تھا، راے عام پر حکومتوں، اور چند صاحبِ اثر لوگوں کا غلبہ ہوتا تھا، اس لئے اس زمانہ میں راے عام میں اضطراب و انتشار نہیں پیدا ہونے

پاتا تھا لیکن اس زمانہ میں حالت یہ ہو گئی ہے کہ اڈیٹرانِ اخبار اور ممتاز صحائف خود راے عام کی پیروی کرتے ہیں، اور رہبری اور رہنمائی سے جی چراتے ہیں، بلکہ اہلِ سیاست کا حال تو یہ ہے کہ وہ بجاے راے عام سے آگے آگے چلنے کے اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں، اور راے عام کا رعب کچھ ان پر ایسا غالب آگیا ہے کہ وہ کسی ارادہ پر منٹ بھر نہیں قائم رہتے ہیں،

گذشتہ بیانات سے معلوم ہوا کہ راے عام روز بروز حکومتوں کی سیاست پر حاوی اور مستولی ہوتی جاتی ہے، اور اب یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے کہ وہ قوموں کو مصالحت اور مخالفت پر بھی مجبور کرنے لگی ہے، فرانس اور روس کے مابین جو آخری عقدِ مصالحت ہوا ہے، اس کا باعث راے عام ہی تھی، اور اب یورپ اور تمام بادشاہ اس بات کے عادی ہو گئے ہیں کہ اپنے باہمی مراسلات اور باہمی مکالمات کو شائع کریں، تاکہ جمہور ان پر راے زنی کر سکیں، لوگ کہتے ہیں کہ سیاست ان چیزوں میں سے نہیں ہے، جو جذبات و مشاعر کے زور پر چلتے ہیں، لیکن میری راے میں یہ خیال غلط ہے کہ اس وقت جماعت حکومتوں کی سیاست پر مسلط ہے، اور جماعت کے تمام کام عقل کے زور پر نہیں بلکہ مشاعر و جذبات کے زور پر انجام پاتے ہیں،

لیکن حکومتوں کے علاوہ جرائد و صحائف کی حالت بھی موجودہ زمانہ میں ناگفتہ بہ ہو گئی ہے، اور ان کو بھی مجبوراً جماعت کے غلبہ کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا ہے، اور ظاہر میں یہ جو نظر آتا ہے کہ لوگوں پر جرائد کا اثر ہے، تو یہ محض اس وجہ سے ہے کہ وہ بھی روزانہ راے عام کے ساتھ ساتھ اپنی پالیسی میں تغیر کرتے رہتے ہیں، اور ان کا وظیفۂ عمل صرف یہ رہ گیا ہے کہ لوگوں کی رایوں کو بلاکم و کاست پیش کر دیں، اب اخبارات نے صرف اس بات پر قناعت کر لی ہے کہ روزانہ چھاپ دیا کریں، اور طوعاً و کرہاً جس طرح بن پڑے جماعت کے جذبات

اور اس کی خواہشوں کی اتباع کریں اور اگر وہ یہ نہ کریں تو ان کو خسارہ برداشت کرنا پڑے،
بڑے بڑے قدیم جرائد کی حالت دیکھو، لاکانسٹیٹیوشنل ڈیٹیں اور سائکل، یہ کسی زمانہ میں
ایسے نامور اخبار تھے کہ ہمارے آبار واجداد ان کے اقوال و آرار کو منزلۂ وحی سمجھتے تھے
لیکن اب ان کی حالت یہ ہوگئی ہے کہ وہ بعض نکاہات اور تجارتی اشتہارات سے ناظرین
کی ضیافتِ طبع کردیا کرتے ہیں، غرض اس زمانہ میں کوئی اخبار ایسا نہیں ہے، جو اپنی
قلتِ آمدنی کے باعث اپنی ذاتی رائے کا اظہار کرتا ہو، کیونکہ اس بات کا خوف لگا رہتا ہے
کہ اگر اُس نے اپنی ذاتی رائے کا اظہار کیا، تو لوگ اس کو ناپسند کریں گے، اور اخبار کی وقعت
گرجائے گی، جماعت کی حالت یہ ہوگئی ہے کہ وہ زیادہ تر اس بات کو پسند کرتی ہے، کہ
اخبار میں کچھ ظریفانہ چٹکلے ہوں، کچھ مضحکہ آمیز واقعات ہوں اور اسی طرح کا دلچسپی کا سامان
ہو، لیکن اس کے خلاف کوئی اخبار آزادانہ اظہارِ خیال کرتا ہے، تو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بتائید
اس اخبار کی اس میں کوئی ذاتی غرض مخفی ہے، صرف یہی نہیں بلکہ اب حالت یہ ہے کہ اہلِ نقد
و نظر بھی کسی کتاب یا ڈرامے کے شائع کرنے سے دل چراتے ہیں، کیونکہ کتابوں پر جو
نکتہ چینی کی جاتی ہے، اس سے بجائے نفع کے ضرر ہوتا ہے، اخبارات کو اب اس کا پورا
یقین ہوگیا ہے کہ ذاتی خیالات کے ظاہر کرنے اور کسی کتاب پر ناقدانہ نظر ڈالنے سے کوئی
فائدہ نہیں، اس لئے وہ اب کسی کتاب پر نکتہ چینی کے بجائے صرف کتابوں پر اشتہار شائع
کر دیتے ہیں، اور لوگوں کو کتاب کی خریداری کے جانب مائل کرنے کی غرض سے دو چار
سطریں اپنی جانب سے بھی لکھ دیتے ہیں،

پس جرائد اور حکومتوں کا مشغلہ اور وظیفۂ عمل اب صرف یہ رہ گیا ہے کہ رائے عام
کا تتبع کریں، یہی وجہ ہے کہ کسی اہم واقعہ یا کسی ضروری قانون یا کسی لکچر کو ان کے نزدیک

اہمیت جو حاصل ہوتی ہے، تو وہ صرف اس لحاظ سے کہ اُن چیزوں کا اثر لوگوں پر کیا پڑا اور اس اثر کا دریافت کرلینا کچھ مشکل بھی نہیں ہوتا کیونکہ جماعت کے افکار اس قدر تغیر پذیر ہوتے ہیں کہ آج جس سے وہ ناراض تھی کل اُس سے وہ خوش ہوجاتی ہے، اور اس بنا پر اس کے تغیر پذیر اور متنوع تاثیرات کا حال جلد دریافت ہوجاتا ہے،

غرض اس وقت جماعت کی حالتِ اضطرابی سے جو نتائج پیدا ہوئے ہیں، وہ یہ ہیں کہ یقین زائل ہوگیا ہے، وجدانیات اور جذبات کا اثر غالب ہوگیا ہے، اور قومیں ایک حالتِ اضطراب و خوفتی میں ہیں، اور جدید مذاہب جو پیدا ہوئے ہیں، مثلاً مذہبِ اشتراکیت تو ان کے معتقدین کی حالت یہ ہے کہ وہ ادنیٰ طبقات میں سے ہیں، اور متوسط الحال طبقہ جو ہے وہ کچھ اس طرح حالتِ شک میں گرفتار ہے کہ اس کو کسی بات پر یقین ہی نہیں رہا ہے

لیکن یہ انقلاب کوئی ادھر بیس پچیس سال کے عرصہ سے لوگوں کے خیالات میں ہوا ہے ورنہ اس سے قبل کی حالت یہ تھی کہ چونکہ افکار و خیالات چند عقائد عامہ پر مبنی ہوتے تھے، اس لئے ان کے خاص خاص اغراض متعین ہوتے تھے، مثلاً جو شخص حکومت پرست ہوتا تھا اس کے خاص قسم کے خیالات عملی طور پر منضبط ہوتے تھے، جو جمہوریت پسند ہوتا وہ بھی چند مخصوص خیالات کا پابند ہوتا تھا، اگر ایک شخص کا یہ اعتقاد ہوتا کہ انسان بندر سے پیدا ہوا ہے تو دوسرے کی رائے بالکل اس کے خلاف ہوتی، اگر ایک شخص کو انقلاب و شورش سے نفرت ہوتی تو دوسرا اسے بہت پسند کرتا، اسی طرح بعض اسماء اس قسم کے تھے کہ ہمیشہ اُن کے ساتھ خشوع و اجلال کا اظہار ضروری سمجھا جاتا تھا، مثلاً روبسپیر اور مارٹ وغیرہ، اور بعض نام وہ ہوتے تھے جن کے ساتھ ذلت و حقارت کا برتاؤ کیا جاتا تھا، مثلاً اگسٹس، قیصر اور نپولین وغیرہ، لیکن اس وقت حالت بالکل مختلف ہوگئی ہے، اور بحث و مباحثہ کی بدولت کسی خیال کی وقعت

لوگوں کے ذہنوں میں باقی نہیں رہی ہے،

لیکن باوجود اس کے ہم کو اس انتشار خیال سے جو ہمارے زمانہ میں پیدا ہوگیا ہے بالکل گھبرانا نہ چاہیئے، ہاں بلاشبہہ یہ ضرور ہے کہ یہ انتشارِ خیال قومی انحطاط و تنزل کا باعث ہوتا ہے، اور یہ بھی صحیح ہے کہ نفوسِ جماعت پر مضطرب الخیال اور اہلِ افکار لوگوں سے زیادہ اُن لوگوں کا اثر پڑتا ہے، جن کے قلوب مطمئن اور خیالات راسخ ہوتے ہیں، لیکن ہم کو یہ بات بھی فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ جب کوئی خیال یا کوئی رائے نفوس پر ایسا غلبہ حاصل کرلیتی ہے، جیسا اس وقت جماعت کو حاصل ہوگیا ہے، تو اس میں ایک استبدادی شان پیدا ہوجاتی ہے، جو تمام کائنات کو مسخر کرلیتی ہے، اور جس سے ایک مدت کے لئے حریتِ فکری کا دروازہ مسدود ہوجاتا ہے، اس لئے اب ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم جماعت کے غلبہ کو تسلیم کرلیں، اگرچہ ہم یہ جانتے ہیں کہ جماعت کا غلبہ اور تسلط ہمارے تمدن کو برباد کرکے چھوڑے گا،

باب سوم

جماعت کے مختلف اقسام کی نفسانی تشریح

فصل اوّل

جماعت کے اقسام

جماعت کی عام تقسیم و تجنیس، جماعت کی قسمیں،

۱۔ وہ جماعتیں جو مختلف عناصر سے مرکب ہوتی ہیں،

ان جماعتوں کے ممیزاتِ عمومی، قومیت کے اثرات، قومیت کا اثر جتنا قوی ہوتا ہے اسی قدر روحِ جماعت ضعیف ہوتی ہے، قومیت کا اثر حالتِ تمدن کی، اور جماعت کا اثر دورِ وحشت کی یادگار ہوتا ہے،

۲۔ وہ جماعتیں جو متشابہ عناصر سے مرکب ہوتی ہیں،

ان جماعتوں کے اقسام، ذاتیں، فرقے، طبقات وغیرہ،

صفحاتِ بالا میں ہم جماعتوں کے نفسانی خصائص کو تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے، اب جماعتوں کے نفسانی خصائص کی وضاحت کرنے کے بعد ان خاص خاص اوصاف کی وضاحت

کرنا بھی ضروری ہے، جو جماعت کی بعض بعض قسموں کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں، اس لئے اب ذیل میں ہم پہلے جماعت کے اقسام بالاجمال بیان کرتے ہیں، پھر اس کے بعد جماعت کی بعض خاص قسموں کو لے کر قسم وار خصائص کی تشریح کریں گے،

جماعتوں میں سب سے پہلے ہماری نظر جس جماعت پر پڑتی ہے، وہ ایسی جماعت ہوتی ہے، جس کے افراد کے مابین ہمیں کوئی رابطۂ اتحاد بجز اس کے نظر نہیں آتا، کہ ان جماعتوں کا سردار چند آوارہ گرد افراد کو اپنے ذاتی اثر سے اپنے ذاتی اغراض حاصل کرنے کے لئے مجتمع کر لیتا ہے، اس قسم کی ابتدائی جماعتوں کی مثال میں ہم اُن گروہوں کو پیش کر سکتے ہیں جو قدیم زمانہ میں دولتِ روم پر مختلف اوقات میں حملہ آور ہوئے تھے،

پھر ان کے بعد ان جماعتوں کا نمبر آتا ہے، جن میں مختلف عوامل اور ماحول کے اثر سے مختلف نفسانی خصائص کا ظہور ہونے لگا ہو، اور گو ان جماعتوں میں بعض ایسے اوصاف بھی پیدا ہو جاتے ہیں، جو ان ہی کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں، لیکن یہ مخصوص اوصاف ہمیشہ جماعت کے اوصافِ عمومی کے زیر اثر رہتے ہیں،

لیکن جب ان دونوں قسم کی جماعتوں میں وہ اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں، جن کی تشریح صفحاتِ بالا میں گذر گئی ہے، تو اس وقت ان کو "جماعتِ نفسی" یا جماعت منتظمہ" کہتے ہیں،

ان جماعتوں کی تقسیم حسب ذیل طریقہ پر کی جا سکتی ہے،

۱۔ وہ جماعتیں جن کی ترکیب مختلف عناصر سے ہوتی ہے،	۱۔ غیر معروف الاسم جماعتیں (جیسے شہدوں، بچوں، یا شوارعِ عام کی جماعتیں وغیرہ)

۲۔ معروف الاسم جماعتیں، مثلاً جیوری کی جماعت یا نیابی مجالس)

۲۔ وہ جماعتیں جن کی ترکیب متشابہ عناصر سے ہوتی ہے،

۱۔ سیاسی اور مذہبی فرقے،

۲۔ پیشہ ور جماعتیں،

۳۔ طبقات (یعنی قوم کا طبقۂ اعلیٰ، طبقۂ متوسط اور طبقۂ ادنیٰ)

(۱)

وہ جماعتیں جو مختلف النسل افراد سے مرکب ہوتی ہیں

یہ جماعتیں جو مختلف النسل، مختلف الخیال اور مختلف العقیدہ افراد سے مرکب ہوتی ہیں، اسی قسم کی جماعتیں ہیں جن کے نفسانی خصائص کی تشریح ہم نے صفحاتِ بالا میں کی ہے، یہ جماعتیں عموماً ایسے افراد سے مرکب ہوتی ہیں، جن کے پیشے اور کاروبار مختلف ہوتے ہیں، جب اس قسم کے چند افراد مجتمع ہو کر جماعت کی تشکیل کرتے ہیں، تو ان کے انفرادی نفسانی خصوصیات پر اُن خصائص سے پردہ پڑ جاتا ہے، جو عموماً جماعتوں میں پائے جاتے ہیں، اور جن میں اس خصوصیت کو زیادہ اہمیت ہوتی ہے، کہ جماعت میں آکر افراد کی عقلی خصوصیتیں، جماعت کے جذبات واحساسات سے مغلوب ہو جاتی ہیں،

جماعاتِ مختلفۃ العناصر پر جو عوامل اثر کرتے ہیں، اُن میں سے ایک عامل یعنی قومیت کا اثر ان جماعتوں پر بہت گہرا ہوتا ہے، صفحاتِ بالا میں ہم متعدد جگہ بیان کر چکے ہیں کہ جس طرح قومیت کا اثر افراد کے افعال وعادات پر گہرا ہوتا ہے، اسی طرح جماعتیں بھی

اس اثر کی بہت زیادہ محکوم ہوتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ جو جماعت صرف انگریزوں سے مثلاً مرکب ہوتی ہیں، اس کی حالت اس جماعت سے مختلف ہوتی ہے، جس میں روسی یا فرانسیسی قوم کے افراد بھی شامل ہوتے ہیں،

جب چند مختلف الجنس افراد مجتمع ہوتے ہیں، تو گو وہ منافع اور مقاصد جن کے لیے یہ افراد مجتمع ہوئے ہیں، ظاہر میں متحد ہوں، لیکن جہاں تک اس جماعت کے شعور اور دماغی حالات سے تعلق ہے، ان افراد میں اختلافِ قومیت کی بنا پر ضرور کچھ نہ کچھ فرق نمایاں رہتا ہے، اشتراکیین نے اکثر ایک ایسی مجلس منعقد کرنے کا ارادہ کیا، جس میں ہر قوم کی مزدور پیشہ جماعت کے ڈیلیگیٹ شریک ہوں، لیکن ہمیشہ اس کا نتیجہ باہمی اختلاف کی صورت میں ظاہر ہوا، یورپ کی قوموں میں باہم اتنا اختلاف ہے کہ اگر لاطینی قوم کا میلان اس جانب ہے کہ تمام قومی فرائض کو حکومت انجام دے تو اس کے مقابلہ میں انگریزی قوم حکومت کے دائرۂ عمل کو بہت محدود کر دیتی ہے، اور اگر لاطینی قومیں افراد کی حریتِ شخصی اور استقلالِ ذاتی کو عملاً ہیچ سمجھتی ہیں تو اس کے مقابلہ میں انگریزی قوم میں تمام کام افراد کے ذاتی استقلال اور اُن کی ذاتی ہمت سے انجام پاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ قومی اختلافات کی بنا پر یورپ کے اشتراکیین اور جمہوریت پسندوں کے اصول اور مذاہب میں ہم کو نمایاں اختلاف نظر آتا ہے،

قومیت کا اثر جماعت پر اس قدر گہرا ہوتا ہے کہ یہ اثر جماعت کے حرکات وسکنات میں ہمیشہ پیش پیش اور نمایاں رہتا ہے، اسی مقام پر سے یہ کلیہ قائم کیا گیا ہے کہ قومیت کی روح جتنی زیادہ قوی ہوگی اُسی قدر جماعت میں انحطاط پذیر اوصاف کا اثر ضعیف ہوگا، بات یہ ہے کہ جماعت کی روح دورِ توحش کی یادگار ہے، اور جب اس روح کا غلبہ

ہوتا ہے، تو جماعت سے وحشت کے افعال صادر ہونے لگتے ہیں، لیکن قومیت کی روح دورِ تمدن کی یادگار ہے، تو جب تک جماعت پر اس روح کا غلبہ رہتا ہے، اُس وقت تک قوم جماعت کے اثر و غلبہ سے اطمینان میں رہتی ہے،

اس قسم کی مختلفۃ العناصر جماعتوں کے تحت میں بعض وہ جماعتیں شامل ہیں، جو مجہول الاسم ہوتی ہیں، مثلاً شوارعِ عام کی جماعتیں یا شہدوں کی جماعتیں وغیرہ، اور بعض جماعتیں وہ ہوتی ہیں جو خاص خاص اسماء کے ساتھ مشتہر ہوتی ہیں، مثلاً جیوریوں کی جماعتیں اور نیابتی مجلسیں وغیرہ، ان دونوں قسم کی جماعتوں میں جو اختلاف و امتیاز ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ پہلی قسم کی مجہول الاسم جماعتیں اپنے نتائجِ اعمال کی ذمہ دار نہیں ہوتیں، اور دوسری قسم کی جماعتیں اپنے نتائجِ اعمال کی ذمہ دار ہوتی ہیں،

(۲)

وہ جماعتیں جو متحد النسل افراد سے مرکب ہوتی ہیں

وہ جماعتیں جو متحد النسل افراد سے مرکب ہوتی ہیں، ان کی تین قسمیں ہیں،

۱۔ فرقے (۲) پیشہ ور جماعتیں (۳) طبقات،

ان اقسام میں فرقوں کا پہلا مرتبہ ہے، جن کی ترکیب اُن افراد سے ہوتی ہی، جو تربیت اور پیشہ میں مختلف ہوتے ہیں، لیکن جن کے درمیان رابطۂ اتحاد صرف وحدتِ اعتقاد سے ہوتا ہے، ان جماعتوں میں دینی اور سیاسی فرقے شامل ہیں، ان کے بعد دوسرا درجہ پیشہ ور جماعتوں کا ہی، جن کی تشکیل اُن افراد سے ہوتی ہے جو پیشہ اور تربیت میں متحد ہوتے ہیں، مثلاً فوجی جماعتیں وغیرہ، پھر ان کے بعد سب سے اعلیٰ مرتبہ طبقات کا ہے، جن کی

تشکیل اُن افراد سے ہوتی ہے، جن کے درمیان رابطۂ اتحاد نہ تو فرقوں کی طرح وحدتِ اعتقاد سے ہوتا ہے، اور نہ پیشہ ور جماعتوں کی طرح وحدتِ تربیت سے، بلکہ جن کے ذرائع معاش متحد ہوتے ہیں، ان کی مثال زراعت پیشہ دیہاتی وغیرہ ہیں،

لیکن چونکہ اس کتاب میں میرا مقصود صرف جماعاتِ مختلفۃ العناصر سے بحث کرنا ہے اور میرا ارادہ یہ ہے، کہ جماعاتِ موتلفۃ العناصر سے ایک جداگانہ کتاب میں بحث کروں، اس لئے اب میں جماعاتِ موتلفۃ العناصر کے بیان کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتا، اور جماعاتِ مختلفۃ العناصر کے بعض مخصوص اقسام سے بحث کرکے کتاب کو ختم کرتا ہوں،

فصل دوم

جرائم پیشہ جماعتیں

جرائم پیشہ جماعتیں، جماعت قانون کی نگاہ میں مجرم ہو سکتی ہے، مگر فلسفیانہ نگاہ میں اس کو مجرم نہیں کہا جا سکتا، جماعت سے غیر شعوری کی حالت میں افعال کا صدور ہوتا ہے، بیانِ ماسبق کی مختلف مثالیں، ماہ ستمبر کی شورہ پشت جماعت کے افعال کی نفسانی تشریح، اس جماعت کے افکار، اس کے شعور اور اس کے اخلاق پر بحث،

چونکہ ایک مدت تک مختلف ہیجانات اور عوامل کے زیر اثر رہتے رہتے جماعت پر غیر شعوری کی ایک ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ وہ آلۂ ہیجان ہو کر تمام اوامر و احکام کی تعمیل کرنے لگتی ہے، اور اسی حالت میں اس سے بعض اوقات جرائم کا ارتکاب بھی ہو جاتا ہے، اس لئے عام استعمال اور علم النفس کی کتابوں میں جماعتوں کے جانب مجرمانہ افعال کا بھی انتساب کیا گیا ہے، لیکن میرے خیال میں فلسفیانہ حیثیت سے جماعت کی جانب مجرمانہ افعال کا انتساب کرنا سخت غلطی ہے، یہ صحیح ہے کہ جماعت کے بعض افعال بعض اوقات جرم کی حد کے اندر آجاتے ہیں، لیکن یہ جرائم اسی طرح کے ہوتے ہیں، جس طرح درندے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں، اور باوجود اس کے درندوں کو کوئی مجرم نہیں کہتا، بات

یہ ہے کہ جماعت سے جو جرائم سرزد ہوتے ہیں وہ کسی ہیجِ شدید کی بدولت اس سے وقوع میں آتے ہیں، اور اس ہیجِ شدید سے متاثر ہو کر جو افراد ان جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں، وہ یہ نہیں سمجھتے کہ وہ جرائم کا ارتکاب کر رہے ہیں، بلکہ وہ یہ سمجھتے ہیں، کہ وہ ایک واجب یا فرض ادا کر رہے ہیں، اور ظاہر ہے کہ یہ شان مجرموں کی نہیں ہوتی ہے

اس طرح کے واقعات میں سے ایک واقعہ قلعۂ باسٹل کے مہتمم جیل موسیو لونی کے قتل کا ہے، تفصیل اس واقعہ کی یہ ہے، کہ قلعۂ باسٹل پر انقلاب فرانس کے زمانہ میں جب شورش پسندوں کا قبضہ ہو گیا تو باغیوں نے وہاں کے مہتمم جیل کو گھیر لیا، اور اس بیچارے پر ہر طرف سے بوچھار شروع ہو گئی، کوئی اس کی بابت پھانسی دینے کی رائے دیتا تھا، کوئی کہتا تھا، کہ اس کو قتل کر دینا چاہیئے، کسی کی رائے یہ تھی کہ نہیں گھوڑے کی دم میں باندھ کر اس کی تشہیر کرنا چاہیے، غرض اس کی بابت ہر شخص ایک نئی رائے دیتا تھا، اور وہ بیچارہ مدافعت میں مشغول تھا، کہ اتفاق سے باغیوں کے گروہ میں سے ایک شخص کے اس کی لات لگ گئی، بس پھر کیا تھا، مجمع غصہ سے بیتاب ہو گیا، اور رائے یہ قرار پائی کہ اس کی لات جس شخص کے لگی ہے، وہ اس کو قتل کرے، راوی کا بیان ہے کہ لات جس شخص کے لگی تھی وہ ایک تماشہ بین نانبائی تھا، جو وہاں تماشہ دیکھنے گیا تھا، اس نے جو یہ سنا کہ مجھے مہتمم جیل کو قتل کرنا ہو گا، تو وطن پرستی کے جوش کی بنا پر اُسے خیال پیدا ہوا کہ اچھا میں وطن کا ایک فرض ادا کر کے ایک تمغہ حاصل کروں گا، اس جوش میں آ کر اُس نے تلوار کا ایک وار کیا، لیکن وار خالی گیا، جھنجھلا کر اُس نے جیب سے چھرا نکالا اور اس سے مہتمم جیل کا کام تمام کر دیا،

اس مثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح غیر شعوری کی حالت میں جماعت سے جرائم

کا صدور ہوتا ہے، اسی واقعہ میں دیکھو کہ جماعت کس طرح خارجی تحریک سے سفّہ بن گئی اور قاتل یہ سمجھتا رہا کہ وہ وطن کا فرض ادا کر رہا ہے، پس اس طرح کے افعال جو جماعت سے صادر ہوتے ہیں، گو قانوناً جرم سمجھے جا سکتے ہیں، مگر علم النفس کے نقطۂ نظر سے وہ کسی طرح جرم کی حد میں داخل نہیں ہیں،

جرائم پیشہ جماعتوں کو دوسری جماعتوں سے کسی بات میں امتیاز نہیں ہوتا، اور ان جماعتوں میں بھی تقریباً وہ تمام خصائص پائے جاتے ہیں، جن کا ظہور دیگر جماعتوں میں ہوتا ہے، اور جن کو ہم صفحاتِ بالا میں بالتفصیل بیان کر چکے ہیں، مثلاً اثر پذیری، تلون مزاجی اور ضعفِ عقلی وغیرہ،

اب ہم ذیل میں جرائم پیشہ جماعتوں کے خصائص پر مفصل نظر ڈالنے کے لئے ایک خاص جماعت کے کارناموں کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں، جس سے جرائم پیشہ جماعتوں کے اوصاف کی تشریح اچھی طرح ہو جائے گی، ماہ ستمبر کے فتنہ کا واقعہ فرانس کی تاریخ میں ایک افسوسناک یادگار ہے، اور گو واقعۂ ماہ ستمبر کی جماعت اور واقعۂ سینٹ بارتھولومیو کی جماعت کے اوصاف میں نمایاں متشابہت پائی جاتی ہے، مگر میں یہاں واقعۂ ماہ ستمبر[1] کے تفصیلی حالات موسیو ٹائن سے لیکر نقل کرتا ہوں، جو واقعۂ انقلاب فرانس کا بہترین مورخ ہے ہم کو اس سے غرض نہیں کہ واقعۂ ماہ ستمبر کے فساد کا بانی کون تھا، ڈانٹن یا کوئی اور[2] بہرحال اس واقعہ میں ہماری بحث کا تعلق جس بات سے ہے وہ یہ ہے کہ باغیوں کی جماعت

[1] یہ مشہور حادثہ زمانۂ انقلاب فرانس میں بماہ ستمبر ۱۷۹۲ء پیرس میں وقوع پذیر ہوا، اس واقعہ کا باعث ایک شخص مارٹ نامی تھا، یہ شخص پہلے طبیب تھا، پھر ایک اخبار کا اڈیٹر ہو گیا، اس کا یہ خیال تھا کہ ۲۰۰ آدمیوں کو وطن کے فدیہ میں پھانسی دیدینا چاہیئے، (مؤلف)، [2] صحیح یہ ہے کہ اس فساد کا بانی ایک شخص مرّاٹ نامی تھا،

میں ایک ایسی تحریک پیدا کر دی گئی جس سے اس جماعت کے تمام افراد متاثر ہو گئے اور جماعت وحشیانہ افعال کا ارتکاب کرنے لگی،

باغیوں کی یہ جماعت تین سو جلادوں سے مرکب تھی، جو سب کے سب مختلف ذاتوں اور مختلف فرقوں سے تعلق رکھتے تھے، ان میں دوکان دار، پیشہ ور دست کار، معمار، سرکاری ملازمین اور دلال، سبھی طرح کے لوگ تھے، اور سب ایک ہی ہیجان کے زیر اثر تھے، اور سب کا اعتقاد یہ تھا کہ وہ ایک وطنی خدمت انجام دے رہے ہیں، ان لوگوں نے جو پہلا کام کیا وہ یہ تھا، کہ ایک خاص عدالت کا محکمہ ایجاد کیا، اس محکمہ نے تفتیش کر کر کے ملزمین کی ایک فہرست تیار کی، اور یہ قرار پایا کہ سب سے پہلے امرا، پادریوں، ملازمین پولیس اور سرکاری ملازموں کو قتل کرنا چاہیئے، غرض کہ جتنے لوگ اس محکمہ کے نزدیک مجرم قرار پائے وہ بلا رو و رعایت تلوار کے گھاٹ اتارے گئے، اور شہر میں ایک فتنہ محشر خیز برپا ہو گیا، عام باشندوں کے قتل کرنے کے لئے کسی خاص حکم کی ضرورت نہ تھی، بلکہ قتل خود ایک روزمرہ کا کھیل تھا، لیکن خاص خاص لوگوں کے قتل کے لئے علیٰ حسب مراتب احکام صادر کئے جاتے تھے، اس فتنہ میں جس قساوتِ قلبی اور وحشت کا اظہار کیا گیا ہے، وہ بیان سے باہر ہے، لیکن باوجود اس کے یہ عجیب بات تھی کہ اس قساوتِ قلبی کے مقابلہ میں لطف و مہربانی کے نمونے بھی کہیں کہیں نظر پڑتے تھے،

چنانچہ یہ ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ اتفاق سے اس جماعت میں ایک شخص کو معلوم ہوا کہ قیدیوں کو چھ گھنٹے سے متواتر پانی نہیں ملا ہے، یہ سن کر وہ فوراً غصہ میں آ گیا اور مہتمم جیل پر جھپٹ پڑا، لیکن جب قیدیوں نے خود ہی اس کی سفارش کی تو اس نے چھوڑ دیا، اسی طرح جب عدالت سے کوئی مجرم بری کیا جاتا تو یہ لوگ بہت خوش ہوتے اور وفور مسرت

سے تالیاں بجاتے اور جب زیادہ وجد میں آجاتے، تو ناچنے گانے لگتے تھے۔ عورتوں کے لئے بھی ایک جگہ مخصوص کر دی گئی تھی، جہاں سے وہ قتل و غارت کے مہیب منظر کا تماشہ دیکھتی تھیں، لیکن جب لوگوں نے یہ شکایت کی کہ عورتوں اور دیگر تماشہ بینوں کو تماشہ اچھی طرح نظر نہیں آتا، تو اس وقت سے یہ حکم ہو گیا کہ ملزمین کو دو دو صفیں گھیرے رہا کریں، اور آہستہ آہستہ چلا کریں تاکہ تماشہ بینوں کی نظر کے سامنے یہ تماشہ دیر تک ہا کیے بعض لوگ ملزمین کو برہنہ کرکے میدان قتل میں لاتے، اور اس کے بعد ان کے پیٹ پھاڑے یہ عجیب دردناک منظر ہوتا تھا، لیکن ان دردناک منظروں میں کہیں کہیں دیانت و امانت کی مثالیں بھی نظر پڑ جاتی تھیں، یہ لوگ مقتولین کے مال و زر کو بالکل ہاتھ نہیں لگاتے تھے بلکہ تمام مال و زر اور جواہر لا کر ججوں کے سامنے پیش کر دیتے تھے،

اس کے علاوہ جو دلائل و براہین وہ قائم کرتے تھے وہ نہایت سادہ لوحی پر مبنی ہوتے تھے، چنانچہ جب یہ لوگ ایک ہزار دو سو یا ایکہزار پانچ سو آدمیوں کو زباختلاف روایت) قتل کر چکے، تو ان کو خیال ہوا کہ دوسرے قیدخانوں میں بھی یہ کثرت آدمی سڑ گل رہے ہیں، ان کو بھی قتل کر دینا چاہیئے، اور قیدخانوں میں اتفاق سے جو لوگ تھے، وہ نہایت بیکس اور غریب تھے، اور زیادہ حصہ ان میں عورتوں اور نابالغوں کا تھا، ان لوگوں نے خیال کیا کہ یہ قیدی، گرچہ مجرم نہیں ہیں، اور نہایت غریب اور بالکل بے گناہ ہیں لیکن ممکن ہے کہ آگے چل کر یہ لوگ قوم و وطن کے دشمن نکلیں، اسلئے انکو مٹا دینا ہی اچھا ہے، ان قیدیوں میں ایک عورت تھی جس کا شوہر زہر دے کر مار ڈالا گیا تھا، اس کے متعلق بعضوں نے یہ رائے قائم کی کہ یہ عورت اپنے قید ہونے پر غصہ میں تو ضرور ہو گی، اگر کہیں اتفاق سے یہ چھوڑ دی گئی تو یہ غصہ کے مارے پیرس میں آگ لگا دے گی، اسلئے اسکو ضرور قتل کر دینا چاہیئے

اس رائے کو سب نے بسر و چشم قبول کیا، اور بیچاری عورت اور اس کے ساتھ پچاس نو عمر لڑکے سترہ سترہ، اٹھارہ اٹھارہ برس کی عمر کے تہ تیغ کروا لے گئے، اس پر ان جلادوں کا یہ قول تھا کہ اچھا ہوا کہ قتل کر دیئے گئے، ورنہ یہ اگر زندہ رہ جاتے تو سب بڑھ کر یہی قوم و وطن کے دشمن نکلتے، اچھا ہوا جو ان سے نجات مل گئی،

غرض یہ مشق جفا کامل ایک ہفتہ تک جاری رہی، اور اس کے بعد جب یہ لوگ قتل کرتے کرتے تنگ آ گئے، تو اس وقت ان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ چونکہ انھوں نے وطن کی ایک بیش بہا خدمت انجام دی ہے، اس لئے انھیں تمغہ اور انعام ملنا چاہئے، یہ تفصیل ہے اس عبرتناک واقعہ کی،

اس واقعہ کے علاوہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے دوران میں بھی بہت سے واقعات اسی طرح کے پیش آئے اور آیندہ بھی ذرا جماعت کے اثر و غلبہ کو ترقی ہونے دو تو دیکھنا کیا کیا وقوع پذیر ہوتا ہے،

فصل سوم

فوجداری عدالتوں کی جیوریاں

فوجداری عدالتوں کی جیوریاں، جیوری کے خصائص، عمومی اعداد وشمار سے پتہ چلتا ہے کہ جیوریوں کے فیصلوں پر ان کی نوعیتِ تشکیل سے کوئی اثر نہیں پڑتا جیوری کے ممبر کس طرح دفعتہً اثر پذیر ہو جاتے ہیں، عقلی دلیل کا جیوریوں کی رائے پر کوئی اثر نہیں پڑتا، مشہور بیرسٹر کن کن طریقوں سے جیوری کی رائے پر اثر ڈالتے ہیں، وہ کون سے جرائم ہیں، جن کے ارتکاب کرنے والے جیوری کے جذبہ تلطف کو اپنی جانب جذب کر لیتے ہیں، جرائم کی تحقیقات میں جیوری کے توسط کے فوائد اور یہ بحث کہ اگر جرائم کی تحقیقات میں جیوریوں کی رایوں سے فائدہ نہ اٹھایا جائے، تو عدل وانصاف میں رکاوٹ پیش آئے،

چونکہ ہم جیوریوں کے تمام اقسام پر اس کتاب میں مفصل بحث نہیں کر سکتے، اس لئے ذیل میں ہم صرف فوجداری عدالتوں کی جیوریوں سے بحث کریں گے، جو مختلف جماعتوں کا ایک نہایت کامل نمونہ ہوتی ہیں، دیگر جماعتوں کی طرح جیوریوں کی جماعتیں جماعت کے ان تمام اوصاف سے متصف ہوتی ہیں، جن کا ذکر صفحاتِ بالا میں گذر چکا ہے دیگر جماعتوں

کی طرح یہ جماعتیں بھی سریع الانفعال اور متلون المزاج ہوتی ہیں، دیگر جماعتوں کی طرح ان جماعتوں کے فیصلے بھی عقلی پہلو سے گرے ہوتے ہیں، اور دیگر جماعتوں کی طرح یہ جماعتیں بھی اپنے اپنے لیڈروں کی تابع فرمان ہوتی ہیں غرض ان جماعتوں میں بھی وہ تمام اوصاف پائے جاتے ہیں جو نفسِ اجتماعی کا خاصہ ہیں، اور جن کا تذکرہ صفحاتِ بالا میں گذر چکا ہے،

جیوریوں کی حالت کا اندازہ کرنے کی غرض سے ہماری نظر سب سے پہلے جیوریوں کی تجاویز اور فیصلوں پر پڑتی ہے، یہ جماعتیں عموماً جو فیصلے صادر کرتی ہیں ان کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ چونکہ جماعت پر روشن عقلوں کا کچھ اثر نہیں پڑتا، اس لئے جیوریوں کی تجاویز اور فیصلے بھی عقلی پہلو سے گرے ہوتے ہیں۔ اور اگر اہلِ فن اور اہلِ علم لوگ بھی اپنے اپنے علوم و فنون کے حدود سے تجاوز کرکے فوجداری عدالتوں کے مقدمات کے فیصلے تحریر کریں، تب بھی ان کے فیصلے اُن فیصلوں سے زیادہ وقیع نہ ہوں گے جو عام قابلیت کے لوگ صادر کرتے ہیں، ۱۸۴۸ء کے پیشتر جیوریوں کا انتخاب عموماً روشن خیال اور اہلِ علم طبقہ سے کیا جاتا تھا، لیکن اب اس زمانہ میں یہ بات موقوف ہوگئی ہے، اور اب ان کا انتخاب عموماً حرفت پیشہ گروہ سے کیا جاتا ہے، علماے اعداد نے شمار و اعداد سے بتایا ہے کہ جیوریوں کا انتخاب خواہ کسی گروہ سے کیا جاتا ہے، ان کے فیصلے ہمیشہ یکساں ہوتے ہیں، بلکہ اس واقعہ کا اعتراف علمار کے علاوہ خود ججوں نے بھی کئی بار کیا ہے، موسیو ڈویری گلاگو سابق جج عدالتِ فوجداری نے اپنی کتاب میں لکھا ہے:۔

اس زمانہ میں جیوریوں کے انتخاب کا حق میونسپلٹیوں کو تفویض کر دیا گیا ہے،

جو اپنے سیاسی اغراض کی بنا پر جیوریوں کا انتخاب کرتی ہیں، اور عموماً اس زمانہ

میں تجارت پیشہ طبقہ اور کم حیثیت لوگوں میں سے جیوریوں کا انتخاب کیا جاتا ہے

لیکن باوجود اس کے ان جیوریوں کی تجاویز اور فیصلے بھی اسی رتبہ کے ہوتے ہیں

جس رتبہ کے ان کے پیش رو اہل علم جیوریوں کے ہوتے تھے :

عبارت بالا سے جو نتیجہ اخذ ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ جیوریوں کی تجاویز اور فیصلے عموماً صحیح اور انصاف پر مبنی ہوتے ہیں، البتہ عقلی پہلو سے ان میں ضعف ضرور ہوتا ہے لیکن اگر فیصلے عقلی پہلو سے ضعیف ہوتے ہوں تب بھی تعجب کی کون سی بات ہے، اس لئے کہ تمام بیرسٹر اور جج عموماً جماعتوں کے نفسانی حالات سے ناواقف ہوتے ہیں، موسیو لاشاڈ جو عدالت فوجداری کا ایک کامیاب بیرسٹر تھا، ہمیشہ ججوں اور جیوریوں کی رائے سے مخالفت کیا کرتا تھا، لیکن اب تجربہ سے یہ بات معلوم ہو گئی ہے کہ وہ خیال ججوں کی رائے سے اختلاف کرنا بالکل بے کار ہوتا ہے، چنانچہ اب پیرس کے بیرسٹروں نے عموماً یہ عادت ترک کر دی ہے لیکن باوجود اس کے جیسا کہ موسیو گلاگو نے تحریر کیا ہے، ججوں اور جیوریوں کے فیصلوں میں اب بھی کسی قسم کا تغیر نہیں نظر آتا، اور اس زمانہ میں بھی جیوریوں کے فیصلے نہ سابق فیصلوں سے زیادہ منصفانہ ہوتے ہیں اور نہ نامنصفانہ،

جیوریوں کی جماعت بھی دیگر جماعتوں سے اس بات میں مشابہ ہوتی ہے کہ اس پر جذبات کا غلبہ زیادہ ہوتا ہے، اور دیگر جماعتوں کی طرح ممبران جیوری بھی عقلی استدلال سے اثر پذیر نہیں ہوتے، ایک بیرسٹر کا مقولہ ہے کہ اگر کوئی عورت ان کے سامنے لائی جائے جو غریب ہو، اور ایک بچہ کو دودھ پلاتی ہو، یا اگر چھوٹے چھوٹے یتیم بچے ان کے سامنے پیش کئے جائیں، تو وہ جوش رقت سے بیتاب ہو جاتے ہیں، اور جادہ انصاف سے ہٹ جاتے ہیں، موسیو گلاگو لکھتے ہیں :-

"چیوری کی توجہ کو اپنی جانب جذب کرنے کے لئے صرف اتنا ہی کافی ہوتا ہے
کہ عورت ذرا ظریف طبع ہو"

عموماً جن جرائم سے خود خوف کھاتے ہیں، اور ہیئت اجتماعی کے لئے مضر ہوتے ہیں
ان کے ارتکاب پر توجیج آپے سے باہر ہو جاتے ہیں لیکن ایسے جرائم جن کا ارتکاب
محض جذبہ محبت کی بنا پر کیا گیا ہو اور جو ہیئت اجتماعی پر مضر اثر نہ ڈالتے ہوں، ان کے
ارتکاب سے ججوں کو کچھ خیال بھی نہیں ہوتا، پس اگر ان کے سامنے ایسی عورتیں پیش کیجاتی ہیں
جن کو بدمعاش لوگ گھروں سے بھگا لے گئے ہوں، تو اس پر ان کو سخت غصہ آتا ہے۔
کیونکہ ان کے خیال میں یہ ہوتا ہے کہ جس ملک میں قانون اس قسم کے جرائم کا انسداد
نہ کرے، وہاں گھر بار بالکل محفوظ نہیں رہ سکتا، اس لئے اس قسم کے جرائم پر وہ غصہ
سے بیتاب ہو جاتے ہیں،

دیگر جماعتوں کی طرح ججوں اور جیوریوں کی جماعتیں بھی نفوذ سے بہت جلد اثر پذیر
ہوتی ہیں، موسیو گلاگو نے کیا خوب کہا ہے کہ جج اور جیوری اپنے خیالات میں خواہ کتنے ہی
جمہوریت کے حامی ہوں لیکن عملاً وہ بالکل آزاد نہیں ہوتے، حسب نسب، دولت و ثروت،
شہرت اور کسی مشہور بیرسٹر کی پیروکاری، یہ سب ذرائع ہیں جن سے جج کی رائے پر بہت بڑا اثر پڑتا ہے
ججوں اور جیوریوں کی رائے پر جس تدبیر سے اثر ڈالنا چاہئے، اس کی کیفیت ایک کامیاب
انگریز بیرسٹر نے خوب بیان کی ہے، جسے میں یہاں نقل کرتا ہوں، وہ لکھتا ہے:۔

"سب سے پہلے بیرسٹر کے لئے لازمی ہے کہ وہ برابر جج کی رائے پر اثر ڈالنے کی کوشش
کرتا ہے، تقریر تھوڑی ہو اور استدلال سے گریز کرے، تقریر کرتے وقت جج کے حرکات
و سکنات کی نگرانی اور مناسب موقع، وقت کی تلاش بھی ضروری ہے۔ سب سے زیادہ

اس بات کی نگرانی کرتے رہنا لازمی ہے کہ میرے الفاظ اور جملوں سے جج کے چہرے پر کیا آثار طاری ہوتے ہیں۔ اپنے سامنے کی صف میں جو جج بیٹھے ہوں، پہلے ان کے چہروں کو بغور دیکھنا چاہئے، پھر ان کے بعد والے ججوں کے چہروں کو، آخر میں اس جج کی جانب توجہ کرنا چاہئے جو بیرسٹر کی رائے کے خلاف ہے، اور حتی الامکان یہ کوشش کرنا چاہئے کہ کسی طرح یہ جج اپنی رائے پلٹ دے، اور یہ سب سے زیادہ مشکل ہے"

سطور بالا میں بیرسٹر مذکور نے گویا فنِ خطابت کی تلخیص کر دی ہے، اور بتا دیا ہے کہ خطیب اپنے خطبہ کے پہلے ہی حصہ میں جو کامیاب نہیں ہوتا، تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ نفوس سامعین میں اس کے خطبہ سے جو اثر پیدا ہوتا ہے، اس کے مطابق اسے اپنے خطبہ میں تغیر کرنا پڑتا ہے اس لئے خطیب کو اس وقت تک کامیابی نہیں ہوتی تاوقتیکہ خطبہ کے سلسلہ میں وہ سامعین کے جذبات و خیالات کا پورا اندازہ نہ کرلے اور یہ بات خطبہ کے ابتدائی حصہ سے حاصل نہیں ہوتی

پھر یہ کچھ ضروری نہیں ہے کہ بیرسٹر تمام ججوں کی رایوں کو اپنے موافق بنا لینے کی کوشش کرے، بلکہ صرف یہ کافی ہے کہ جو جج سب کا رئیس ہے، اسی کی رائے پر اثر ڈالا جائے، اور جہاں اس نے اپنی رائے پلٹی، بس فوراً اسی کی رائے کی جانب اغلبیت ہو جاتی ہے مذکورالصدر انگریز بیرسٹر لکھتا ہے:۔

"مجھے تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ جب فیصلہ کے تحریر کرنے کا وقت آتا ہے تو صرف دو یا ایک ججوں کی رائے دوسروں کو بھی اپنا ہمخیال بنالیتی ہے"

پس یہ ضروری ہے کہ ان دو یا تین ججوں کو ہوشیاری سے اپنا موافق بنالیا جائے تو فیصلہ بھی اپنے موافق ہو جاتا ہے، اس غرض کے حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے، کہ بیرسٹر پہلے ہی سے کوشش کرکے ججوں کو حیرت و استعجاب میں ڈال دے، کیونکہ جماعت جب کسی شخص کو حیرت و استعجاب

کی نظر سے دیکھنے لگتی ہی، تو اس کے ادلہ و براہین کو خوب کان دھر کر سنتی ہی، میں نے موسیو لاشاڈ کے حالات میں حسب ذیل واقعہ پڑھا ہے، جس کو میں یہاں نقل کرتا ہوں،

مشہور ہے کہ مشہور بیرسٹر لاشاڈ اکثر بحث کرنے میں اس بات کی بے حد کوشش کرتا تھا، کہ دو ایک جج جن کو وہ صاحب نفوذ پاتا، اس کے ہمخیال بن جائیں، اور اس تدبیر سے موسیو لاشاڈ اکثر کامیاب ہو جایا کرتا تھا، ایک مرتبہ اتفاق ایسا ہوا کہ کسی مقدمہ میں موسیو لاشاڈ قریب قریب ایک گھنٹہ تک بحث کر کے تھک چکا تھا اور مختلف تدبیروں سے اس بات کی کوشش کر رہا تھا، کہ کسی طرح ایک خاص جج جس کی رائے موسیو لاشاڈ کے خلاف تھی، اسکا ہمخیال ہو جائے، جب سب تدبیروں پر وہ عمل کر چکا، اور کسی طرح کامیابی نہ ہوئی، تو ایک دفعہ تقریر کرتے کرتے یکایک خاموش ہو گیا، اور چیف جج سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ "فلاں جج صاحب کی آنکھوں پر دھوپ پڑ رہی ہے، مہربانی فرما کر چک ڈلوا دیجئے" یہ کہنا تھا کہ اس جج کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور فوراً اپنی رائے پلٹ کر وہ بھی لاشاڈ کا ہمخیال بن گیا،

جیوریوں کے طبقہ سے ججوں کو انصاف کرنے میں جو سہولت ہوتی ہے، اُس کو نظر انداز کر کے اس زمانہ میں اہل صحافت و انشا کے طبقہ سے ایک فرقہ اُٹھ کھڑا ہوا ہی، جو جیوریوں کے نظام پر سختی سے نکتہ چینی کر رہا ہے، حالانکہ اس کو یہ معلوم نہیں کہ ججوں کی جماعت سے جو غلطیاں سرزد ہوتی ہیں، ان کی نگرانی جیوریوں ہی کی جماعت کرتی ہے، بخلاف اس کے بعضوں کی یہ رائے ہے کہ جیوری کے طبقہ کو بحال تو رکھنا چاہیئے، مگر صرف روشنخیال طبقہ تک اس کے دائرہ کو محدود کر دینا چاہیئے، لیکن ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ تجویز اور فیصلہ کا جہاں تک تعلق ہے، روشنخیال اور غیر روشنخیال دونوں طبقے اس بارے میں یکساں ہیں،

لیکن ایک فرقہ اور ہے، جس کی رائے یہ ہے کہ چونکہ جیوریوں سے غلطیاں واقع

ہوتی ہیں، اس لئے ان کو قاضی اور جج بنا دینا چاہیئے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لوگ جن غلطیوں کا انتساب جیوریوں کے جانب کرتے ہیں، انھیں یہ نہیں معلوم کہ اسی قسم کی غلطیاں ججوں سے بھی سرزد ہوتی ہیں، مجرم جب اُنکے سامنے لایا جاتا ہے تو وہ اوّل دہلہ میں اسکی بابت مجرم ہونے کی رائے قائم کر لیتے ہیں، پس اگر جیوریوں کو نظر انداز کرکے آخری فیصلہ کا حق صرف ججوں کو تفویض کر دیا جائے تو بیچارہ مجرم اپنی بریت کی کوشش کس طرح کریگا، یہ صحیح ہے کہ جیوریوں سے غلطیاں ہوتی ہیں لیکن جیوری سے پہلے خود جج غلطی کا ارتکاب کرتے ہیں، پس اصل الزام خود ججوں پر ہے، حال ہی میں یہ واقعہ گذرا ہے کہ ایک ڈاکٹر پر ایک نوجوان سادہ لوح عورت نے یہ الزام قائم کیا تھا، کہ اُس نے تیس فرنک کے عوض میں اسکا حمل ساقط کر دیا، اس بیان کو سُن کر ججوں نے فوراً اس کے لئے سزا تجویز کر دی، اگر رائے عام اس فیصلہ کے خلاف نہ ہوتی تو وہ بیچارہ ماخوذ ہو کر جیل میں جا چکا تھا، اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ باوجودیکہ لوگ عام طور پر مجرم کو بری سمجھتے تھے لیکن ججوں کو خواہ مخواہ اس کے مجرم ہونے پر اصرار تھا،

حاصل یہ ہے کہ جب کوئی مقدمہ پیچیدہ ہوتا ہے تو چونکہ جیوریوں کو اسکے اصلی حالات کا علم کم ہوتا ہے، اس لئے وہ مجبور ہو کر ججوں کی رائے سے اتفاق کر لیتے ہیں، کیونکہ وہ دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ خود ان مسائل سے خوب واقف ہیں، یہ کیا غلطی کریں گے، بس اب بتاؤ کہ اصلی خطاوار کون ہوتا ہے، ممبرانِ جیوری یا خود جج صاحبان، حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ہم نفیس چیزوں کی قدر کرتے ہیں، اسی طرح ہم کو جیوریوں کی جماعت کی بھی قدر کرنا چاہیئے کیونکہ صرف یہی ایک طبقہ ہے جو قانون کی سختی اور شدت کا مقابلہ کر سکتا ہے، قانون کے دفعات تو بالکل مطلق اور عام ہوتے ہیں، ان میں شواذ و نوادر کا کچھ لحاظ نہیں ہوتا، اور جج صرف قانونی صراحت کی پابندی کرتے ہیں، ان کو اس بات کا خیال نہیں ہوتا، کہ ایک

شخص جو بھولی بھالی لڑکی کو بھگا کر لے گیا، اور پھر اس نے اس کو چھوڑ دیا، ان دونوں میں سے لڑکی مجرم نہیں ہے، بلکہ بھگانے والا مجرم ہے، بخلاف ممبرانِ جیوری کے کہ وہ اس بات کو خوب سمجھتے ہیں کہ اس لڑکی سے زیادہ وہ شخص مجرم ہے جو اس کو بھگا کر لے گیا،

یہ تفصیل ہے جیوریوں کی جماعت کے نفسیات کی، اور مجھے تو فی الواقع جیوریوں کی جماعت غلطی کا ارتکاب کرتے ہوئے نظر نہیں آتی، بلکہ میرے نزدیک تو جج زیادہ غلطیاں کرتے ہیں، ججوں کی حالت اس جماعت کی سی ہوتی ہے، جو لینت اور شفقت کے مفہوم سے ناآشنا ہوتی ہے، اور جیوری کی حالت اس جماعت کی ایسی ہے جو مجسمۂ شفقت اور ہمہ تن رحم ہوتی ہے،

فصل چہارم

ووٹ دینے والی جماعتیں

ووٹ دینے والی جماعتوں کے خصائصِ عمومی، یہ بحث کہ امیدوارِ انتخاب کو کن اوصاف کا جامع ہونا چاہیے، امیدوارِ انتخاب کے لئے نفوذ کی ضرورت، یہ بحث کہ اجرت پیشہ اور صنعت پیشہ گروہ اپنے میں سے نائب شاذ و نادر کیوں منتخب کرتے ہیں، منتخب کرنے والی جماعتوں پر الفاظ اور جملوں کا کتنا اثر پڑتا ہے، منتخب کرنے والی جماعتوں کی رائے کیونکر قائم ہوتی ہے، سیاسی کمیٹیوں کا اثر، سیاسی کمیٹیاں مجسمۂ استبداد ہوتی ہیں، واقعۂ انقلابِ فرانس کی کمیٹیاں، اس بات کا سبب کہ اگر حقِ انتخاب کو ایک خاص طبقہ تک محدود کر دیا جائے، تب بھی وہ نتیجہ کیوں حاصل ہوگا، جو حقِ انتخاب کو عام کر دینے کے وقت ہوتا ہے، مختلف اقوام میں ووٹ دینے کے حق کا کیا مطلب ہے،

وہ جماعتیں جو کسی خاص غرض کے لئے نائب منتخب کرتی ہیں، جماعاتِ مختلفۃ العناصر

کا مکمل نمونہ ہوتی ہیں، یعنی جن افراد سے ان جماعتوں کی تشکیل ہوتی ہے، وہ مختلف نسل اور مختلف پیشہ کے لوگ ہوتے ہیں، ان میں تجارت پیشہ بھی ہوتے ہیں، اہلِ فضل وکمال بھی ہوتے ہیں، طبقۂ متوسط اور طبقۂ ادنیٰ کے افراد بھی شریک ہوتے ہیں، غرض یہ جماعتیں مختلف النسل اور مختلف الخیال لوگوں کا معجونِ مرکب ہوتی ہیں، لیکن چونکہ ان جماعتوں کا وظیفۂ عمل مخصوص دائرۂ انتخاب میں محدود ہوتا ہے، اس لئے ان جماعتوں میں اُن تمام اوصاف کا پایا جانا ضروری نہیں، جو دیگر جماعتوں میں پائے جاتے ہیں بلکہ اُن میں صرف حسبِ ذیل مخصوص اوصاف پائے جاتے ہیں،

۱۔ ضعفِ عقلی،

۲۔ فقدانِ ملکۂ انتقاد،

۳۔ سرعتِ غضب،

۴۔ زود اعتقادی،

۵۔ سادہ لوحی واثر پذیری،

اس کے علاوہ ان جماعتوں کے تجاویز میں اُن تمام عوامل کے اثرات بھی صاف نمایاں ہوتے ہیں جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، یعنی قوّاد کا اثر اور ادعا و تحکم و تکرار وغیرہ کے اثرات،

ان جماعتوں کے عمومی اوصاف کی تشریح کرنے کے بعد اب ہم اس امر سے بحث شروع کرتے ہیں کہ بحث و استدلال میں ان جماعتوں کا طریقِ کار کیا ہوتا ہے، اور یہ جماعتیں کس قسم کے دلائل سے اثر پذیر ہوتی ہیں،

سب سے پہلے یہ ذہن نشین رکھنا چاہئے، کہ جو شخص امیدوار انتخاب ہے اس کی ذات

یں نفوس کا پایا جانا ضروری اور کامیابی کے لئے شرط اولین ہے، لیکن اگر یہ شخص نفوذ وہبی سے محروم ہے تو اس کا قائم مقام وہ نفوذ ہو سکتا ہے، جو ثروت و دولت سے حاصل ہوا ہو، علمی اور دماغی قابلیتوں سے جو نفوذ پیدا ہوتا ہے وہ اکثر بیکار ہوتا ہے، نفوذ ایک قوت ہے کہ جو شخص اس قوت سے بہرہ در ہوتا ہے، وہ بلا پس و پیش لوگوں کو اپنے موافق ووٹ دینے پر مجبور کر ہی لیتا ہے، لیکن چونکہ تجارت پیشہ اور مزدوری پیشہ گروہ میں کسی شخص کو نفوذ حاصل نہیں ہوتا، اس لئے یہ گروہ اپنے میں سے قائم مقاموں کو کم منتخب کرتے ہیں، اور اگر کبھی منتخب بھی کرتے ہیں، تو محض اس لئے کہ اپنے فریقِ مخالف صاحبِ رتبہ امیدوار کا انتخاب کو نقصان پہنچایا جائے،

لیکن ایک حد تک صرف نفوذ ہی کامیابی کا آلہ نہیں ہوتا، بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ امیدوارِ انتخاب لوگوں کو اس بات کی امید دلائے کہ اگر وہ منتخب ہو گیا تو لوگوں کی خواہشیں پوری کرے گا، مگر اس میں اتنا تجاوز نہ کرے کہ اس کی امیدیں خلافِ عقل اور محال نظر آنے لگیں، اب اس کے مقابل میں فریقِ مخالف پر بھی یہ لازم ہے کہ وہ بذریعہ ادعا و تحکم و تکرار یہ ثابت کرنے کی کوشش کرے کہ میرا مخالف اور مقابل نہایت بدنفس ہے، اس نے جتنی امیدیں دلائی ہیں، وہ کبھی پوری نہ کرے گا، پس اگر پہلا امیدوار جماعت کے نفسانی حالات سے ناواقف ہوا، تو وہ فوراً ادعا و تحکم کی بجائے دلائل و براہین سے ان الزامات کی تردید اور اپنی ذات کی بریت کرے گا، یہاں تک کہ آخر کار وہ ناکامیاب ہو جائے گا،

اس کے علاوہ امیدوارِ انتخاب کیلئے یہ بھی لازمی ہے کہ وہ اپنے انتخاب کے بعد جو اعمال انجام دینا چاہتا ہے، اپنی اسپیچ میں ایک طول طویل فہرست ان

اعمال واصلاحات کی ضرورت پیش کردے، اگر اس نے اسپیچ دیتے وقت کوئی فہرست پیش کردی ہے، تو مجمع متاثر ہو جائیگا، اور اس کے بعد منتخب کرنے والے لوگ خود فراموش کرجائیں گے، کہ ان کے منتخب کردہ قائم مقام نے کن کن باتوں کا وعدہ کیا تھا، اور آیا اس نے وہ وعدے پورے بھی کئے یا نہیں،

غرض تقریر بالا سے یہ معلوم ہوگیا کہ امیدوارانِ انتخاب اپنی اپنی جماعتوں کو کس طرح اثر پذیر کرتے ہیں، اور منتخب کرنے والی جماعتوں پر بعض خاص الفاظ اور جملوں کا کتنا اثر پڑتا ہے، جو الفاظ جماعتوں پر اثر کرتے ہیں، ان کے نمونہ کے لئے چند الفاظ حسبِ ذیل ہیں، "راس المال،" "یہ لوگ دغاباز ہیں" "مال تمام افراد میں تقسیم کردیا جائے" یہ اور اسی قسم کے دیگر جملے اور الفاظ مجمع پر زیادہ اثر کرتے ہیں، اور جو امیدوارِ انتخاب قلوب کو اپنے جانب جذب کرنے اور مجمع پر اثر ڈالنے کی تدبیروں سے واقف ہوتا ہے، وہ یقیناً اس قسم کے جملوں کو استعمال کرکے کامیابی حاصل کرلیتا ہے، اسپین میں ۱۸۷۳ء میں جو شورش برپا ہوئی تھی، اس کے باعث اسی قسم کے چند مبہم الفاظ تھے، ہم یہاں اس واقعہ کی پوری کیفیت اس زمانہ کے ایک مصنف کی زبانی بیان کرتے ہیں، وہ مصنف لکھتا ہے:

"انتہا پسند جماعت کو خیال گذرا کہ جمہوریت ایک قسم کی شخصی سلطنت کا نام ہے اور جمہوریت کی آڑ میں چند خود غرض حکومت کریں گے، اس لئے اُنھوں نے جمہوریت کی مخالفت شروع کی، لیکن قوم پرست اعتدال پسند پارٹی نے انتہا پسندوں کو اس بات پر راضی کرلیا، کہ جمہوریت اس طرز کی قائم کی جائے گی، جیسی امریکہ میں ہے یہ خیال ذہنوں میں کچھ ایسا راسخ ہوگیا، کہ اب ہر شخص یہی کہنے لگا، کہ بیشک اسی طرح کا طرزِ حکومت اسپین کی سرسبزی اور ترقی کے لئے ضروری ہے لیکن باوجود

اس کے ہر شخص ان الفاظ کے معنی جدا جدا سمجھتا تھا، بعض لوگ تو اس کا یہ مطلب سمجھتے تھے کہ اب تمام صوبے آزاد کر کے مستقل حکومت بنا دیئے جائیں گے، بعض یہ سمجھتے تھے کہ اسپین میں ولایاتِ متحدہ امریکہ کا نظامِ حکومت قائم کیا جائے گا، ادھر اشتراکیوں نے بارسلونا اور اندلس میں ہر ہر گاؤں اور ہر ہر دیہات کی آزادی کا اعلان کر دیا، اور یہ صدا بلند کی، کہ اسپین کے ہر صوبہ سے دس ہزار کی تعداد میں نائب اور قائم مقام منتخب کئے جائیں جو ملک پر حکومت کریں، نیز یہ کہ فوج اور پولیس برطرف کر دی جائے تھوڑے عرصہ میں اشتراکیوں کے اس فتنہ سے اسپین کے ہر ہر صوبہ میں بغاوت کی آگ بھڑک اُٹھی، اور ہر ہر شہر میں ایک مستقل حکومت قائم ہو گئی، تار کے جال کاٹ ڈالے گئے، ریل کی پٹریاں اُکھاڑ ڈالی گئیں، اور دارالحکومت میڈرڈ سے بڑے بڑے شہروں کا سلسلۂ رسل و رسائل منقطع ہو گیا، اور ہر طرف توحش اور بربریت کے آثار نمایاں ہونے لگے۔"

منتخب کرنے والی جماعتوں پر عقلی استدلال کا اثر جو کم پڑتا ہے، اس سے انکار کرنا گویا جماعت کے نفسانی حالات سے ناواقفیت کا اظہار کرنا ہے، ان مجامع میں بدگوئی، سب و شتم، طعن و تشنیع اور تحکمانہ خطابت کے علاوہ اور کیا ہوتا ہے تقریریں جو کی جاتی ہیں، اُن میں دلائل و براہین کا نام تک نہیں ہوتا، ہاں کبھی یہ دیکھا جاتا ہے، کہ ان مجامع میں مقرر نے دلائل و براہین پیش کئے، اور مجمع پر سکون کی کیفیت طاری رہی، لیکن یہ بھی اس وقت ہوتا ہے جب مجمع کے اندر سے کوئی شخص اُٹھ کر مقرر سے سوال کر بیٹھتا ہے، تو اس سے سامعین متلذذ ہوتے ہیں اور تھوڑی دیر کیلئے

مجمع پر سکون طاری ہو جاتا ہے، مگر یہ لذت بھی دیر پا نہیں ہوتی، بلکہ سائل کی آواز مجمع کے غیر معمولی شور وغل کے اندر بالکل گم ہو جاتی ہے، میں اپنے دعویٰ کی شہادت میں ایک اخبار سے لے کر اسی قسم کا واقعہ درج کرتا ہوں :-

"ایک مرتبہ کسی قائم مقام کو منتخب کرنے کی غرض سے ایک مجمع مجتمع ہوا، انارکسٹ طبقہ نے اس بات کی کوشش کی کہ وہ پہلے سے پہنچ کر مقامِ اجتماع کو اپنے افراد سے پر کر دے، تاکہ اس کے مفاد کے خلاف انتخاب عمل میں نہ آئے اور اشتراکیوں نے بھی اسی تدبیر پر عمل کرنا چاہا، یہاں تک کہ اسی مخالفت اور رد و قدح میں دونوں فریقوں میں ٹڈ بھیڑ ہو گئی، پھر کیا تھا، سب و شتم، طعن و تشنیع کی خوب گرم بازاری ہوئی، اسی اثنا میں کمیٹی کا انعقاد ہوا، اور ایک شخص کا انتخاب بھی قرار پا گیا، اشتراکیوں نے جب دیکھا کہ ان کے مفاد کے خلاف انتخاب ہو گیا ہے تو انھوں نے اس منتخب شدہ قائم مقام کے خلاف کارروائی شروع کی، اور اس کی ذات پر حملے کرنے لگے، لیکن اشتراکیوں کے الزامات کا جواب اسپیکر نے ایک بسیط تقریر میں یہ دیا کہ اشتراکیوں کی جماعت نہایت نادان اور احمق ہے"

اسی قسم کا ایک دوسرا واقعہ مزید وضاحت کی غرض سے اور درج کیا جاتا ہے،

"ماہ مئی کی پہلی تاریخ فرانس کی جرمن پارٹی نے ایک جلسہ کے انعقاد کا اعلان کیا جس کے متعلق یہ پہلے ہی سے طے کر دیا گیا تھا، کہ نہایت سکون اور خاموشی کے ساتھ منعقد ہوگا، جب جلسہ منعقد ہوا تو ایک وطن پرست اسپیکر نے اپنی اسپیچ میں اشتراکیوں پر اس قسم کے سخت حملے کرنا شروع کئے، کہ اشتراکی فرقہ کے لوگ پکے بدمعاش ہیں، یہ ہونا تھا کہ اسپیکروں میں باہم

خوب طعن وتشنیع ہوئی، حتیٰ کہ سب وشتم سے جوتی پیزار تک نوبت پہنچ گئی، اور اسی سلسلہ میں کرسیاں اور میزیں بھی اُچھلنے لگیں۔"

لیکن امثلۂ بالا سے یہ نتیجہ نہ اخذ کرنا چاہیئے، کہ یہ طرز خطابت کسی ایک فریق کے ساتھ مخصوص ہے، اور روشن خیال لوگوں کے مجمع سے اس قسم کے غیر مہذب اور ناشایستہ حرکات صادر نہیں ہوتے، بلکہ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں، جماعت میں داخل ہو کر افراد کے قوائے عقلی ماند پڑ جاتے ہیں پس اس بنا پر اگر روشن خیال اور اہل علم لوگوں کا مجمع ہو تو اس سے بھی اسی قسم کے افعال صادر ہونگے، اس کی شہادت میں ہم اخبار ٹیمپس سے ایک ایسے جلسہ کا حال اقتباس کر کے درج کرتے ہیں جس میں صرف طالبعلموں کا مجمع تھا،

"جب رات زیادہ آگئی تو لوگوں میں سخت اضطراب پیدا ہونے لگا، اور حالت یہ ہو گئی، کہ ادھر خطیب کی زبان سے الفاظ نہیں نکلے اور اُدھر اس پر طعن وتشنیع شروع ہو گئی، کسی طرف تالیاں پٹنے لگیں ایک طرف سے سیٹیوں کی آوازیں نغمہ کی کیفیت پیدا کرنے لگیں، سامعین میں غل وشور برپا ہو گیا، اور ایک طرف سے بیٹھ جاؤ بیٹھ جاؤ کی صدائیں بلند ہوئیں، اسی اثنا میں ایک دوسرا خطیب کھڑا ہوا اور اُس نے مجمع کو بہت ملامت کی کہ یہ بہت بیجا اور غیر مہذب حرکات ہیں جو اس مجمع کے شایانِ شان نہیں۔"

اب اس جگہ ایک یہ خیال پیدا ہوتا ہے، کہ اس اژدہام اور ہجوم اور شور وشغب کی حالت میں انسان کے حواس کس طرح برقرار رہ سکتے ہیں، اور وہ کسی مسئلہ پر رائے کس طرح قائم کر سکتا ہے؟ لیکن اگر یہ پیشِ نظر کر لیا جائے کہ اس قسم کے مجامع میں ہر شخص کو آزادی حاصل ہوتی ہے، نیز یہ کہ مجمع کی رائے جو قائم ہوتی ہے تو کسی عقلی استدلال

کی بنا پر نہیں بلکہ تسلط اور غلبہ کی بنا پر قائم ہوتی ہے، اور یہ غلبہ مختلف قوتوں اور مختلف پارٹیوں کا ہوتا ہے، جن پر چند مخصوص ذی نفوذ اصحاب قابض ہوتے ہیں، تو اس وقت اس خیال کی کوئی اصلیت نہ رہے گی، اور صاف کھل جائے گا کہ اس مجمع میں ہر شخص کی رائے تابع ہوتی ہے اپنی پارٹی کے رئیس کی رائے کے، اور ہر شخص کو ہر مسئلہ میں رائے زنی کرنے کے لئے غور نہیں کرنا پڑتا، موسیو شیرر جو زمانۂ حال میں جمہوریت پرست گروہ کا رئیس ہے، کیا خوب کہتا ہے کہ

"تم جانتے ہو کہ انتخاب کرنے والے مجمع کی کیا حقیقت ہے؟ یہ جماعتیں ہماری آئین وقوانین کی کنجیاں اور سیاسی ہتھیار ہیں، اس وقت اگر فرانس میں کوئی حکومت ہے تو انہی پارٹیوں اور جماعتوں کی ہے"

یہی بات ہے کہ ان پارٹیوں پر تسلط اور غلبہ حاصل کرنا سخت مشکل ہوتا ہے خصوصاً اگر امیدوار انتخاب صاحبِ ثروت ہو تو اس وقت اس کا مقابلہ کرنا سخت دشوار ہو جاتا ہے، صرف تین ملین فرانک کے مالک ہونے کی بدولت جنرل بولنگر کا انتخاب کئی مرتبہ ہوا، یہ تفصیل ہے منتخب کرنے والی کمیٹیوں کے نفسانی حالات کی، تم نے دیکھ لیا کہ اس قسم کی جماعتوں کے نفسانی کیفیات دیگر جماعتوں کے نفسانی کوائف سے جدا نہیں ہوتے،

لیکن باوجود اس کے میں یہ نہیں کہتا کہ عام انتخاب کا طریقہ جو آج کل رائج ہے، بالکل بیکار اور مضر ہے، اگر انتخاب کے حقوق مجھے تفویض کر دیئے جائیں تو میں خود انتخاب عام کے حق کو وسعت دوں گا، لیکن باوجود تمام مضرتوں کے میں انتخابِ عام کے طریقہ کی تائید چند عملی وجوہ کی بنا پر کر رہا ہوں جو حسب ذیل ہیں:-

بلاشبہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انتخاب عام ہونے سے جو مضرتیں پیدا ہوتی ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں، یہ کتنی بڑی مضرت ہے کہ چونکہ جماعتوں کی زمام قیادت قوم کے چند افراد کے ہاتھوں میں ہوتی ہے، جو عقلی حیثیت سے برتر ہوتے ہیں، اسلئے گو حقِ انتخاب عام کیا جائے، لیکن قومی تہذیب ان ہی ذی نفوذ اور صاحب اثر لوگوں کے ہاتھوں میں ایک کھلونے کی طرح رہتی ہے، یہ لوگ جب چاہیں اُسے بگاڑیں اور جب چاہیں سنواریں اور قوم کے ادنیٰ طبقات کو گو حقِ انتخاب حاصل ہو، وہ کچھ نہیں کر سکتے، اور اپنے حق کو عملاً استعمال نہیں کر سکتے، قوم میں ان کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں ہوتی، بجز اس کے کہ ان کی وجہ سے مجمع زیادہ ہو جاتا ہے، پھر دوسری مضرت یہ ہے کہ جماعت جو رائے قائم کرتی ہے، وہ اکثر اوقات پُرخطر ہوتی ہے، ہمارے ملک میں وقتاً فوقتاً جتنے فتنے برپا ہوئے ہیں، ان کا باعث جماعت ہی کا اثر و غلبہ تھا،

بلاشبہ حقِ انتخاب کو عام کر دینے کی بنا پر یہ مضرتیں پیدا ہوتی ہیں، لیکن اگر عملی حیثیت سے اس مسئلہ پر نظر ڈالی جائے تو ان الزامات کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی، جب کوئی خیال دماغوں میں بس جاتا ہے، تو اس کی مخالفت و مقاومت میں سخت دشواریاں پیش آتی ہیں، دیکھو! قرونِ متوسطہ میں مذہبی عقائد کو کس قدر غلبہ حاصل تھا، کہ کوئی اُن کی مخالفت میں آواز نہیں بلند کر سکتا تھا، تسلطِ جماعت اور حقِ انتخابِ عام کا عقیدہ بھی اس قسم کا عقیدہ ہے کہ جس نے ان اگلے عقائد کی طرح اس زمانہ میں ذہنوں پر تسلط حاصل کر لیا ہے، قرونِ متوسطہ میں کسی آزاد خیال سے آزاد خیال کے ذہن میں بھی کیا یہ گذر سکتا تھا کہ وہ اپنے زمانہ کے غیر معقول مگر مستحکم عقائد کی مخالفت میں آواز بلند کرے؟ کیا اس زمانہ کا کوئی شخص وجودِ شیطان اور حرمتِ یومِ سبت کے

انکار کی آسانی سے جرأت کرسکتا تھا؟ اگر کوئی شخص ایسا ہوتا تو یقیناً وہ مذہبی عدالت کے سامنے پیش کیا جاتا، جہاں الحاد و کفر کے الزام میں ماخوذ کرکے وہ زندہ جلا دیا جاتا۔ بعینہ اسی طرح کا غلبہ ہمارے زمانہ میں حقِ انتخابِ عام اور تسلّطِ جماعت کے عقیدہ کو بھی حاصل ہوگیا ہے، اسپیکر اپنے خطبوں میں، اہلِ صحافت اخبارات کے کالموں میں اس عقیدہ کا تذکرہ اس جلالت و احترام کے ساتھ کرسکتے ہیں، جو کسی بادشاہ کو بھی کسی وقت نصیب ہوا ہوگا، پس اس عقیدہ کو اپنے حال پر چھوڑ دو، زمانہ خود دیکھ لے گا کہ اس عقیدہ کی مخالفت میں کارروائی کرنا گویا اپنی ہلاکت کا موجب ہونا ہے:

موسیو ٹاکویل نے کیا خوب لکھا ہے:

"عہدِ مساوات میں کسی شخص کو کسی کے ساتھ اعتقاد باقی نہیں رہتا، کیونکہ سب کی حالت یکساں ہوجاتی ہے، لیکن اس مساوات کی بنا پر یہ عام اعتقاد پیدا ہوجاتا ہے کہ جمہور کی رائے کے آگے سرِ تسلیم خم کردینا چاہئے، اور لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات راسخ ہوجاتی ہے، کہ ایک جمِ غفیر کی رائے کسی طرح غلط نہیں ہوسکتی"

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اگر حقِ انتخاب کے دائرہ کو صرف اہل الرائے لوگوں تک محدود کردیا جائے تو اس وقت وہ مضرتیں نہ پیدا ہوں گی، جو اس حق کو عام کردینے سے پیدا ہوتی ہیں، لیکن میں اس خیال کو ایک لمحہ کے لئے بھی تسلیم نہیں کرسکتا میں اس کتاب میں متعدد مقامات پر بیان کرچکا ہوں کہ جماعت کی تشکیل خواہ کسی قسم کے افراد سے ہوئی ہو، اس کی عقلی اور دماغی حالت حد درجہ انحطاط پذیر ہوتی ہے، پس اس کلیہ کے مطابق اگر فرض کیا جائے کہ ایک کمیٹی میں چالیس ممبر شریک ہیں جن میں سے

کوئی بیرسٹر ہے، کوئی پروفیسر ہے" تو میرے خیال میں اس کمیٹی کی تجاویز اور فیصلے کسی طرح اس دوسری مجلس کے فیصلوں سے بہتر نہ ہوں گے، جس کے ممبر معمولی درجہ کے لوگ ہیں، میرے ذہن میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی کہ مثلاً جمہوریت کے فوائد کے متعلق اس زمانہ میں جو اجماعِ عام ہو گیا ہے، اس میں تغیر ہو جائے گا، اگر رائے دینے والے لوگ اہلِ علم طبقہ سے ہوں گے، کیونکہ اجتماعی احوال و کیفیات کے متعلق لوگ جو رائے قائم کرتے ہیں تو اس وجہ سے نہیں کہ ان رائے دینے والے لوگوں میں فلاں شخص یونانی زبان سے واقف ہے، اور فلاں پروفیسر ہے، یا فلاں ڈاکٹر ہے، ان پیشوں اور ذاتی حالات کو ظاہر ہے کہ رائے دینے میں کوئی دخل نہیں ہوتا، یہی دیکھو کہ ہمارے ملک کے علمائے اقتصاد میں کتنے مدرس اور کتنے علمی سوسائیٹیوں کے ممبر ہیں، لیکن باوجود اس کے کبھی تم نے یہ بھی دیکھا کہ ان سب کا اتفاق کبھی کسی ایک مسئلہ پر بھی ہوا،

اس وجہ سے میرا خیال تو یہ ہے کہ اگر حقِ انتخاب کو اہلِ علم اور تعلیم یافتہ طبقہ تک محدود کر دیا جائے تب بھی نتیجہ وہی ہو گا جو حقِ انتخاب کو عام کرنے کی حالت میں ہوتا ہے کیونکہ ان اہلِ علم حضرات کو بھی اپنے مخصوص جذبات و منافع کی بنا پر رائے قائم کرنا پڑتی ہے، یا اس وقت بھی خطرہ مٹا نہیں، بلکہ خطرہ کا اور اضافہ ہو گیا، یعنی اب گویا زمامِ قیادت جماعت کے بجائے اہلِ علم لوگوں کے ہاتھ میں دیدی گئی،

پس حقِ انتخابِ جماعت کا نتیجہ ہر صورت میں یکساں ہے، اور وہ یہ ہے کہ جماعت ہمیشہ اپنے مخصوص فرقوں کے منافع ملحوظ رکھتی ہے، خواہ حقِ انتخاب کو عام کر دیا جائے یا کسی خاص طبقہ تک اُس کو محدود کر دیا جائے، اس بارے میں جمہوری ممالک فرانس، بلجیم، یونان، پرتگال، اسپین، سب کی حالت یکساں ہے، وہ بھی جہاں جمہوری حکومتیں

قائم ہیں اور ان کی بھی جہاں شخصی حکومتوں کا دور ہے اسی مقام سے اس نظریہ کی اہمیت بھی جس کو میں اس کتاب میں بار بار دہرا چکا ہوں معلوم ہو جاتی ہے، وہ یہ کہ آئین و اصول اور قومی نظام حکومت اور نظام تعلیم و تربیت کو قوموں کی حیات و ممات میں کوئی مداخلت نہیں ہوتی، بلکہ قوموں کے افعال و حرکات و سکنات اپنی اپنی قومی ضرورتوں اور نسلی مقتضیات یا بالفاظ دیگر قومی روایات ہی کے تابع ہوتے ہیں، پس قوموں کی نسلی حالت یا موروثی روایات پر ان کی روزانہ ضرورتوں کا مدار ہوتا ہے، اور یہی ضرورتیں اور قومی روایات وہ مخفی طاقتیں ہیں، جو ہمارے انجام اور عاقبت کی مالک ہوتی ہیں،

فصلِ پنجم

نیابی مجالس (یعنی پارلیمنٹیں)

نیابی مجالس کے بہت سے خصائص وہ ہیں جو دیگر مختلف العناصر جماعتوں میں بھی پائے جاتے ہیں، نیابی مجالس کی سادہ لوحی، اثر پذیری اور اُس کے حدود، مجالسِ نیابی کی وہ کون سی رائیں ہوتی ہیں، جن میں تغیر نہیں ہوتا، اور وہ کون سی رائیں ہیں جنھیں تغیر ہوتا ہے، نیابی مجالس کی رایوں میں اضطراب کیوں پایا جاتا ہے، نیابی مجالس میں مختلف پارٹیوں کے لیڈروں کی حالت اُن کے نفوذ کے اسباب، ان مجالس میں تمام ممبر اپنے اپنے لیڈروں کی رائے کی پیروی کرتے ہیں، لیڈروں کے عناصر خطابت، الفاظ اور جملوں کا اثر، یہ لازمی ہے کہ لیڈر تنگ نظر ہوں، اور اپنی رائے کو استدلال کے ساتھ پیش کریں، جس خطیب کا نفوذ نہیں ہوتا، اس کی رائیں نیابی مجالس میں مشکل سے قبول کی جاتی ہیں، نیابی جماعتیں اپنے جذبات و مشاعر میں مبالغہ پسند ہوتی ہیں، کن اوقات میں نیابی مجالس

میں مذکورہ بالا اوصاف نہیں پائے جاتے، فنی مسائل میں ماہرینِ فن کی رائے کا اثر، نظامِ نیابی کے منافع و مضرات، گو یہ نظام موجودہ ضروریات کا متکفل ہے، لیکن اس نظام سے دو مضرتیں پیدا ہوتی ہیں، اسرافِ مال، تحدید حریت، کتاب کا خلاصہ،،

مجلسِ نیابی اُس جماعت سے عبارت ہے جو مختلف الجنس، مختلف الخیال اور مختلف العقیدہ افراد پر مشتمل ہو، گو مختلف ممالک میں ان مجلسوں کی تشکیل کے طریقے جدا جدا ہیں، تاہم تمام ممالک میں ان مجالس کے نفسانی خصائص یکساں ہوتے ہیں، اور ان قومی خصائص کا اثر نمایاں رہتا ہے، لیکن چونکہ ان مختلف ممالک کی نیابی جماعتوں کے فیصلے اور تجاویز بھی قریب قریب یکساں ہوتی ہیں، اس لئے ان حکومتوں کو ایک ہی قسم اور ایک ہی طرح کی صعوبات اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے،

موجودہ زمانہ میں تمام قوموں کا آخری مطمحِ نظر جس کے حاصل کرنے کا تمام قوموں کو اشتیاق ہے، نظامِ نیابی ہے، لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات خوب راسخ ہوگئی ہے کہ جس کام کو چند لوگ مل کر انجام دیتے ہیں، وہ نہایت استقلال اور عمدگی کے ساتھ انجام پاتا ہے، نیابی مجالس میں بھی گو وہ تمام اوصاف پائے جاتے ہیں، جو معمولی جماعت کے خصائص میں سے ہیں، مثلاً سادہ لوحی، اثر پذیری، مبالغہ پسندی، قواد کا نفوذ وغیرہ، مگر اتنا فرق ہے کہ نیابی مجالس میں بعض اوصاف ایسے بھی پائے جاتے ہیں، جو دیگر جماعتوں میں نہیں ہوتے،

مجالسِ نیابی کے اہم اوصاف میں سب سے پہلا وصف سادہ لوحی اور ضعفِ عقلی ہے، جو ان مجالس کی تمام پارٹیوں میں یکساں پایا جاتا ہے، اور خصوصاً لاطینی قوموں میں

تو یہ وصف اتنا ترقی پذیر ہے کہ یہ قوّیں تمام پیچیدہ اجتماعی مسائل کو چند سادہ اصولوں سے حل کرتی ہیں، یہ ظاہر ہے کہ یہ سادہ اصول مختلف پارٹیوں کے اختلافِ رائے کی بنا پر مختلف ہوتے ہیں، لیکن انسان جماعت میں شامل ہو کر ان اصول کا اندازہ ان کی اصلی قدر و قیمت سے زیادہ کرتا ہے اور اپنی خیالی دنیا میں وہ نتائج کی آخری حد تک پہنچ جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ نیابی مجالس کی تجویزیں اور رائیں اکثر یک طرفہ ہوا کرتی ہیں،

ہم نیابی مجلس کے وصفِ سادہ لوحی اور ضعفِ عقلی کی مثال میں واقعۂ انقلابِ فرانس کی اُس مذہبی جماعت کو پیش کر سکتے ہیں، جو محض اس وجہ سے کہ اس کا دماغ عقلی دلائل و براہین سے پُر تھا، اپنے چند خیالی اصول کو خارجی معاملات اور حالات پر منطبق کیا کرتی تھی، ان لوگوں کی حالت یہ تھی کہ ان کے خیالی اصول ان کے رہبر تھے، اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ ان خیالی اصول کی بنا پر ہم ایک جدید اجتماعی حالت پیدا کر کے قوم کو معراجِ ترقی پر پہنچا دیں گے، وہ اپنے ان خوابوں کو پورا کرنے کے لئے چند معمولی وسائل اختیار کرتے تھے، اور جب ان کو کوئی مصیبت درپیش ہوتی تو وہ اس مصیبت کو دفع کرنے کی کوشش کرتے تھے،

نیابی مجالس کا دوسرا اہم وصف یہ ہے کہ وہ بہت جلد دوسروں کی رائے سے اثر پذیر ہوتی ہیں، اور گو نیابی مجالس اس وصف میں دیگر جماعتوں کے مشابہ ہوتی ہیں یعنی یہ کہ جس طرح دیگر جماعتیں اپنے اپنے لیڈروں کے زیر فرمان ہوتی ہیں، اسی طرح نیابی مجالس کی بھی ہر پارٹی اپنے اپنے لیڈروں کے زیر اثر ہوتی ہے لیکن اس باب میں نیابی مجالس کی قابلیت ایک خاص حد تک محدود ہے، جسے ذیل میں بیان کرتا ہوں،

مجالسِ نیابی کے ہر ہر ممبر کی رائے اپنے مسائلِ متعلقہ میں اسقدر مستحکم ہوتی ہے کہ

اس کا اپنی جگہ سے ہلانا دشوار ہوتا ہے، اور کوئی دلیل وحجت اس کو نہیں توڑ سکتی، اگر ڈیماستھنیز
بھی اپنی قبر سے اٹھکر چلا آئے تو وہ بھی اپنے زورِ خطابت پر کسی ممبر کی رائے کو نہیں بدل
سکتا، بات یہ ہوتی ہے کہ جن لوگوں نے اس ممبر کو منتخب کرکے پارلیمنٹ میں بھیجا ہے
ان کا اثر اس پر اس قدر قوی ہوتا ہے کہ یہ ممبر دوسروں کی رائے سے متاثر ہونے
کی قوت کھو بیٹھتا ہے، یہی اثر ہے جس سے متاثر ہوکر انگریزی پارلیمنٹ کے ایک
ممبر نے ایک بار کہا تھا کہ گو میں پچاس سال تک ویسٹ منسٹر میں بحیثیت ممبر پارلیمنٹ
بیٹھا ہوں اور اس عرصہ میں ہزاروں خطبے سنے ہیں جن میں سے بعض خطبوں کو
سُن کر میرے بعض خیالات میں تغیر بھی ہوا، لیکن کوئی خطبہ ایسا نہ تھا جو ووٹ دیتے
وقت میرے قرار داد ووٹ میں تغیر کرسکا ہو"

البتہ جب کسی عام مسئلہ پر بحث شروع ہوتی ہے، مثلاً انقلابِ وزارت یا کسی
جدید ٹیکس کا اضافہ وغیرہ تو اس وقت لوگوں کے خیالات میں بے شک اضطراب پیدا
ہو جاتا ہے، اور مختلف پارٹیوں کے لیڈروں کا نفوذ کام کرنے لگتا ہے، لیکن باوجود
اس کے اس نفوذ کا اثر اتنا قوی نہیں ہوتا جتنا عادۃً دیگر جماعتوں میں ہوتا ہے اور اسکی وجہ
یہ ہوتی ہے کہ نیابی مجالس میں مختلف پارٹیاں ہوتی ہیں اور ہر پارٹی کے قائد کا اثر دوسری
پارٹی کے قائد کے اثر کے مساوی ہوتا ہے، اس لئے دو برابر کی قوتیں اپنی اپنی جانب
ممبروں کی توجہ کو جذب کرنا چاہتی ہیں اور ممبروں کی رایوں میں اضطراب پیدا ہو جاتا
ہے، اسی بنا پر یہ دیکھا گیا ہے کہ ایک ممبر نے نصف گھنٹہ بیشتر جو رائے دی تھی اب
اس کے خلاف میں وہ رائے دے رہا ہے، گویا جس اصول کی بنا پر اُس نے پہلے
رائے قائم تھی، اس کو اب اس نے منسوخ کر دیا،

پس بیاناتِ ماسبق سے معلوم ہوا کہ نیابی مجالس میں ممبروں کی دو قسم کی رائیں ہوتی ہیں، ایک وہ جن میں تغیر نہیں ہوتا، دوسری وہ جن میں تغیر ہوتا رہتا ہے، اور چونکہ اکثر ان مجالس کے روبرو مسائلِ عامہ پیش کئے جاتے ہیں، اس لئے ممبرانِ مجلس کی رایوں میں اضطراب بھی پایا جاتا ہے، کیونکہ ہر ممبر دو قسم کے اثرات سے اثر پذیر ہوتا ہے، ایک اثر تو اس پر ان لوگوں کا ہوتا ہے جنھوں نے اس کو منتخب کیا ہے اور دوسرا اثر اس کے اپنے فریق کے رئیس و قائد کا،

لیکن اکثر مسائل میں جن کے متعلق ممبروں کی پہلے سے کوئی رائے قائم نہیں ہوتی غلبہ لیڈروں ہی کو حاصل ہوتا ہے، اور ان لیڈروں کی موجودگی ایسے نازک اوقات میں بیحد ضروری ہوتی ہے، کیونکہ ان کی حالت افسرانِ فوج کی سی ہے کہ اگر یہ نہ ہوں تو جماعت کی تشکیل ہی نہیں ہوسکتی، یہی وجہ ہے کہ نیابی مجالس کے فیصلے اور تجاویز صرف معدودے چند اشخاص کی رایوں اور دوٹوں پر مبنی ہوتے ہیں،

لیکن ان مجلسوں میں مختلف پارٹیوں کے لیڈروں کا جو اثر ہوتا ہے وہ ان کی فصاحت و بلاغت کی بنا پر نہیں ہوتا، بلکہ زیادہ تر حصہ اس اثر کا مبنی ہوتا ہے نفوذ پر، یہاں تک کہ جب ان کا نفوذ زائل ہو جاتا ہے تو ان کا اثر بھی مٹ جاتا ہے، اور یہ نفوذ بھی محض شخصی نفوذ ہوتا ہے جس میں شہرت یا ثروت کو کوئی دخل نہیں ہوتا، موسیو جولیس سیمان ۱۸۴۸ء کی پارلیمنٹ کی حالت جس کے وہ ممبر تھے حسب ذیل بیان کرتے ہیں:۔

"لوئس نپولین کا اثر اس کی حکومت کے دو ماہ پیشتر کچھ نہ تھا، وکٹر ہیوگو جو نہایت مشہور خطیب تھا خطبہ دینے کے لئے اسٹیج (منصہ) پر آیا، لیکن اس کو کامیابی

بالکل نہیں ہوئی، بلکہ اس کا لکچر لوگوں نے اسی طرح سنا جس طرح وہ فیلکس
پایاٹ کا لکچر سنا کرتے تھے، البتہ وکٹر ہیوگو کے خطبہ پر اتنے چیرز نہیں دیئے گئے
جتنے فیلکس پایاٹ کے لکچر پر دیئے جاتے تھے، فولائل مجھ سے فیلکس پایاٹ کے
متعلق کہتا تھا کہ مجھے اس کے خیالات پسند نہیں، لیکن وہ بہترین انشاپرداز و
فرانس کا بہترین خطیب ہے، اسی طرح ایڈگر کوئینٹ باوجودیکہ بہت بڑا مفکر
تھا لیکن پارلیمنٹ کے اندر اس کی کچھ وقعت نہ تھی، وجہ یہ تھی کہ اس کا نفوذ
زائل ہوچکا تھا، نیابی مجالس کی حالت یہ ہوتی ہو کہ وہاں فصاحت وبلاغت کی
کوئی قدر نہیں ہوتی، اور نہ وطنی خدمات کا اعتراف کیا جاتا ہو، البتہ صرف ان
خدمات کا اعتراف کیا جاتا ہو جو احزاب سیاسیہ کے خاطر انجام دی جاتی ہیں اور
پارلیمنٹ میں جو قدر لامارٹین کی ۱۸۴۸ء میں اور موسیو ٹیرس کی ۱۸۷۱ء میں ہوئی تھی
تو محض چند مخصوص حالات ووجوہ کی بناء پر ہوئی، اسی لئے ان حالات کے بدلتے
ہی اس تمام قدر وعظمت کا پتہ بھی نہ لگا۔"

میں نے مندرجۂ بالا اقتباس اس غرض سے نہیں پیش کیا ہے کہ جو کچھ اس میں مذکور
ہے، اس کا مؤید ہوں، کیونکہ اس میں بہت سی باتیں ایسی مذکور ہیں جو علم النفس کے
نقطۂ نظر سے بالکل غلط ہیں، بلکہ میں نے یہ اقتباس اس لئے درج کیا ہو کہ ناظرین کو
اس سے اس بات کا اندازہ ہوجائیگا کہ پارلیمنٹ میں لیڈروں کی کامیابی کے لئے
نفوذ کی کس قدر حاجت ہوتی ہے، سب سے بڑی غلطی اس بیان میں وہاں پر ہے جہاں
پر مذکور ہے کہ مجالسِ نیابی وطنی خدمات کا اعتراف نہیں کرتیں، بلکہ فرقہ وار خدمتوں
کا اعتراف کرتی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ جماعت کی حالت یہ ہوتی ہے کہ باوجودیکہ

اس کو ان خدمات کا علم ہوتا ہے جو اس کے قائد نے انجام دی ہیں، لیکن اسے ان فوائد اور خدمات سے کچھ غرض نہیں ہوتی بلکہ محض اپنے قائد کے اثر و نفوذ کی بنا پر وہ اسکی فرماں برداری کرتی ہے،

یہی وجہ ہے کہ جب قائد کا نفوذ قوم میں بڑھ جاتا ہے تو قوم بالکل اسی کے زیر اثر اور تابع فرمان ہو جاتی ہے، ہم میں سے ہر شخص کو اس وزیر کے حالات کا علم ہوگا جس کا نفوذ کچھ سال پیشتر اس قدر بڑھ گیا تھا کہ اس کا ایک اشارہ انقلاب وزارت کے لئے کافی ہوتا تھا، لیکن محض اتفاقات کی بنا پر اس کا اثر بعد کو زائل ہوگیا،

ایک مشہور انشا پرداز نے اس کے اعمال پر سختی سے نکتہ چینی کی ہے جو حسب ذیل ہے :-

"فلاں وزیر اعظم پر ہمارے قرضہ کا بہت بار ہے، اسی کی بدولت ہم نے تین گنے زیادہ داموں پر ٹانگن کو خریدا، مڈیگاسکر میں اسی کی بدولت ہمارا اثر زائل ہوا، اور نہر نائگر کے جنوب میں ایک پورا ملک قبضہ سے نکل گیا، اور آخرکار اسی کی بدولت مصر میں ہمارے حقوق پامال کئے گئے، غرض فلاں وزیر موسیو فلاں نے ہم کو جتنے نقصانات پہنچائے ہیں وہ ان نقصانات سے زیادہ ہیں جو نپولین کی بدولت ہمیں اٹھانا پڑے[1]"

مگر حقیقت حال یہ ہے کہ ہم کو اس فرانسیسی وزیر اعظم کو طرز عمل پر نکتہ چینی نہیں کرنا چاہئے، اس لئے کہ اس وقت جو نفوذ اس کو حاصل تھا وہ رائے عام کی تقلید کرنے کی بدولت حاصل ہوا تھا، اور اس زمانہ میں فرانسیسی رائے کا عام میلان

---

[1] غالباً مصنف کا اشارہ موسیو کلیمانسو کے جانب ہے جو وزیر گر مشہور تھا،

استعماری مسائل کی جانب اتنا نہ تھا جتنا اب ہے، اس لئے خواہ مخواہ اس کو بھی رائے عام ہی کی پیروی کرنا پڑتی تھی، اس بنا پر یہ جو کچھ نقصانات فرانسیسی قوم کو برداشت کرنا پڑے ان کا باعث خود رائے عام تھی،

نفوسِ جماعت پر تسلط اور غلبہ حاصل کرنے کے ذرائع، نفوذ کے علاوہ اور بھی ہیں، جن کا تذکرہ ہم متعدد مقامات پر کر چکے ہیں، نفوس پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے سب سے زیادہ لازمی شرط یہ ہے کہ قائد کو اس جماعت کے نفسانی حالات سے بخوبی واقف ہونا چاہئے جس پر وہ غلبہ حاصل کرنا چاہتا ہے، نیز اس بات سے بھی واقف ہونا چاہئے کہ الفاظ کا اثر سامعین پر کیا پڑیگا، پھر ان تمام باتوں کے ساتھ قائد قادر اللسان اور فصیح و بلیغ بھی ہونا چاہئے، حکیمانہ طرزِ خطابت سے جماعت کو مسحور کرنا لازمی ہے، مگر اس شرط سے کہ ادعا و تحکم میں دلیل و حجت کا میل تک نہ ہو، اسی قسم کی فصیح و بلیغ خطابت ہے جس کے نمونے ہم کو نیابی مجالس کے خطبوں میں نظر آتے ہیں، حتیٰ کہ انگریزی پارلیمنٹ جس کا نظام دیگر نیابی مجالس سے زیادہ معتدل ہے اس میں تک بھی ہم کو اس قسم کی مثالیں ملتی ہیں،

ایک انگریز فلاسفر مائن کہتا ہے:-

"بہت آسانی کے ساتھ ہم کو نیابی مجالس کی تجویزوں میں ایسی مثالیں مل سکتی ہیں جو محض خیالی کلیات و اصول پر مبنی ہوتی ہیں، لیکن جن کا اثر لوگوں پر زیادہ ہوتا ہے، نیز ہم نہایت آسانی کے ساتھ جماعت کو چند خیالی باتوں کا یقین دلا سکتے ہیں جن کا حصول قریب قریب ناممکن ہے، بشرطیکہ ہم انکو موثرانہ انداز میں ظاہر کریں"

اقتباسِ بالا سے، اس بات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ موثرانہ طرزِ ادا اور کلماتِ جاذبہ

نفوسِ جماعت پر کتنا قوی اثر کرتے ہیں، ہم یہاں ایک خطبہ کا ایک جملہ نقل کرتے ہیں جس سے ہمارے بیان کی تائید ہو گی،

ایک خطیب کہتا ہے:

"جس دن ایک زبردست سیاسی اور ایک سفّاک انقلاب پرست دونوں کسی گرم ملک میں جلاوطن کئے جانے کی غرض سے جہاز پر بٹھلائے گئے، اس دن ان دونوں کی باہمی گفتگو سے پتہ چلا کہ ان دونوں کے اصول درحقیقت ایک ہی ہیں، اور یہ دونوں ایک ہی قسم کے نظامِ اجتماعی کے گویا دو رُخ اور دو نمونے ہیں"

اس جملہ میں سیاسی مجرموں کی سزا کی جو تصویر کھینچی گئی ہے اس کا مدعا یہ ہے کہ سامعین پر جو ان سیاسی مجرموں کے گروہ سے ہیں اس کا اثر پڑے اور وہ سزا کے خوف سے اپنے خیالات سے باز آئیں، روبسپیر جب اپنے سامعین کو خوف زدہ اور مرعوب کرنا چاہتا تو اپنے پھانسی دینے کے آلہ سے لوگوں کو دھمکایا کرتا،

قائدین کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ وہ اپنے خطبوں میں ایسے مبالغہ کا استعمال کریں جو عقل میں نہ آسکتا ہو، اوپر ایک خطبہ کا ایک جملہ جو ہم نے نقل کیا ہے اسمیں اس حد تک مبالغہ کیا گیا ہے کہ حاضرین میں سے کوئی بھی اس کی مخالفت کی جرأت نہ کر سکا اور کسی کو یہ کہنے کی ہمت نہ ہوئی کہ جن جرائم کا ارتکاب انقلاب پرست لوگ کرتے ہیں، ان کی جانب متمول لوگ ان کو ترغیب دیتے ہیں، پس جس سزا کے مستحق انقلاب پرست لوگ ہیں اسی سزا کے مستحق یہ لوگ بھی ہیں جو ان کو ترغیب دیتے ہیں

اسی طرح خطیب کے لئے یہ بھی جائز ہے کہ وہ یک طرفہ رائے قائم کرکے مخالف رائے پر سختی سے نکتہ چینی کرے، بلکہ اگر وہ اس ضمن میں اپنی مخالف رائے کی ہجو کرے تب بھی سامعین

متاثر ہو جائیں گے، اور بحث و مناظرہ کی اُن کو جرأت نہ ہو گی،

گو اس قسم کی فصاحت و بلاغت کے نمونے نیابی مجالس میں ہم کو ہر زمانہ میں نظر آتے ہیں لیکن خصوصیت کے ساتھ ان مجالس میں فصاحت و بلاغت کا استعمال مصیبت یا انقلاب کے زمانہ میں زیادہ کیا جاتا ہے، اگر خطیبانہ فصاحت و بلاغت کے نمونے دیکھنا ہوں تو خصوصیت سے ان خطبوں کا مطالعہ کرنا چاہیئے جو انقلاب انگیز مجموں کو مخاطب کرکے دیئے گئے ہیں، ان کے دیکھنے سے معلوم ہو گا کہ کس طرح خطیب ظالموں کو گالیاں دیتے ہیں، کس طرح وہ لوگوں سے قسمیں دے دے کر کہتا ہے کہ "زندہ رہو آزاد رہ کر ورنہ عزت کی موت مر جاؤ" اور حاضرین ہیں کہ دم بخود کھڑے ہوئے مجنونوں کی طرح تالیاں پیٹ رہے ہیں،

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قائد نہایت ذہین اور ذکی اور عقلمند ہوتا ہے، لیکن ذہانت ذکاوت قائد کے لئے سم قاتل ہوتی ہے اس لئے کہ ذہین شخص مناظرہ اور مباحثہ کا عادی ہوتا ہے، وہ خطبہ دیتے وقت عقلی دلائل پیش کرنے لگتا ہے، حالانکہ اس سے لوگوں کے عقیدہ میں فرق آجانے کا اندیشہ ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ عموماً تمام قوموں کے قائدین خصوصاً واقعۂ انقلاب فرانس کے قائدین کم فہم ہوئے ہیں، ان لوگوں کے خطبوں خصوصاً روبسپیر کے خطبوں کے مطالعہ سے قلب پر ایک دہشت سی طاری ہو جاتی ہے، اور اسکی انشاپردازی سے انسان مسحور ہو جاتا ہے، ایک شخص نے روبسپیر کے خطبوں کی تعریف حسب ذیل الفاظ میں کی ہے:-

"الفاظ ہیں کہ زبان سے نکلتے جارہے ہیں اور فصاحت کا ایک دریا ہے جو روانی کے ساتھ بہہ رہا ہے، لیکن الفاظ میں طفلانہ دھمکیوں اور تحکمانہ طرز ادا کے سوا کچھ

نہیں ہے، سارے خطبہ میں نہ کہیں کسی رائے کا پتہ ہے، اور نہ کسی معقول تجویز کا، لیکن باوجود اس کے خطبہ کے مطالعہ کے بعد بے اختیار اسی طرح زبان سے اُف نکل جاتا ہے جس طرح ایک ظریف الطبع شخص کا میں ڈی مولنس کی زبان سے نکلتا تھا!

حاصل یہ کہ گویہ ایک المناک بات ہے کہ ایک شخص جو نہایت کم فہم مگر صادق العقیدہ ہے، اس کو لوگوں پر نفوذ حاصل ہو جائے، لیکن ہمیشہ ہوتا یہی رہا ہے، کہ جماعتیں اسی طرح کے کج فہم لوگوں کے زیر فرمان رہی ہیں، جماعت کو اپنے لیڈروں کی کچھ ایسی شناخت ہوتی ہے، کہ وہ صاحبِ نفوذ شخص کو خود بخود تلاش کر لیتی ہے،

نیابی مجالس میں خطیب اپنا اثر جو قائم کر لیتے ہیں تو براہین و دلائل کے بل پر نہیں بلکہ صرف نفوذ کی قوت پر، اور جب ان کا نفوذ زائل ہو جاتا ہے، تو پھر ان کو کوئی نہیں پوچھتا، اور نہ ان میں یہ قدرت باقی رہتی ہے، کہ لوگوں کی رائے پلٹ دیں،

یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی مجہول الحال خطیب گھر سے خطبہ تیار کر کے ادلہ و براہین کے اسلحہ سے مسلح ہو کر پارلیمنٹ کے جلسہ میں شرکت کی غرض سے جاتا ہے، تو اس کے خطبہ کو کوئی کان دھر کر نہیں سنتا، موسیو ڈیکوب جو پارلیمنٹ کا ممبر اور علم النفس کا ایک بہترین ماہر ہے ایک مجہول الحال خطیب کے لکچر دینے کا واقعہ حسبِ ذیل بیان کرتا ہے،

"جب فلاں غیر معروف خطیب لکچر دینے کے لئے کھڑا ہوا، تو وہ اثنائے خطبہ میں برابر یاد کر کے دلائل و براہین پیش کرتا جاتا تھا، اور اپنے دل میں سمجھ رہا تھا کہ وہ یقیناً دلائل و براہین سے اپنے دعوے کو مدلل کر کے لوگوں کے ذہن نشین کر دے گا، کیونکہ اس نے بڑی محنت سے وہ خطبہ تیار کیا تھا، اور اپنے دعوی کے ثبوت میں ایسے ایسے دلائل تحریر کئے تھے، جو اس کے خیال

میں لاجواب تھے، لیکن اس کو سخت حیرت ہوئی جب اس نے دیکھا کہ لوگ اس کے خطبہ سے پریشان ہوکر شور مچانے لگے ہیں، وہ بیچارہ سخت حیران تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ ایک بارگی لوگوں کو یہ تشویش کیوں پیدا ہوگئی، اور لوگ کیوں اسکا خطبہ نہیں سنتے، یہ خیالات بار بار اس کے ذہن میں آتے اور وہ پیشانی پر سے گھڑی گھڑی پسینہ خشک کرتا، یہاں تک کہ مجبور ہوکر بیچارہ خاموش ہوگیا لیکن صدر جلسہ کے حکم پر دوبارہ اس کو اپنے خطبہ کا سلسلہ پھر جاری کرنا پڑا، اب دوبارہ اس نے بلند آواز سے خطبہ شروع کیا، لیکن اس مرتبہ پہلے سے زیادہ لوگوں میں اضطراب پیدا ہوا، یہ دیکھ کر اس نے مجبوراً اپنے خطبہ کو ادھورا چھوڑ دیا، اور بیٹھ گیا!"

نیابی مجالس کی یہ بھی ایک خصوصیت ہے کہ جب کوئی تحریک پیدا ہوتی ہے، یا جب کوئی عامل اپنا اثر ڈالتا ہے تو دیگر جماعتوں کی طرح ان مجالس کے اندر بھی سخت اضطراب اور ہیجان پیدا ہوجاتا ہے، اور دیگر جماعتوں کی طرح اس مجمع سے بھی تعصب اور اثر پذیری کے جذبات ظاہر ہونے لگتے ہیں، اس وقت مجلس کے ہر ممبر کی شخصیت میں تغیر عظیم ہوجاتا ہے، یہانتک کہ بعض اوقات ممبر ایک نیم شعوری کیفیت سے متاثر ہوکر اپنے ذاتی مصالح و منافع کے خلاف بھی اظہار رائے کر دیتے ہیں،

واقعۂ انقلاب فرانس کے زمانہ میں جو کمیٹیاں منعقد ہوتی تھیں، انکی روئدادیں اور حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مجالس نیابی میں جب کسی قسم کی تحریک پیدا ہوتی ہے، تو ان مجالس اور کمیٹیوں کے ممبر ایک نیم شعوری کیفیت سے متاثر ہوکر اپنے اور حصولِ مقاصد کے پیچھے کس طرح سرگرداں ہوجاتے ہیں، دیکھو اپنے شخصی امتیازات

مصائب کی قربانی کس قدر مشکل کام ہے لیکن اس واقعہ میں افراد نے ایک موقع پر جس طرح اپنے مصائب کی قربانی کی ہے، اس کی نظیر کسی دوسری تاریخ میں نہیں ملتی، باوجود دیکھ وہ یہ جانتے تھے کہ جس طرح آج دوسروں کو پھانسی دی جا رہی ہے، اپنے اپنے حقوق ومصائب کی قربانی کرنے کے بعد ہم بھی اسی طرح کل دار پر نظر آئیں گے لیکن وہ ایک عالم قوی سے اثر پذیر ہو کر اس طرح بے خود ہو گئے تھے کہ اپنے مقاصد کے مقابلہ میں انکو اپنی جان و مال تک کی پروا باقی نہ رہی تھی، اور جو خیال ان کے ذہنوں میں پختہ ہو چکا تھا اس کے خاطر وہ تن من دھن قربان کرنے پر تیار تھے، اس گروہ کا ایک شخص بلاڈو برنیس کہتا ہے کہ ہمکو اپنی تجاویز پر عمل کرنے کا خیال گو صرف دو دن پیشتر پیدا ہوا تھا لیکن کوشش وجانفشانی نے ہم سے سب کچھ کرا دیا،

ان تجاویز اور قرار دادوں کو پاس کرنے کے لیے اس زمانہ میں جو جلسے منعقد ہوئے اور ان میں جس قدر جوش وخروش کا اظہار کیا گیا، اسکی تفصیل انقلاب فرانس کے فلسفی مورخ موسیو ٹائن کی زبان سے سنو، موسیو ٹائن لکھتے ہیں :-

> ان لوگوں نے تمام تجاویز مکمل کر کے ان پر عمل شروع کر دیا اور حماقت بلکہ جنون کی حد سے بھی گذر گئے، دوست دشمن سب دار پر لٹکا دیئے گئے بلکہ تمام پارٹیوں نے متفق ہو کر چیرز کی آوازوں کی گونج کے ساتھ نہایت خوشی سے یہ طے کیا کہ ڈانٹن جو انقلاب فرانس کا لیڈر تھا، ضرور ضرور دار پر کھینچا جائے، ادھر تو سفاکی اور بے رحمی کی یہ مثالیں پیش کی جا رہی تھیں، اور ادھر کولوٹ دی ہربیس، کوتھن اور روبسپیر پر حد سے زیادہ نظر عنایت مبذول ہو رہی تھی، اب ان لوگوں نے نئے سرے سے پھر انقلابی حکومت کا ایک جدید

انتخاب کیا، اور ایک ایسی حکومت قائم ہوئی، جس کے ممبر سخت ظالم اور سفاک تھے، بحر و بر دونوں سے دشمنی تھی، اور کوئی فرد بشر ایسا نہ تھا جو ان کے حرکات سے نالاں نہ ہو، آخر مظلوموں کی فریاد سنی گئی، اور اس مہینہ کی ۲۲ تاریخ کو اس حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا، اور اس کے افراد ایک ایک کر کے قتل کردا نے گئے"

یونانی مجالس سے بھی اسی قسم کی حرکات اس وقت صادر ہونے لگتی ہیں، جب کسی بڑی مجمع کے اثر سے وہ متاثر ہو جاتی ہیں، موسیو اسپولر جو نظام یونانی کا بہت بڑا مؤید ہے ۱۸۴۳ء کی پارلیمنٹ کے متعلق حسب ذیل ریمارک کرتا ہے:-

"بغض و حسد، بیجا اعتماد اور بے انتہا خیالی امیدیں، یہ باتیں ہیں جو جمہور پسند گروہ کو فنا و موت کی جانب لے جا رہی ہیں، اس گروہ کی سادہ لوحی کی بھی کوئی حد ہے، کہ نہ اس کو قانون کی پروا ہے اور نہ انتظام و صلاح کا مفہوم اس کے ذہن میں آتا ہے، بیجا خیالی امیدیں قائم کرنے اور دلیری اور وحشت میں ان کی حالت دیہاتیوں اور بچوں کی حالت سے بالکل مشابہ ہوتی ہے کہ حالت سکون میں اضطراب شدید اور حالت اضطراب میں اطاعت و انقیاد کے متضاد جلوے نظر آتے ہیں، جو غیر تربیت یافتہ دماغ کی شان ہوتی ہے"

اس قسم کے دماغوں کا یہ خاصہ ہوتا ہے کہ وہ ہر بات سے حیرت زدہ ہوتے، سیدھے اور صحیح راستے سے گھبراتے اور اقدام و شجاعت کے ساتھ اگر آگ بھی ہو تو اس میں کود پڑتے ہیں، نسیان و ذہول کی استعداد ان میں زیادہ پائی جاتی ہے، اور وہ اپنے اعمال و افعال میں افراط و تفریط کی جانب زیادہ مائل ہوتے ہیں، غرض ان کی حالت پانی کی سی ہوتی ہے، جس میں ہر طرح کی صورتیں

اُترآتی ہیں، بتاؤ اس حکومت سے کس بات کی امید رکھی جائے جس کی تشکیل
اس قسم کے افراد سے ہوئی ہو؟"

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب مجلسِ نیابی کی حالت یہ ہے کہ ایک ذرا سی تحریک پر شرکائے مجلس آپے سے باہر ہو جاتے ہیں تو ایسی حالت میں اعضائے مجالس کے اوسان کہاں برقرار رہ سکتے ہیں، حالانکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان مجالس میں بعض اوقات مفید اصلاحی تجویزیں بھی پاس ہوتی ہیں، لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ مجالسِ نیابی سے ہر زمانہ میں اثر پذیری اور ضعفِ عقلی وغیرہ کا اظہار نہیں ہوتا، ان اوصاف کا اظہار ان مجلسوں سے صرف اسی وقت ہوتا ہے جب کوئی ہیجانِ شدید دفعۃً رونما ہوتا ہے، باقی ان مجالس کی غالب حالت تو یہ ہوتی ہے کہ ان مجلسوں کے ہر ہر فرد کی شخصیت علی الاستقلال باقی رہتی ہے، اور شعور تام کی حالت میں جو تجاویزدہ پاس کرتے ہیں، وہ نہایت درجہ مفید اور ضروری ہوتی ہیں، ہاں البتہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ اس قسم کی تجویزوں پر غور وفکر کرنے والا دماغ ایک ہی ہوتا ہے، قانون مجلس نہیں وضع کرتی ہے، بلکہ قانون ایک ہی دماغ کی کاوش اور جانفشانی کا نتیجہ ہوتا ہے لیکن جب قوانین مجلس کے اندر پیش کئے جاتے ہیں، اور شرکائے مجلس ان میں ترمیم وتنسیخ کرتے ہیں، تو اس وقت ان قوانین میں نقصانات پیدا ہوتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ ہر مجلس کا سکریٹری مضر تجویزوں کے اثر سے اپنی مجلس کی حفاظت کرتا ہے، اور گویا سکریٹری کی حالت جماعت کے قائد سے مشابہ ہوتی ہے، جو مجلس پر قائد کی حیثیت سے حکومت کرتا ہے،

بلاشبہ نظامِ نیابی ایک ایسا طرزِ حکومت ہے جس کی بدولت شخصی مظالم سے

لوگوں کو من حاصل ہوتا ہے، اور لوگ اپنے اوپر آپ حکومت کرنے کے عادی ہوتے ہیں، اور
خواہ عام آدمیوں کے ذہنوں میں یہ طرز حکومت کتنا ہی بے وقعت ہو لیکن کم از کم
فلاسفہ کے نزدیک تو ثابت ہو چکا ہے کہ نظام نیابی سے بڑھ کر طرزِ حکومت کی کوئی
ترقی یافتہ صورت نہیں ہو سکتی،

لیکن باوجود ان سب باتوں کے اگر نظام نیابی کو عملی حیثیت سے دیکھا جائے
تو اس طرز حکومت میں دو بڑی خرابیاں نظر آئیں گی،

۱۔ مال کا بیجا اسراف،
۲۔ حریت شخصی کی تحدید،

ان دو نقائص میں سے پہلا نقص اس طرز حکومت میں اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے
کہ منتخب شدہ جماعتِ نائبین ہر اُس تجویز کی تائید کرتی ہے، جو مجلس میں پیش کیجاتی
ہے، مثلاً اگر کوئی ممبر اس مضمون کا رزولیوشن پیش کرتا ہے کہ مزدوری پیشہ جماعت کی
شرح اجرت مقرر کر دی جائے، یا بعض عہدیداروں کی تنخواہوں میں اضافہ کر دیا جائے تو
دوسرے ممبر باوجودیکہ جانتے ہیں کہ اب میزانیہ (بجٹ) میں ان اخراجات کی گنجایش نہیں
مگر جان بوجھ کر ان تحریکات کی مخالفت نہیں کرتے، کیونکہ ان کو یہ خوف لگا رہتا ہے
کہ جن لوگوں نے ان کو ممبر منتخب کر کے پارلیمنٹ میں بھیجا ہے، وہ بدظن ہو کر یہ خیال
نہ کرنے لگیں کہ یہ لوگ ہمارے مصالح کا لحاظ نہیں کرتے، اب ممبروں کو دو مشکلوں
کا سامنا ہوتا ہے، اگر وہ اپنی قائم مقامی کا خیال کرتے ہیں، تو اخراجات کا اضافہ ہوتا ہے اور اگر
اخراجات اور بجٹ کا خیال کرتے ہیں تو قوم اُن سے بدظن ہو جاتی ہے، لیکن چونکہ کثرت
اخراجات کے نتائج عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں، اسلئے شرکاے مجلس

اس قسم کی تحریکات کی تائید میں اپنی رائے پیش کر دیتے ہیں،

پھر سب سے زیادہ مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب مقامی ضرورتوں کے لئے کثیر اخراجات کی تحریک کی جا رہی ہو، اور چونکہ مقامی ضرورتوں کا تعلق خود ان لوگوں سے ہوتا ہے جنھوں نے قائم مقام منتخب کر کے بھیجے ہیں، اس لئے ان ضرورتوں کی بنا پر قائم مقاموں کو کثیر اخراجات برداشت کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۱۵

۱۵ اخبار ایکانومسٹ نے ۲۷ اپریل ۱۸۹۵ء کی اشاعت میں ایک ... مضمون ان کثیر اخراجات کے اوپر لکھا ہے جو مقامی ضرورتوں خصوصاً ریل اور وسائل آمد و رفت کی سہولتوں اور ترقی کے لئے حکومتیں برداشت کرتی ہیں، اس مضمون کا خلاصہ حسب ذیل ہے: لنگوڈیس (جس کی آبادی تین ہزار نفوس ہے) اور پوئی کے درمیان ۵ ملین میں ریل تیار ہوئی ہے، اسی طرح پوموتی (جس کی آبادی ۲۰۰ نفوس ہے) اور کاسٹیل سارازان کے درمیان ۷ ملین میں، اور اوسٹ (جس کی آبادی ۵۲۳ نفوس ہے) اور سیکس (جس کی آبادی ۳۰۰ نفوس ہے) کے درمیان ۷ ملین میں، اور براڈ اور اولیٹ (جس کی آبادی ۴۳۰ نفوس ہے) کے درمیان ۶ ملین میں، اسی طرح ۱۸۹۵ء میں جن جدید ریلوں کی تیاری منظور ہوئی ہے اور جن کا بنانا بالکل بیکار ہے ان کے اخراجات ۹ ملین ہوں گے، اس کے علاوہ مزدوروں کی پنشن کی شرح اجرت کے متعلق جو قانون پاس ہوا ہے اس کی تنفیذ کے لئے وزیر مال کے اندازہ میں ۱۲۵ ملین اور اور ڈلیو میوچ سوسائٹی کے اندازہ میں ۸۰۰ ملین کی منظوری درکار ہوگی، یہ حالت ان کثیر اخراجات کی ہے جو عموماً بلاد یورپ میں بے فائدہ برداشت کئے جا رہے ہیں، اور جن کے باعث بعض ممالک مثلاً پرتگال، اسپین، ٹرکی وغیرہ تو بالکل مفلس ہو چکے ہیں اور بعض ممالک مثلاً اٹلی میں افلاس پھیلنا شروع ہو گیا ہے لیکن حالت یہ ہے کہ قومیں ان کثیر اخراجات کو برداشت کر کے قرضہ اور سود کی مقدار کو اپنے اپنے بجٹ میں برابر بڑھا رہی ہیں، ان مصائب کے علاوہ مذہب اشتراکیت کی دھمکیاں اور اقتصادی منازعات ہمارے جسموں کو مرگھلائے دیتے ہیں لیکن افسوس کرنا بیکار ہے اب وقت گذر گیا، اور مستقبل میں جو کچھ ہوگا اس کے لئے ہم کو تیار رہنا چاہئے۔ (مؤلف)

دوسرے جز یعنی تحدید حریت کی حالت یہ ہے کہ گو اس میں روزانہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے، لیکن مجالسِ نیابی کے نزدیک چونکہ روزانہ قوانین کے وضع کرنے کی ضرورت ہے، اس لئے کسی کے ذہن میں یہ نہیں آتا کہ ان جدید قوانین کے وضع کرنے سے جو کچھ آزادیِ عمل پہلے حاصل تھی، وہ بھی سلب ہو جائے گی۔[۱]

انگلستان کی نیابی مجلس (پارلیمنٹ) تمام ملکوں کی نیابی مجالس سے زیادہ آزاد ہے اور اس میں ہر ممبر کی آزاد و مستقل حیثیت برقرار رہتی ہے، لیکن باوجود اس کے وہ بھی ان مضرات کے دفع کرنے سے قاصر ہے،

ہربرٹ اسپنسر جو انگلستان کا ایک مشہور فلسفی ہوا ہے، اُس نے مدت ہوئی اپنی کتاب "افراد اور حکومت" میں اس مسئلہ کو نہایت وضاحت سے لکھا تھا، اس کے بعض جملوں کا اقتباس میں ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لئے پیش کرتا ہوں، وہ لکھتا ہے:۔

"تشریع اور قانون سازی کا جو طریقہ ہمارے ملک میں مدت سے رائج ہے اسکا ایک مضر پہلو یہ ہے، کہ لوائح (رزولیوشن یا قوانین) اور تعدیلات (ترمیمات) کی کثرت کی وجہ سے حریتِ شخصی کے حدود تنگ ہوتے جا رہے ہیں۔"

[۱] یہ حالت تو فرانس کی ہے لیکن غریب ہندوستان کی حالت اس بارے میں فرانس سے زیادہ قابلِ رحم ہے انگریزوں نے ہندوستانیوں کی مشق اور تمرین کے لئے مختلف صوبوں میں جو کونسلیں قائم کی ہیں، وہ صرف اس غرض سے قائم کی گئی تھیں کہ ہندوستانی خود اپنے لئے قوانین وضع کریں گے جو ان کی ضرورتوں کے مطابق ہوں گے لیکن اب ملکی نامزد شدہ قائم مقاموں کے علی الرغم روزانہ جدید قوانین وضع کئے جاتے ہیں، اور ملک استبداد کی مصیبت میں مبتلا ہے، یہ وہ اصلاحی تجویز ہے جو انگریزی نقطۂ خیال سے ہندوستان میں سلف گورنمنٹ کے لئے راستہ صاف کر رہی ہے۔ (مترجم)

۱۔ ہر سال ایک جدید قانون نافذ کیا جاتا ہے، جو جدید فرائض و واجبات (جن سے پہلے آزادی تھی) لوگوں پر عائد کر دیتا ہے۔

۲۔ ہر روز نئے نئے ٹیکس وضع کئے جاتے ہیں، اور اس طرح لوگوں کو روزانہ اپنے مالِ مکسوبہ کی کثیر مقدار سے محروم کر دیا جاتا ہے، اور یہ سارا روپیہ عہدہ داران حکومت پر صرف ہوتا ہے۔"

نظامِ نیابی کی ان دو مضرتوں کے علاوہ جو ہربرٹ اسپنسر نے بتائی ہیں، ایک بڑی مضرت اور ہے جو تمام ممالک میں مصیبتِ عظمیٰ کا پیش خیمہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ ان نئے نئے قوانین کی وجہ سے روزانہ ان عہدہ داروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے جو ان قوانین کی تنفیذ کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں، اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ اس قسم کے عہدہ داروں کو ملک کی حقیقی حکومت سپرد کر دی جاتی ہے، اس گروہ کی حکومت نہایت ظالمانہ ہوتی ہے اور اس کے اعمال و افعال کی کوئی باز پرس نہیں کرتا، دیکھو یہ کتنا شدید استبداد ہے کیا اس سے بڑھ کر کوئی استبداد ہو سکتا ہے؟

غرض جدید قوانین کا اضافہ اور کثیر اخراجات جن کا بار ٹیکس کی صورت میں رعایا اور قوم پر ڈالا جاتا ہے، یہ مضرتیں ہیں جن کے باعث افراد کا دائرۂ عمل محدود ہو گیا ہے، اور افسوس کہ قومیں اب تک یہ سمجھی بیٹھی ہیں کہ نظامِ نیابی حریت و مساوات کا کفیل ہے افسوس ان کو یہ نہیں سوجھتا کہ نظامِ نیابی ایک بڑی مصیبت ہے جو استبداد میں قوموں کو مبتلا کر رہی ہے، اور یہ استبداد شخصی استبداد سے بڑھ کر ہے۔

لیکن جو کچھ ہو، اب تو بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ ہم نظامِ نیابی اور موجودہ طرزِ حکومت کی اتباع کریں، کیونکہ اب اس نظام کے استبداد کو برداشت کرتے کرتے

کچھ ہم اس طرح کے عادی ہو گئے ہیں کہ ملکۂ انتقاد اور ملکۂ اقدام ہم سے مفقود ہو چکا ہے،
اور یہ قاعدہ ہے کہ جب انسان اپنے ذاتی اخلاقِ فاضلہ کو کھو بیٹھتا ہے تو وہ دوسروں
میں ان کے دیکھنے کی تمنا کرتا ہے، اس بنا پر جب افراد کا ارادہ سلب ہو چکا اور انکی
قوتِ عزمیت فنا ہو گئی تو بداہۃً جماعت کی قوت و سطوت میں اضافہ ہو گیا، اور افراد کا
ارادہ جماعت کے ارادہ میں ضم ہو کر بالکل فنا ہو گیا، اب وہ اعمال جو پہلے افراد کی قوت
سے انجام پاتے تھے بجائے افراد کے جماعت کی قوت سے انجام پانے لگے، اور بجائے
افراد کے جماعت، تمام اعمال کی نگراں اور محافظ بن گئی، اب جماعت گویا قادر مطلق معبود
ہے جو انسان پر حکومت کر رہی ہے، لیکن تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ اس قسم کے معبودوں
کی حکومت چند روزہ ہوتی ہے،

جن قوموں میں افراد کی حریتِ ارادی سلب ہو گئی ہو اُن کے متعلق یقین رکھو کہ اب
ان کا دورِ انحطاط شروع ہو گیا ہے، اور بہت جلد یہ قومیں فنا ہو جانے والی ہیں، اس
بنا پر جب ہم اقوام کے دورِ ماضی اور حال کا مقابلہ کرتے ہیں تو ہم کو نظر آتا ہے کہ علامات
انحطاط نے ہمارے تمدن کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے، فنا کی علامتیں نظر آرہی ہیں
اور یورپ کی تباہی کا زمانہ قریب آگیا ہے، اور ہم ایک ایسے دور میں سے ہو کر گذر
رہے ہیں جو ہم کو فنا اور موت کی جانب لئے جا رہا ہے،

اوراقِ بالا میں نفسِ اجتماعی کے مظاہر کی تشریح ختم ہو گئی، اب ہم چاہتے ہیں کہ
گذشتہ بیانات کا خلاصہ درج کر کے کتاب کو ختم کر دیں؛

یہ معلوم ہے کہ ہر قوم کو دو دوروں میں سے ہو کر گذرنا لازمی ہے۔ دَورِ ترقی اور
دورِ انحطاط، لیکن سوال یہ ہے کہ قوموں کی ترقی اور تنزل کے اسباب کیا ہوتے ہیں، ذیل

میں ہم مجملاً اس سوال کا جواب دیں گے،

سب سے پہلے ہم کو چند ایسے لوگوں کا مجمع نظر آتا ہے جو ہجرت یا فتوحات کی بنا پر کسی ملک میں مجتمع ہو جاتے ہیں، ان کی زبانیں مختلف ہوتی ہیں، اُن کے رسوم و رواجات جدا جدا ہوتے ہیں، اور ان میں کوئی رابطۂ اتحاد نہیں نظر آتا، بجز اس ایک رابطہ کے کہ اس گروہ کا ایک رئیس ہوتا ہے جو سارے گروہ کو بایں ہمہ اختلاف و تشعب مجتمع کئے رہتا ہے شجاعت و اقدام اس گروہ کی سرشت میں داخل ہوتے ہیں، اور قوت و توحش سے اس گروہ کا خمیر ہوتا ہے،

فرض کرو کہ ایک مدت گذر گئی، اور وہ گروہ اپنے اسی حال پر تھا کہ دفعتاً احوال کے تغیرات اور اجتماعی ضروریات کے تقاضے سے اس گروہ کے جو اجزاء و عناصر باہم منفصل تھے، وہ پیوستہ ہو گئے، اور اس گروہ کے تمام افراد میں یک گونہ ارتباط و اختلاط پیدا ہو گیا، اور اس اختلاط و ارتباط کے پیدا ہوتے ہی اس گروہ میں اُن اوصاف کا بھی وجود ہو گیا جو علم النفس کے نقطۂ نظر سے جماعت کے خصائص ہیں، یہ دوسرا دور ہے جہاں آکر ایک منتشر گروہ منتظم جماعت کی صورت اختیار کر کے دورِ تمدن میں قدم رکھتا ہے،

لیکن ابھی اس جماعت کی حالت اتنی درست نہیں ہوئی ہے، کہ وہ وحشی سے متمدن ہو جائے، ابھی اس کو ایک نقص کی تکمیل کرنا ہے، اور وہ نقص یہ ہے کہ ابھی اس کا کوئی خاص مقصد متعین نہیں ہوا، جس کے حاصل کرنے کی اس کو کوشش کرنا چاہئے، اس لئے ابھی اس پر حالتِ جمود طاری ہے، اور مقصد کے متعین ہونے کے لئے ایک مدت درکار ہے اب فرض کرو کہ رفتہ رفتہ اس کا مقصد بھی متعین ہو گیا، اور اب وہ جوش و قوت سے بھر پور ہے اب دورِ تمدن کا آغاز ہوتا ہے، قوم اپنے مقصد کی تکمیل و تحصیل کے درپے ہوتی

ہے اور قومی ضروریات کے مطابق اس قوم کے عقائد اور اس کے علوم وفنون وغیرہ کی تدوین کی جاتی ہے، اور دنیا کی قوموں کی صف میں یہ قوم صدر نشینی کا اعزاز حاصل کر لیتی ہے، اس اثنا میں گو بعض جدید مصائب بھی اسکو پیش آتے ہیں جو اس کی حالت میں تغیر پیدا کر دیتے ہیں، لیکن یہ تغیر صرف وقتی ہوتا ہے، اور اس کی قومی روح کو ان حوادث ومصائب سے کوئی صدمہ نہیں پہنچتا،

لیکن اب یہاں آکر زمانہ کی قوتِ ایجادی ختم ہو جاتی ہے، اور اس کی قوتِ اعدامی کا ظہور ہونے لگتا ہے، اور تمدن قوت وشوکت کی ایک حد معین پر پہنچ کر رُک جاتا ہے، یہ قوم کا دور وقوف ہے، اس دور کے ختم ہونے کے بعد قوم کا دور شیخوخیت شروع ہوتا ہے جس کے بعد فنا وموت لازمی ہے،

فنا وموت سے گو کسی قوم کو مفر نہیں لیکن ساعتِ موت اکثر اُس وقت آتی ہے جب قوم کے مقصد معین میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے، جب تک قوم کا یہ تخیل قوی تھا، اس وقت تک قوم کے قوا، واعضا، قوت سے بھرپور تھے لیکن جہاں اس میں ضعف پیدا ہوا اسی قوم کے قوائے عمل شل ہو گئے، سیاست ومذہب کے قصور عالیہ ایک دم زمین پر آرہے اور قومی موت کی ساعت موعود آن پہنچی،

جب کسی قوم کے تخیل اور مقصد معین میں ضعف آجاتا ہے تو اس کی قوتِ امتزاجی فنا ہو جاتی ہے، افراد کی شخصیت مضمحل اور قوم کے قوائے عمل شل ہو جاتے ہیں، اور گو اس وقت دماغی قوتوں میں حیرت انگیز طاقت آجاتی ہے لیکن اسی وقت سے نظام اخلاق کا زوال اور عملی طاقت کا فقدان بھی شروع ہو جاتا ہے، جو دور انحطاط وتنزل کی نشانیاں ہیں، اس وقت قومی کالبد قالب بے جان ہو کر رہ جاتا ہے، اندر دیکھو تو کچھ نہیں، لیکن ظاہری

حالت زندگی کا ثبوت دے رہی ہے یہی وقت ہوتا ہے جب قومی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے، افراد اپنا ذاتی استقلال کھو بیٹھتے ہیں، امیدیں اور تمنائیں دل ہی دل میں پیدا ہوتی اور مٹ جاتی ہیں، تمدن کے ستون منہدم ہو جاتے ہیں، اور دورِ وحشت لوٹ آتا ہے اور گو اس وقت قوم کی ظاہری شان سے یہ گمان ہوتا ہے کہ قوم اپنے شباب پر ہے، لیکن حقیقت میں اس وقت قوم کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اس کے اعضا و جوارح میں ضعف پیدا ہو چکا ہے، اُس کی روح کو دیمک چاٹ گئی ہے اور قوم ایک خشک درخت کے مانند ہو گئی ہے جو ہوا کے ایک جھونکے سے زمین پر آ رہتا ہے،

غرض قومیں ایک خیال اور ایک مقصد کے درپے ہو کر دورِ وحشت سے دورِ تمدن تک ترقی کرتی ہیں، اور دورِ تمدن کے بعد ان پر انحطاط طاری ہوتا ہے، پھر جب ان کا مقصد معین کمزور ہو کر فنا ہو جاتا ہے، اس وقت وہ خود بھی نذرِ اجل ہو جاتی ہیں، یہ ہے ناموسِ الٰہی جو تمام اقوامِ عالم پر مسلط ہے،

R